جواہر الفتاویٰ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

سابق رئیس دار الافتاء
جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

استاد حدیث وفقہ
جامعہ اہلیہ دار العلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام بنگلہ دیش

کے علمی وتحقیقی فتاویٰ ومقالات کا منتخب مجموعہ

۴

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

جواہر الفتاویٰ

جواہر الفتاویٰ

جلد ۴

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

سابق رئیس دار الافتاء
جامعۃ العلوم الاسلامیہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

استاد حدیث وفقہ
جامعہ اہلیہ دار العلوم معین الاسلام
ہاٹہزاری چاٹگام بنگلہ دیش

کے علمی وتحقیقی فتاویٰ ومقالات کا منتخب مجموعہ

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب : جواہر الفتاویٰ

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

اشاعتِ اول : اگست ۲۰۱۰

ناشر

اسلامی کتب خانہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
فون: 021-34927159

جواہر الفتاوی

علمی و تحقیقی فتاوی و مقالات کا منتخب مجموعہ

اجمالی فہرست مضامین

کتاب الایمان و العقائد ۲۵

کتاب السنّة و البدعة ۱۴۳

کتاب الطهارت ۲۴۱

کتاب الصلوٰة ۲۵۰

کتاب الجمعة ۳۱۰

کتاب العیدین ۳۱۵

کتاب الجنائز ۳۲۳

کتاب الزكوة ۳۳۶

کتاب الحج ۳۴۷

کتاب النكاح ۳۵۰

کتاب الرضاع ۳۶۵

کتاب الطلاق ۳۶۹

کتاب الایمان و النذور ۳۸۱

کتاب الوقف ۳۸۹

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

کتاب الایمان و العقائد

ایمان اور اسلام کی تعریف ۲۵
ایمان اور اسلام کے درمیان فرق ۲۶
اہل سنت والجماعت کی تعریف ۲۷
اہل سنت والجماعت پر اٹل رہنے کی فضیلت ۲۸
حدیث کی روشنی میں اہل سنت والجماعت کی علامتیں ۲۹

باب الایمان بالقدر

تقدیر کے معنی کیا ہے؟ ۳۱
قضاء اور قدر کے درمیان کیا فرق ہے؟ ۳۲
تقدیر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ ۳۲
تقدیر کے مسئلہ میں غور و فکر کرنا کیسا ہے؟ ۳۲
دوا منتر اور تعویذ تقدیری فیصلہ کو ہٹا سکتا ہے یا نہیں؟ ۳۳
تقدیر کی اقسام ۳۴

باب الانبیاء و الرسل

نبی اور رسول کی تعریف اور ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ ۳۶
انبیاء کی تعداد کا مسئلہ امر توقیفی ہے۔ ۳۶
تمام انبیاء ورسلؑ اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں ۳۸

حضرت عیسیٰ علیہ السلام دین اسلام کا اتباع کریں گے یا نہیں؟ ۴۴

حضرت عیسیٰ کے حضوری میں امام مہدیؒ کیسی امامت کریں گے۔ ۴۵

باب فی المعجزات ....

معجزات اور کرامات کی تعریف اور انکے اقسام ۴۶

خارق عادات کی اقسام ۴۷

باب کلمات الکفر والشرک

کفر اور شرک کی تعریف ۴۸

شرک فی الصفات کی اقسام ۴۸

”قرآن وحدیث کو گولی مارتا ہوں“ کلمات کفر میں سے ہیں ۵۰

تجدید ایمان کی صورت ۵۱

مرتد کی فوت شدہ نمازوں کی قضاء ضروری نہیں۔ ۵۱

مرتدین کے لیے حج کے اعادہ کرنے کا حکم۔ ۵۱

”عزرائیل میرے بیٹے کا دشمن ہے“ کہنا موجب کفر ہے۔ ۵۲

مرتدہ عورت کی تجدید نکاح مہر میسر کے ساتھ بھی درست ہے۔ ۵۲

”آدم علیہ السلام اگر گندم نہ کھاتے تو ہم اشقیاء نہ ہوتے“ کہنا موجب کفر ہے۔ ۵۳

حضرات شیخین کو سبّ وشتم کرنے والا کافر ہے۔ ۵۴

یارسول اللہ یاغوث الاعظم دست گیر کا نعرہ لگانا ۵۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نور و بشر ہونے کی شرعی تحقیق ۵۷

قرآن کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ ۶۰

قرآن میں صیغۂ امر کے ساتھ آپ کو بشریت کے اعلان واشارات ۶۱

کفار جانتے تھے کہ آپ ﷺ بشر ہیں مگر وہ تعجب کرتے تھے کہ بشر نبی ورسول کیسے ہوسکتے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا۔ ۶۲

کفارِ مکہ کو یہ بھی اعتراض تھا کہ بشر نبی ہو تو اُسے نہیں مرنا چاہیئے بلکہ زندہ رہنا چاہیئے؟ ۶۳

رسولوں کا انسانوں میں سے بھیجنا اللہ کی رحمت ہے۔ ۶۴

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ ۶۶
حدیث کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ ۶۷
آپؐ اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے جسم مبارک کو ایک ہی جگہ کی مٹی سے بنایا گیا ہے۔ ۶۸
آپ کی بشریت پر تمام صحابۂ کرام کا اجماع ہے۔ ۶۸
تفسیر کی روشنی میں آپکی بشریت۔ ۶۹
آپ کی بشریت پر محدثین کی رائے۔ ۷۰
آپ کی بشریت پر حنفی مشائخ کے اقوال۔ ۷۲
آپ کی بشریت پر مالکی مشائخ کے اقوال۔ ۷۳
آپ کی بشریت پر شافعی مشائخ کے اقوال۔ ۷۴
آپ کی بشریت پر حنبلی مشائخ کے اقوال۔ ۷۵
اجماع امت کی روشنی میں آپ ﷺ بشر ہیں۔ ۷۵
قیاس شرعی کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔ ۷۶
آپ کی بشریت کی منکرین کافر ہیں۔ ۷۷
آپ کی عدم بشریت پر بریلوی حضرات کے دلائل اوران کے جوابات ۸۰
پہلی دلیل کہ "قد جاء کم من اللہ نور و کتاب المبین "والی آیت ہے۔ ۸۲
دوسری دلیل حدیث جابر کہ "یاجابر إن اللہ قد خلق نور نبیك من نوره" ۸۶
تیسری دلیل حدیث موضوع کہ "ان اللہ قبض من نور وجهه قبضة الخ ۸۹
چوتھی دلیل آپ کے چہرہ انور کی روشنی سے حضرت عائشہ کا گری ہوئی سوئی کو زمین سے چن لینا یہ روایت بھی موضوع ہے۔ ۹۰
پانچویں دلیل ملا علی قاریؒ کی ایک نقل ۹۲
چھٹی دلیل آپ کے سایہ نہ ہونے والی روایتیں ۹۳
ان روایتوں کی حقیقت ۹۴
آپ ﷺ کا سایہ تھا۔ ۹۴
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیب داں ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ ۱۰۱
قرآن کی روشنی میں آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے۔ ۱۰۲

حدیث کی روشنی میں آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے۔ ۱۰۳
فقہ اور فتاوی کی روشنی میں آپ ﷺ عالم الغیب نہیں تھے۔ ۱۰۶
حنفیہ کا متفقہ مسئلہ ہے کہ آپ کے غیب داں ہونے کا عقیدہ رکھنے والا کافر ہے۔ ۱۰۷
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہر جگہ حاضر وناظر ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ ۱۰۹
”آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلاۃ وسلام سننے کیلئے محفل میلاد میں حاضر ہوتے ہیں“، کا عقیدہ روایۃً ودرایۃً باطل ہے۔ ۱۰۹
روایۃ آپ ﷺ تا قیامت اپنے روضہ اقدس میں رہیں گے کہیں نہیں جائیں گے۔ ۱۱۱
معجزۃً بھی آپ کا قبر شریف سے نکلنا کسی نص سے ثابت نہیں۔ ۱۱۳

فصل فی الفرق الباطله

فرقۂ قادیانیہ ۱۱۴
فرقۂ ناجیہ اور بہتر فرقہ کی تفصیل۔ ۱۱۶

باب نفخه فی الصور

دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس وقفہ ہوگا۔ ۱۲۰
حضرت اسرافیلؑ صور پھونکنے کیلئے ہمیشہ ہمیشہ تیار ہیں۔ ۱۲۱
صور کیا ہے ۱۲۲
نفخ صور کے وقت جبرئیلؑ ومیکائیلؑ، اسرافیل کے دائیں بائیں جانب ہوں گے۔ ۱۲۳

باب الحشر

میدان حشر میں آپ ﷺ تین مقامات پر ملیں گے اس بارے میں حضرت عائشہؓ اور حضرت انسؓ کی حدیثوں کے مابین تعارض اور اس کا جواب۔ ۱۲۴
بروز قیامت موت کو ذبح کردیا جائیگا۔ ۱۲۶
میدان حشر میں سب لوگ بدون لباس جمع ہوں گے۔ ۱۲۷
میدان حشر میں آپ ﷺ عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑے ہونگے۔ ۱۲۸

میدان محشر میں امت محمدیہ ﷺ حضرت نوحؑ کی حمایت میں کفار کے خلاف گواہ بنے گی۔ ۱۲۹

میدان حشر میں ہر شخص بدون لباس اور غیر مختون آئے گا۔ ۱۳۱

فصل فی الشفاعة والحوض

گناہ کبیرہ کی شفاعت صرف اسی امت کیلئے مخصوص ہوگی۔ ۱۳۴

شفاعت کی اقسام ۱۳۴

کون کون الگ شفاعت کریں گے؟ ۱۳۴

ہر نبی کا ایک ایک حوض ہوگا۔ ۱۳۴

حوض کوثر پر سب سے پہلے آنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے۔ ۱۳۷

اہل جنت کا پہلا کھانا مچھلی کا جگر ہوگا۔ ۱۳۹

فصل فی رؤية الله تعالیٰ

رؤیت باری تعالیٰ حالت بیداری میں دنیا کے اندر کسی کیلئے ممکن ہے یا نہیں؟ ۱۴۱

کتاب السنّة والبدعة

صاحب بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوگی ۱۴۳

بدعتی کی محفل شرابی کی مجلس سے بدتر ہے ۱۴۴

بدعتی آپ ﷺ کی شفاعت سے محروم رہے گا ۱۴۶

بدعتی کی فرض، نفل کوئی عبادت دربار الٰہی میں قبول نہیں ہوگی ۱۴۷

بدعتی عالم کو سلام کرنا، تعظیم کرنا، ناجائز ہے۔ ۱۴۷

بدعتی پر تمام خلائق کی لعنت ہے ۱۴۸

عمل بدعت شیطان کے نزدیک کار گناہ سے زیادہ محبوب ہے ۱۴۹

میت کے گھر میں سوم، چہارم، دسواں چالیسواں کے دنوں میں ضیافت کا انتظام کرنا بدعت ہے۔ ۱۴۹

کسی نماز کے بعد مصافحہ کا التزام کرنا بدعت ہے ۱۵۰

جمعہ اور عیدین کے خطبۂ ثانیہ میں ہاتھ اٹھا کر امین کہنا بدعت ہے ۱۵۱

کھانے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا بدعت ہے۔ ۱۵۱

ماہ صفر کے آخری بدھ میں عمدہ کھانے کا انتظام کا رواج بے اصل ہے ۱۵۳

دفن کے وقت قبر پر اذان دینا بدعت ہے۔ ۱۵۳

فاتحہ خوانی کا مسنون طریقہ۔ ۱۵۳

ایصال ثواب کے لئے ستر ۷۰ ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھنا۔ ۱۵۴

میت کے سینہ پر کلمہ شہادت وغیرہ لکھنا ناجائز ہے۔ ۱۵۴

کھانا سامنے رکھ کر فاتحہ خوانی کرنا بدعت ہے۔ ۱۵۵

جنازہ کے ساتھ بلند آواز سے ’’الله ربنا محمد نبینا‘‘ پڑھنا بدعت ہے۔ ۱۵۶

نماز جنازہ کے بعد جنازہ روک کر سورۂ فاتحہ پڑھنا بدعت ہے۔ ۱۵۷

اجتماعی ہیئت پر درود شریف پڑھنے کا التزام بدعت ہے۔ ۱۵۸

بارھویں ربیع الاول میں باجماعت دو رکعت نفلی نماز پڑھنا بدعت ہے۔ ۱۵۹

بلاوجہ نوافل کے لئے مسجد کو افضل سمجھنا بدعت ہے۔ ۱۶۱

نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بدعت ہے۔ ۱۶۱

امام فضلی کا قول ’’ لاباس بہ‘‘ کا جواب۔ ۱۶۳

شب معراج کے روزہ اور شب برائت اور شب قدر کی مروّجہ نفلی نمازیں بے اصل ہیں۔ ۱۶۵

تعلیم وتلقین عبادات کے واسطے پیغمبر مبعوث ہوئے۔ ۱۶۶

دین میں خدائی تعلیم کی علاوہ کسی نئی بات نکالنا بدعت اور ضلالت ہے۔ ۱۶۷

بلادلیل شرعی کسی دن وتاریخ معین کو نفل عبادات کے لئے مخصوص کرنا ناجائز ہے۔ ۱۶۸

۲۷ رجب کے روزہ کا شرعی حکم۔ ۱۶۹

مذکورہ نفلی نمازیں بدعت ہیں۔ ۱۷۰

ان نمازوں کی ابتدائی واختراعی تاریخ۔ ۱۷۱

ان نمازوں کے اختراع کا اصل مقصد ومطلب۔ ۱۷۲

غنیۃ الطالبین اور احیاء العلوم کی حدیثوں کا جواب۔ ۱۷۳

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات کے بارے میں دیوان باغی کے باطل استدلالات اوران کے جوابات۔ ۱۷۷

قرآن کی روشنی میں آپ کے سفر آخرت کی تیاری اور وفات کی طرف اشارات۔........ ۱۷۹
حدیث شریف کی روشنی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاوّل ہے۔........ ۱۸۱
تاریخ اسلامی کی روشنی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاوّل ہے۔........ ۱۸۲
جمہور مشائخ اور مشہور قول کے مطابق آپ کی تاریخ وفات۔........ ۱۸۴
آپ کی ہجرت اور اقامت مدینہ منورہ کے اعتبار سے آپ کی تاریخ وفات۔........ ۱۸۵
دیوان باغی صاحب کے نقلی استدلال کے جوابات۔........ ۱۸۶
دیوان باغی صاحب کی عقلی دلیل کا جواب۔........ ۱۹۰
ائمہ دین پر دیوان باغی صاحب کا ناجائز اور ثابت شدہ امر کا انکار ۱۹۱
دیوان باغی کے کچھ عقائد فاسدہ ملاحظہ فرمائیں۔........ ۱۹۲
اجتماعاً سورہ حشر کی آخری آیتیں پڑھنے کا التزام بدعت ہے۔........ ۱۹۳
سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں پڑھنے سے قبل تسمیہ کا پڑھنا۔........ ۱۹۳
قراءت کے محفل میں تلاوت کے وقت تکبیر کہنا بدعت ہے۔........ ۱۹۳
آپ ﷺ کے اسم گرامی سنتے وقت بلند آواز سے انگوٹھی چومنا بدعت ہے۔........ ۱۹۴
قبروں پر چادریں ڈالنا اور پھول وغیرہ چڑھانا بدعت ہے۔........ ۱۹۶
اس کے جواز پر ایک بدعتی عالم کا ابن عباس کی حدیث (کھجور کی ٹہنیوں) سے استدلال اور اس کا جواب........ ۱۹۹
بدعت کی تعریف۔........ ۱۹۹
منطق، فلسفہ کے تعلیم وتعلم بدعت کے تحت داخل نہیں۔........ ۱۹۹
بدعت کی اقسام پر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تنقید۔ ۲۰۲

باب مناقب الصحابة

صحابہ، تابعی اور تبع تابعی کی تعریف اور ان کے ہر ایک کا زمانہ۔........ ۲۰۵
اہل بیت سے مراد کون ہیں؟........ ۲۰۶
ازواج مطہرات کی تعداد اور ترتیب نکاح۔........ ۲۰۷
عشرہ مبشرہ کون کون ہیں اور ان کے اسماء گرامی کیا ہیں؟........ ۲۰۸

حضرت سعد بن معاذ کی موت سے عرش الٰہی ہل جانا۔ ۲۰۹
تمام صحابۂ کرامؓ عدول ہیں، جنتی ہیں۔ ۲۱۰
تمام صحابہ کرامؓ پر جہنم کی آگ حرام ہے۔ ۲۱۱
صحابہ کرام کو برا کہنے والے کا شرعی حکم۔ ۲۱۲
جنگ جمل اور جنگ صفین کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا عقیدہ کیا ہے؟ اور ان واقعات کے بارے میں کیسا عقیدہ رکھنا چاہئے؟ ۲۱۵
ان جنگوں میں قاتلین اور مقتولین کا شرعی حکم کیا ہے؟ ۲۱۹
ان جنگوں کے واقعات کو تنقیداً بیان کرنا حرام ہے۔ ۲۲۱
صحابہ کرام کے بارے میں غلط خیالات رکھنے والے علماء کو امام مؤذن خطیب بنانا ناجائز ہے۔ .. ۲۲۲
شیخین کی خلافت کا منکر کافر ہے۔ ۲۲۳
شیخین کے برابر حضرت علیؓ سے محبت کرنا گناہ نہیں۔ ۲۲۵
صحابۂ کرام کو سب وشتم کرنے والے آدمی کی گواہی شرعاً مقبول نہیں ہوگی۔ ۲۲۵
صحابۂ کرامؓ کو گالی دینے والے کی عبادت دربار الٰہی میں قابل قبول نہیں ہوگی۔ ۲۲۶
جماعت اسلامی کے ایک عالم صاحب کے ''لاتسبوا اصحابی'' کی من مانی توجیہ اور ملا علی قاریؒ پر الزام۔ ۲۲۸
تمام شہداء اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ ۲۳۶
شہداء کی بیویوں سے شادی کرنا درست ہے۔ ۲۳۸
بعض اولیاء کرام کے جسموں کو بھی زمین پر حرام کر دیا گیا ہے۔ ۲۳۹

کتاب الطہارت

فصل فی الغسل و فرائضہ

غسل جنابت میں دانتوں کا خلال کرنا ضروری ہے یا نہیں؟ ۲۴۱
غسل جنابت میں سوراخ والے دانتوں کے سوارخ میں پانی پہونچانا ضروری ہے یا نہیں؟ ۲۴۱

وضو وغسل میں عورتوں کے ناک اور کان کی بالی کے سوراخوں میں پانی پہونچانا ضروری ہے یانہیں؟ ۲۴۱
وضو وغسل میں ناخن کے نیچے پانی پہونچانا ضروری ہے یانہیں؟ ۲۴۲
وضو میں اطمینان قلب کی غرض سے ہر عضو کو چار چار مرتبہ دھونا کیسا ہے؟ ۲۴۲
غسل جنابت میں عورتوں کو داخل فرج میں پانی پہونچانا ضروری ہے یانہیں؟ ۲۴۲
غسل جنابت میں ناف میں پانی پہونچانا ضروری ہے یانہیں؟ ۲۴۲
غسل جنابت میں غرغرہ کے ساتھ کلی کرنا فرض ہے یانہیں؟ ۲۴۳

باب الحيض والنفاس والاستحاضه

عورت کو نماز کے آخری وقت میں حیض شروع ہوا اور وہ اب تک نماز نہیں پڑھی ہو تو اس پر اس نماز کی قضا ضروری ہے یانہیں؟ ۲۴۳
جنبی اور حیض ونفاس والی عورتیں ذکر اوراذکار کر سکتے ہیں یانہیں؟ ۲۴۴
مستحاضہ عورت کا حکم ۲۴۴

فصل فى الاستنجاء وآدابه

پیشاب کے بعد ڈھیلے کا استعمال کرنا سنت ہے؟ ۲۴۵

باب المسح على الجبائر

پٹی پر مسح کرنے کا حکم۔ ۲۴۶

باب فى النجاسة واحكام التطهير

مچھلی کا خون پاک ہے۔ ۲۴۷

تھوڑی قئے ناقض وضو اور ناپاک نہیں۔........ ۲۴۷
کتے کا لعاب پاک ہے یا ناپاک؟........ ۲۴۷
بھیگا کتا پاک ہے یا ناپاک؟........ ۲۴۸

کتاب الصلوٰۃ

عورت کے بچہ نکلتے وقت نماز پڑھنے کا حکم اور بچہ کے کتنے حصہ نکلنے سے عورت نفاس والی ہوتی ہے۔ ۲۵۰
بچہ آپریشن سے ہونے کے بعد اگر عورت کے رحم سے خون جاری ہو تو وہ نفاس والی ہوگی ورنہ نہیں۔ ۲۵۱
حائضہ اور نفاس والی عورتوں کو نماز کے وقت کیا کرنا چاہئیے؟........ ۲۵۱

فصل فی الاذان والاقامۃ

جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا ہی سنت ہے........ ۲۵۲
حدیث کی روشنی میں جمعہ کی اذان ثانی کا مقام........ ۲۵۲
کتب فقہ اور فتاوی کی روشنی میں جمعہ کی اذان ثانی کا مقام........ ۲۵۶
اقامت کے حیعلتین میں تحویل وجہ سنت ہے۔........ ۲۵۷
اذان کی دعا میں ''والدرجة الرفيعة'' جملہ کا اضافہ بے اصل اور خلاف سنت ہے ۲۶۰
لحن فی الاذان کے متعلق ایک سوال اور اس کا جواب۔........ ۲۶۱
اذان کے کلمات کے اندر مد کرنے کے جواز وعدم جواز کے بارے میں ایک اہم استفتاء اور اس کا جواب ۲۶۲
''خير التقرير فی اثبات حذف التكبير'' کے متعلق ایک سوال اور اس کا جواب ۲۶۷
مائک پر اذان کے جواز وعدم جواز کے بارے میں ایک اہم استفتاء اور اس کا جواب ۲۶۸

فصل فی القرأۃ

فرض نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت مسنون کیا ہے؟........ ۲۶۹
فجر اور مغرب کی قرأت مسنون کیا ہے؟........ ۲۶۹
طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل کی تفصیل........ ۲۷۰

فصل فی المسبوق واللاحق

مسبوق کا قعدۂ اخیرہ میں امام کے سلام پھیرنے سے قبل ماسبق نماز ادا کرنا کیسا ہے۔.......... ۲۷۲
سلام پھیرنے میں امام کی متابعت کرنا واجب ہے ۲۷۲
مسبوق پر قعدہ اخیرہ میں تشہد دعا اور درود پڑھنے کا حکم ۲۷۲
تشہد کے بعد امام سے قبل مقتدی کا سلام پھیر لینا ۲۷۲
بعض صورتوں میں امام نمام کی فاسد ہوجاتی ہے مگر مقتدی کی نماز صحیح ہوجاتی ہے۔.......... ۲۷۴
پتلے کپڑے سے ستر عورت کی فرضیت ادا نہیں ہوگی ۲۷۵
ٹائٹ پاجامہ میں نماز پڑھنا ۲۷۶
نماز میں پگڑی باندھنا سنت مؤکدہ ہے یا زائدہ ۲۷۶
رکوع وسجدہ میں مقتدیوں کا امام سے قبل سبقت کرنا ۲۷۷

فصل فی السنن والنوافل

حالت سفر میں سنن مؤکدہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کے بارے میں متعارض حدیثوں کا جواب ۲۷۷
بلاعذر سنت مؤکدہ بیٹھ کر پڑھنا ۲۸۰
سنت فجر میں تین چیزوں کا لحاظ کرنا مسنون ہے ۲۸۰
قبل الجمعہ کی چار رکعت سنتیں گھر میں پڑھنا افضل ہے ۲۸۰
بلاعذر تراویح کی نماز بیٹھ کر پڑھنا ۲۸۰

فصل فی سجود السھو

نماز فرض کے پہلی رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کا تکرار کرنا ۲۸۱
نماز سری میں ثناء یا تشہد کا جہراً پڑھنا ۲۸۲
درمیانی قعدہ میں تشہد کے بعد امام صاحب کا ”ربنالك الحمد“ پڑھنا ۲۸۲
امام سجدہ آیت بھول گیا قعدہ اخیرہ میں یاد آگیا تو کیا کرے ۲۸۲
نماز عصر میں قعدہ اخیرہ کے بعد پانچویں رکعت ملانے کا حکم ۲۸۲

ثناء کی جگہ تشہد پڑھنے سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا ۲۸۳
لاحق اور مسبوق پر مسجدہ سہو واجب ہونے کا حکم ۲۸۳
بدون سلام سجدہ سہو کرنا ۲۸۴
کئی ترک واجبات پر ایک دفعہ سجدۂ سہو کافی ہے۔ ۲۸۴
سجدۂ سہو کے بعد سہو ہو تو دوبارہ سجدۂ سہو کرنا واجب نہیں۔ ۲۸۴
امام اگر قعدہ اخیرہ کے بعد کھڑا ہو جائے تو مقتدی لوگ کیا کریں گے؟ ۲۸۵
سجدہ سہو کی صورت میں قعدہ اخیرہ کے دونوں جلسہ میں درود شریف پڑھنے کا حکم ۲۸۵
کس حالت میں سجدۂ سہو ساقط ہو جاتا ہے۔ ۲۸۵
ظہر کی چار رکعت سنت کے درمیان قعدہ میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھنے کا حکم ۲۸۷
تسبیح سے کونسی تسبیح مراد ہے؟ ۲۸۷

فصل فی سجود التلاوۃ

ریڈیو، ٹی وی، ٹیپ رکارڈ پر تلاوت سجدہ سننے کا حکم ۲۸۹
نابالغ سے تلاوت سجدہ سننے کا حکم ۲۸۹
پاگل آدمی سے تلاوت سجدہ سننے کا حکم ۲۸۹
نماز کا تلاوت سجدہ خارج صلاۃ ادا نہیں ہوگا ۲۹۰
رکوع وسجدہ میں تلاوت سجدہ کی نیت کرنا ۲۹۰

باب مایفسد الصلوٰۃ ویکرہ فیہا

فجر اور عصر کے علاوہ دیگر فرائض کے بعد امام صاحب کا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھنے کا التزام مکروہ ہے مذہب حنفیہ کے خلاف عمل ہے ۲۹۲
حدیث کی روشنی میں انصراف کا ثبوت اور اس کا معنی ۲۹۳
جن فرائض کے بعد سنن راتبہ ہیں ان کے بعد انصراف کی شکل الگ ہے ۲۹۵
جن فرائض کے سنن راتبہ نہیں ان کے بعد انصراف کی چار صورتیں ہیں ۲۹۷
خلاصہ بحث اور جواب استفتاء ۲۹۷

ایک شبہ اور اس کا ازالہ ۲۹۷

فصل فی صلاۃ المسافر

حالت سفر میں تابع کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے متبوع کی نہیں، ۳۰۰
وطن اصلی مین آدمی ہمیشہ مقیم رہتا ہے۔ ۳۰۱
بڑے شہر اور قریہ متصلہ سے سفر کر کے احکام کب جاری ہوں گے (تجاوز عمران مصر کی شرعی حیثیت) ۳۰۲
بعض احکام شرعیہ کا تعلق عرف کے ساتھ خاص ہوتا ہے یعنی عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔ ۳۰۲
سفر کے احکام جاری ہونے کا دار مدار خروج از علاقہ خود اور دخول در علاقہ خود ہے ۳۰۴
اس بارے میں صحابۂ کرام اور تابعین کے چار مذاہب ہو گئے ۳۰۴
تجاوز عمران مصر کی حقیقت و اسرار ۳۰۶
انفصال و اتصال کا معیار ۳۰۸
خلاصۂ بحث اور جواب استفتاء ۳۰۹

باب فی الجمعة

جمعہ کے روز ظہر کی جماعت مکروہ ہے۔ ۳۱۰
جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں ۳۱۱
حالت خطبہ میں سلام و عاطس کا جواب واجب نہیں۔ ۳۱۲
حالت خطبہ میں کتب بینی، ذکر و اذکار وغیرہ سب کچھ ناجائز ہے۔ ۳۱۲
حالت خطبہ میں آپ ﷺ کے اسم گرامی سنتے وقت درود شریف پڑھنا ۳۱۲
حالت خطبہ میں صحابۂ کرامؓ کے اسماء گرامی سنتے وقت ترضی پڑھنا ۳۱۲
جمعہ، عیدین نکاح وعظ کے خطبہ کا سماع واجب ہے ۳۱۲
خطبہ ثانیہ کے وقت پیسے کا بکس چلانا حرام ہے ۳۱۲
ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کا امامت کرنے کا حکم ۳۱۲
بعد الجمعۃ چھ رکعت سنتیں ہیں ۳۱۵

کتاب العیدین

عیدگاہ خارج شہر ہونے پر بعض حضرات مفتین کرام (حضرت مفتی رشید احمد لدھیانویؒ) مفتی عبدالرحیم لاجپوریؒ اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند) کے فتاویٰ اور اس کا جواب ۳۱۵
حدیث کی روشنی میں آپ کی عیدگاہ داخل مدینہ منورہ تھا۔ ۳۲۰
دلائل کے جوابات ۳۲۰
تصدیقات ۳۲۲

کتاب الجنائز

نماز جنازہ میں کتنی چیزیں فرض ہیں؟ ۳۲۳
میت کی قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم ۳۲۴
قبرستان پر صف بندی کرنے کا حکم ۳۲۴
قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنا مستحب ہے۔ ۳۲۵

فصل فی ایصال الثواب

تعزیت کسے کہتے ہیں اور وہ کب تک مشروع ہے؟ ۳۲۷
الفاظ تعزیت اور مضمون حدیثوں سے منقول ہے یا نہیں؟ ۳۲۷
تعزیت کے لئے جمع ہوکر قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟ ۳۲۷
ایصال ثواب کے واسطے صلحاء کو جمع کر کے دعاء یونس سورۂ انعام سورۂ اخلاص وغیرہ کا ختم پڑھانا کیسا ہے؟ ۳۲۷
ایصال ثواب کا کھانے کے بارے میں فتاویٰ رشیدیہ اور کفایت المفتی کا تعارض اور اس کا تطبیق۔ ۳۳۰
ایصال ثواب کے واسطے دن تاریخ کی تعیین کرنا بدعت ہے۔ ۳۳۲
"طعام المیت یمیت القلب" حدیث نہیں۔ ۳۳۲
قبل الدفن میت کا منہ دکھانے کے متعلق فتاویٰ رشیدیہ اور احسن الفتاویٰ کا تعارض اور دفعہ تعارض ۳۳۲

جوتا پہن کر نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے ۳۳۴

کتاب الزکوۃ

ضرورت کے تحت فقیر (مستحق زکوٰۃ) کو مقدار نصاب سے زائد دینا بھی جائز ہے۔ ۳۳۶
غیر مسلم کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔ ۳۳۶
مال حرام میں زکوٰۃ نہیں۔ ۳۳۷
مال حرام کی تصدق میں ثواب کی نیت کرنا کفر ہے۔ ۳۳۷
زکوٰۃ سے غریب قرضخواہ سے اپنے قرض اصول کرنے کا ایک حیلہ ۳۳۹
جہیز کے مال میں زکوٰۃ نہیں ۳۳۹
پراویڈنٹ فنڈ اور جی پی فنڈ کی رقم میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ ۳۴۰
عشر اور نصف عشر کا مسئلہ ۳۴۱
مال مستفاد میں حولان شرط نہیں۔ ۳۴۳
کمپیوٹر میں زکوٰۃ نہیں۔ ۳۴۳
مال تجارت میں زکوٰۃ ادائیگی کے وقت بازار میں جو قیمت ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔ ۳۴۳
تعلیم کمپیوٹر میں زکوٰۃ نہیں۔ ۳۴۳
ضمانت کی رقم میں زکوۃ مالک مکان پر ہوگی یا کرایہ دار پر۔ ۳۴۵

کتاب الحج

حج کی مقدار میں مال موجود ہے مگر مکان کی ضرورت ہے تو کیا کرے؟ ۳۴۷
مالدار اندھے پر حج واجب ہے یا نہیں ۳۴۸
حج بدل میں آمر کے ذمے مامور کے بال بچوں کا خرچہ دینا ۳۴۸

کتاب النکاح

(فصل فی الجهاز والمهر)

مہر اور مہر مثل کی تعریف کیا ہے اور مہر مثل کب واجب ہوتا ہے۔ ۳۵۰

مہر فاطمی کسے کہتے ہیں اور اس کی مقدار کیا ہے؟ ۳۵۲
مہر کی اکثر اور اقل اور معتدل مقدار کیا ہے؟ ۳۵۵
مہر کس کا حق ہے؟ اور کن صورتوں میں مہر ساقط ہو جاتا ہے؟ ۳۵۵
مہر مؤجل کی صورت میں عورتوں کو کیا کیا اختیارات حاصل رہیں گی؟ ۳۵۶
مہر معجل کتنا ضروری ہے ۳۵۷
جہیز کے مال پر واجب الرد رہنے کا حکم ۳۵۸

باب المحرمات

بیوی اپنے مردہ شوہر کو اور شوہر اپنی مردہ بیوی کو دیکھ سکتے ہیں۔ ۳۶۰
سالی کے ساتھ زنا سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوتی ہے۔ ۳۶۱
وطی فی الدبر سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی۔ ۳۶۲
حرمت مصاہرت ثابت ہونے کیلئے عورت کا مشتہات ہونا شرط ہے۔ ۳۶۳
زنا سے نکاح ٹوٹتا نہیں اور اس کی عدت بھی نہیں۔ ۳۶۴

کتاب الرضاع

رضاعی چچا اور بھتیجی کے درمیان نکاح درست ہے۔ ۳۶۵
رضاعی بھائی سے رضائی بہن کی حقیقی بہن کا نکاح درست ہے۔ ۳۶۶
رضاعی لڑکا رضاعی بہن کے نسبی اصول وفروع کے ساتھ نکاح درست ہے۔ ۳۶۷
رضائی ماموں سے رضاعی بھانجی کا نکاح درست ہے ۳۶۸

کتاب الطلاق

فلاں علاقہ سے نکاح نہیں کروں گا نکاح کی صورت میں ایک طلاق بائن ہوگی ۳۶۹
طلاق کے بارے میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہونا ۳۶۹
طلاق مغلظہ کا حکم ۳۷۰
فلانہ کی بیٹی تجھے ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق ۳۷۱
عورت کا شوہر کو طلاق دینا ۳۷۳

''ابھی چلی'' جا طلاق کا حکم ۳۷۴
بدون پڑھے طلاق نامہ بے دستخط کرنا ۳۷۶

باب فی العدة

عورت کو کرایہ کے گھر میں عدت گذارنا ۳۸۰
بے نمازی عورت کو طلاق دینا کیسا ہے؟ ۳۸۰

کتاب الایمان والنذور

کفارۂ قسم میں بیس مساکین کو ایک وقت کھانا کھلانا ۳۸۱
کفارۂ قسم میں کس مقدار کا کپڑا دینا پڑے گا؟ ۳۸۱
کفارہ قسم میں نیا کپڑا دینا ضروری ہے یا نہیں؟ ۳۸۱
نذر کا وہی کفارہ ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ ۳۸۲
کلمہ طیبہ سے قسم کھانا ۳۸۳
قرآن مجید سے قسم کھانا ۳۸۴
نابالغ فقیر مسکین کو کھانا کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا۔ ۳۸۵
متعدد قسم کا ایک ہی کفارہ کافی ہے۔ ۳۸۶

کتاب الوقف

متولی کو مسجد کا حق معاف کرنے کا اختیار نہیں ۳۸۹
موقوفہ زمین بیچنے اور عوض میں تبدیل کرنے کا حکم ۳۹۰
مسجد شرعی کے لیے جگہ کا موقوفہ ہونا شرط ہے ۳۹۱
قبرستان کی موقوفہ جگہ پر مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا ۳۹۲
استبدال وقف کی جائز و ناجائز صورتیں ۳۹۳
قبرستان کے اوپر ستون کھڑے کر کے دو منزلہ تعمیر کرنا ۳۹۴
پرانے قبرستان پر مسجد تعمیر کرنا ۳۹۸

بڑے ٹاور کا ایک حصہ مسجد کے لئے وقف کرنا ۳۹۹
لیز شدہ زمین مسجد کے واسطے وقف کرنا ۴۰۰
مسجد کی تجارتی زمین کی خرید وفروخت درست ہے ۴۰۱

فصل فی احکام المساجد

مال حرام سے بنی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے ۴۰۳
مسجد منتقل کرنے کا حکم ۴۰۳
مسجد کی چھت پر امام کا کمرہ وغیرہ بنانا ناجائز ہے ۴۰۴
مسجد کے اندر با اجرت تعویذ لکھنا ناجائز ہے ۴۰۵
مسجد کے فرش یا دیوار پر جنبی کا تیمّم کرنا ناجائز ہے ۴۰۶
اپنے محلّہ کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنا ۴۰۷
مسجد کی چھت پر کدو وغیرہ کی بیل چڑھانا ۴۰۸
مسجد کے اندر چندہ کرنے کا حکم ۴۰۸
بے نمازی عورت کو طلاق دینا ۴۱۰
مال حرام مسجد کی تعمیرات میں صرف کرنا ناجائز ہے ۴۱۱
منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دور حاضر کے منبر جدید کا حکم ۴۱۲
امت محمدیہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور پیروی لازم ہے ۴۱۶
شعائر اللہ کی تعظیم واحترام ہر مسلمان پر ضروری ہے ۴۱۸
شعائر اللہ کی تعریف ۴۱۹
شعائر اللہ کے ماتحت کیا کیا چیزیں داخل ہے ۴۱۰
منبر نبوی کی بے حرمتی ایک عجیب وغریب واقعہ ۴۲۰
منبر دعاء قبول ہونے کی جگہوں میں سے ایک جگہ ہے ۴۲۰
منبر کی تعمیر کے بارے میں آپ ﷺ کا صحابہ کرامؓ سے مشورہ کرنا ۴۲۲
منبر نبوی کی مختصر تاریخ ۴۲۳
منبر نبوی کس سن میں بنایا گیا ۴۲۴

منبر نبوی کس درخت کی لکڑی سے تیار کیا گیا ۴۲۴
منبر نبوی کے نجار کے اسماء ۴۲۵
عہد رسالت خلفاء راشدین کے دور میں منبر نبوی کی تین سیڑھیاں تھیں ۴۲۵
منبر نبوی کی شکل وصورت طول وعرض کیا تھے ۴۲۷
منبر مسجد نبوی کے کس جگہ پر نصب تھا ۴۲۹
آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین منبر کے کس درجے پر بیٹھتے تھے ۴۳۰
خلاصہ بحث وجواب استفتاء ۴۳۱
بعض شبہات کے ازالات ۴۳۳
پکا منبر بدعت نہیں ۴۳۳

کِتَابُ الْاِیْمَانِ وَالْعَقَائِدِ

ایمان اور اسلام کی تعریف

(۱) سوال:- جناب مفتی صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کے دارالافتاء میں ماہ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ کو اسلام قبول کیا، میرے اسلام لانے کا پورا قصہ آپ کو معلوم ہے، آتے وقت آپ نے مجھے چند نصیحتیں فرمائی تھیں، ان میں سے بعض یہ کہ عقیدہ میں اٹل رہنا، شرک اور بدعت سے اجتناب کرنا اور دینی مسئلہ، مسائل کسی محقق عالم دین سے پوچھنا، موقع ہو تو تبلیغی جماعت میں چلّہ لگانا اور آپ نے تاکید کے ساتھ کہا تھا کہ کبھی بھی بریلوی اور جماعتِ اسلامی کے عقائد والوں سے دوستی نہ رکھنا۔

اب بات یہ ہے کہ میں ایک مسلمان بھائی کے تعاون سے ملازمت کے تحت ابوظہبی میں آ گیا ہوں، ابوظہبی میں بعض جماعت والے مجھے اپنی جماعت کی طرف دعوت دیتے ہیں، مگر میں ان کی دعوت کا جواب نہیں دیتا اور ایک مصیبت یہ ہے کہ جو مسئلہ، مسائل مجھے پیش آتے ہیں انکا حل یہاں کے علماء سے لینا مشکل ہے، جبکہ وہ لوگ سلفی ہیں، ایک دیوبندی عالم صاحب نے کہا تھا کہ یہ لوگ فقہ اور کچھ حدیثوں کو نہیں مانتے اور ہم لوگ حنفی ہیں، البتہ ہمارے محلّہ کی ایک مسجد کے امام صاحب بنگلہ دیشی ہیں اور دیوبندی مسلک کے ہیں، ضروری مسائل ان سے پوچھتا ہوں جس قدر مسائل کے جوابات ان کو معلوم ہیں وہ ان کا جواب دیتے ہیں، ایک روز عقیدہ صحیحہ اور شرک و بدعت کے متعلق ان سے پوچھا، تو انہوں نے کہا کہ یہ مسائل پیچیدہ ہیں انکا حل کسی معتبر محقق عالم سے حل کرو، پھر مجھے دارالافتاء کی بات یاد آئی، اب مجھے مندرجہ ذیل مسئلہ کا حل کرنا مقصود ہے۔

✵ ایمان اور اسلام کسے کہتے ہیں اور ایمان اور اسلام کے درمیان کیا فرق ہے؟ تفصیل سے تحریر فرمائیے۔

مستفتی: محمد عبدالرحمٰن، ابوظہبی۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

لغت میں ایمان کا معنی ہے کسی امر کے بارے میں یقین کرنا دل سے تصدیق کرنا، اس کا مان لینا، اصطلاح شریعت میں ایمان کا معنی ہے اس حقیقت کو ماننا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے، وہی عبادت کے

لائق ہے، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اس کے تمام ذاتی وصفاتی کمالات جو قرآن واحادیث سے ثابت ہیں، سب کے سب برحق ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور نبی ہیں، ان کی ذات صادق ومصدوق ہے اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری رسول اور آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی رسول اور نبی نہیں آئیگا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری شریعت ہے، پوری زندگی اس پر چلتے ہوئے مرنا۔

محدثین کے نزدیک ایمان کے تین اجزاء ہیں

(الف) "تَصدِیقٌ بِالْقَلْبِ" (یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا یقین کرنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر دل سے یقین کرنا اور اس یقین واعتماد پر دل ودماغ کا مطمئن رہنا)۔

(ب) "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" (یعنی اس دلی یقین واعتماد کا زبان سے اظہار واقرار کرنا)

(ج) "اَعْمَالٌ بِالْجَوَارِحِ" (یعنی دین وشریعت کے احکام کو اعضاء وجوارح کے ذریعہ اُس دلی یقین واعتماد کا عملی مظاہرہ کرنا، ان تینوں اجزاء سے مل کر "ایمان" کی تکمیل ہوتی ہے اور جو شخص اس ایمان کا حامل ہوتا ہے اس کو مؤمن ومسلمان" کہا جاتا ہے۔

ایمان اور اسلام میں فرق

ایمان اور اسلام میں فرق ہے؟ یا دونوں لفظ یکساں مفہوم کو ادا کرتے ہیں؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تفصیلی بحث کا متقاضی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں، نہ آپ کیلئے سمجھنا آسان ہے۔

خلاصہ کے طور پر اتنا بتادینا کافی ہے کہ ظاہری مفہوم ومصداق کے اعتبار سے تو یہ دونوں لفظ تقریبا یکساں مفہوم کیلئے استعمال ہوتے ہیں، لیکن اس اعتبار سے ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ "ایمان" سے عام طور پر ان غیب کی چیزوں کا دل سے یقین کرنا جن کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے وحی قرآن اور سنت کے ذریعہ خبر دی ہیں، مثلا اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں، وہ ہمارا خالق ومالک ومعبود ہے، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ انسانوں کو رسول اور نبی بنا کر بھیجا ہے اور ان میں بعضوں کو کتابیں دیکر بھیجا ہے وغیرہ وغیرہ، جبکہ "اسلام" سے اکثر وبیشتر ظاہری اطاعت وفرمانبرداری مراد لی جاتی ہے، اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ "وحدانیت ورسالت اور شریعت کو ماننے اور تسلیم کرنے" کا نام ایمان ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان

ویقین کرنے کے بعد اس کے حکموں پر چلنا اور حکموں کی خلاف ورزی نہ کرنے کا نام اسلام ہے مثلاً اللہ کا حکم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اعمال کرنے کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرو اور جن کاموں سے منع کیا ہے ان کو نہ کرو یہ اسلام ہے، بعض محققین کا قول ہے کہ تصدیق قلبی جب پھوٹ کر جوارح (اعضاء) پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام اسلام ہے اور اسلام جب دل میں اُتر جائے تو ''ایمان'' کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ ایمان کی چیزوں کا دل سے یقین کرنا ایمان ہے اور ایمان کے مطابق عمل کرنا اسلام ہے، اسی لئے ایمان اور اسلام ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں، نہ تو ایمان کے بغیر اسلام معتبر ہوگا، اور نہ اسلام کے بغیر ایمان مکمل ہوگا مثلاً کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز بھی پڑھے، لیکن کہتا ہے یہ فرض نہیں اور ہر سال زکوٰۃ بھی ادا کرے مگر کہتا ہے یہ عبادت نہیں، بلکہ ٹیکس ہے اور استطاعت ہو تو حج بھی کر ڈالے اور اسی طرح دوسرے نیک کام کر کے اپنی ظاہری زندگی کو ''اسلام'' کے مطابق کرے، مگر اس کا باطن ''قلبی تصدیق وانقیاد'' سے یکسر خالی ہو اور کفر وانکار سے بھی بھرا ہوا ہو، تو اس کے سارے اعمال بیکار محض قرار پائیں گے، اسی طرح اگر کوئی شخص ایمان یعنی قلبی تصدیق تو رکھتا ہے مگر عملی زندگی میں وہ اعمال اسلام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ سے لاتعلق رہتا ہے اور اعمال کے بجائے سرکشی ونافرمانی کا پیکر اور کافرانہ ومشرکانہ اعمال کا مجسمہ بنا ہوا ہے، تو اس کا ایمان واسلام کو ماننے کا اقرار اسے دوزخ کے عذاب سے بچانے والا نہیں بنے گا، یہاں پر اختصار کے ساتھ آپ کا جواب دیا گیا ہے امید ہے کہ کچھ اطمینان ہوگا، تفصیل کے لئے کبھی بنگلہ دیش آین گے تو دار الافتاء تشریف لانا مزید تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دار الافتاء
۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ — ۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

اہل سنت والجماعت کا تعارف

(۲) سوال:- جناب مفتی صاحب! بعد سلام مسنون عرض یہ کہ بریلوی حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگ اہل سنت والجماعت کے لوگ ہیں اور علمائے دیوبند والے گمراہ اور کافر ہیں اور علمائے

دیوبند کہتے ہیں وہ اہل سنت والجماعت والے ہیں اب سوال یہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کی تعریف کیا ہے؟ اوران کی علامتیں کیا کیا ہیں؟ اس بارے میں حق بات کیا ہے؟

الجواب وھوالموفق للصواب

''اہل سنت'' کا معنی سنت کے پیروکار'' والجماعت'' ''السنۃ'' پر عطف ہے یعنی سنت کے پیروکار اوران کی جماعت کے لوگ مراد ہیں، جس سے جماعت صحابہ مراد ہے، پس اہل سنت والجماعت اس گروہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ پر ہو اور حضرات فقہاء اور محدثین اور متکلمین، اولیاء اللہ وعارفین سب اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، اصول دین میں یہ سب متفق ہیں، ان حضرات میں اختلاف فروعی اور جزئی ہے، اصولی نہیں۔

اہل سنت والجماعت پر قائم اوراس پر اٹل رہنے کی فضیلت

(۱) روی عن علی بن أبی طالب رضی اللّٰہ عنه أنه قال المؤمن إذا أوجب السنة والجماعة استجاب دعاءہ وقضی حوائجه وغفرله الذنوب جميعًا وكتب له براءة من النار وبراءة من النفاق، وفی خبر عبداللّٰہ بن عمر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنهما عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم أنه قال من كان علی السنة والجماعة استجاب اللّٰہ دعاءہ وكتب له بكل خطوة يخطوها عشر حسنات ورفع له عشر درجات. الخ

(البحر الرائق، کتاب الکراهية: ج۸ص ۱۸۲)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ مؤمن جب اہل سنت والجماعت کو لازم پکڑ لیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتے ہیں اور اس کے تمام حوائج کو پورا کردیتے ہیں اوراس کے سارے گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں اور یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اس کا نام جہنم اور نفاق کے دفتر سے کاٹ دیا گیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اہل سنت والجماعت کو لازم پکڑ لیتا ہے اس کے ہر قدم پر دس نیکیاں لکھ دیجاتی ہیں اور دس درجوں کو بلند کیا جاتا ہے۔

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: إن اللّٰہ لايجمع أمتی أوقال أمة محمد علی

ضلالة ويدالله على الجماعة ومن شذ شذ فى النار رواه الترمذى.

(مشكوٰة، كتاب الإيمان، باب الاعتصام بالكتاب والسنة: ج ۱ ص ۳۰)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ میری امت کو یا (میری امت کے بجائے) یہ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کو گمراہی پر اتفاق ہونے نہیں دیگا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ مسلمانوں کی جماعت پر ہے اور جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوا اسکو (جنتیوں کی جماعت سے) الگ کر کے دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

حدیث کی روشنی میں اہل سنت والجماعت کی علامتیں

✵ **قال فى "البحر الرائق" فقيل له يارسول الله متى يعلم الرجل أنه من أهل السنة والجماعة فقال إذا وجد فى نفسه عشرة أشياء فهو على السنة والجماعة أنّ يصلى الصلوات الخمس بالجماعة ولايذكر أحدًا من الصحابة بسوء ولاينقصه ولايخرج على السلطان بالسيف ولايشك فى إيمانه ويؤمن بالقدر خيره وشره من الله تعالىٰ ولايجادل فى دين الله تعالىٰ ولايكفر أحدًا من أهل التوحيد بذنب ولايدع الصلوٰة على من مات من أهل القبلة ويرى المسح على الخفين جائزًا فى السفر والحضر ويصلى خلف كل إمام بر أوفاجر.** (كتاب الكراهية. ج ۸ ص ۱۸۲)

یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ فرما دیجئے کہ آدمی کیسے سمجھے گا کہ بندہ اہل سنت والجماعت میں سے ہے، پھر آپ صلی اللہ وسلم نے فرمایا: جس آدمی کے اندر یہ دس چیزیں ہوں گی وہی آدمی اہل سنت والجماعت کے اندر شامل وداخل ہوگا اور دس چیزیں یہ ہیں:

(۱) جو پانچ وقت نماز باجماعت پڑھے گا۔
(۲) صحابۂ کرام میں سے کسی کی برائی بیان نہیں کریگا، نہ ان پر کسی قسم کی تنقید کریگا۔
(۳) بادشاہ عادل سے نہیں لڑے گا۔
(۴) ارکان ایمان واعمال ایمان میں مضبوط اور پکّا رہے گا کسی قسم کا شک نہیں کرے گا۔
(۵) تقدیر پر ایمان رکھے گا کہ بھلا اور بُرا سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے پر یقین رکھے گا۔
(۶) فروعی مسائل میں جھگڑا اور فساد نہیں کریگا۔

(۷) کسی ایماندار موحد پر کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے کافر کا حکم نہیں لگائے گا۔

(۸) کسی اہل قبلہ ایماندار کی نماز جنازہ نہیں چھوڑے گا۔

(۹) سفر وحضر میں مسح علی الخفین کو جائز سمجھے گا۔

(۱۰) اہل سنت والجماعت کی مسجد کے امام کی اقتداء میں نماز پڑھے گا خواہ وہ متقی ودیندار ہو یا غیر متقی۔

فتاویٰ حاوی میں بھی دس علامتوں کا ذکر ہے ان میں سے بعضوں کا تذکرہ حدیث شریف میں ہے اور مابقیہ چیزوں کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں ایسی کوئی بات نہیں کریگا جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان کے خلاف ہو۔

(۲) قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اس پر یقین رکھے گا۔

(۳) حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی، رضوان اللہ علیہم کو تمام صحابہ کرام پر فضیلت دے گا۔

(۴) اہل سنت والجماعت جو مذکورہ باتوں کا حامل ہوگا اور ان کے ساتھ رہنے کو باعث رحمت ونجات سمجھے گا اور ان عقائد سے جدا ہونے کو سبب ہلاکت وعذاب جانے گا۔

كما قال فى "البحر" وفى "الحاوى" من أهل السنة والجماعة من فيه عشرة أشياء الأوّل: أن لايقول شيئاً فى الله تعالىٰ لايليق بصفاته، والثانى أن يقربأن القرآن كلام الله تعالىٰ وليس بمخلوق ...... السابع: يُفضِّل أبا بكر وعمر وعثمان وعليًا على سائر الصحابة ...... العاشر: يرى الجماعة رحمةً والفرقة عذاباً. (كتاب الكراهية: ج۸ ص۱۸۲)

✿ اور بعض علماء نے اور چند علامتیں ذکر کی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) الاعتصام بالكتاب والسنة والعضّ على ذلك بالنواجذ.

(۲) التحاكم إلى الكتاب والسنة فى الأصول والفروع.

(۳) حبهم لأهل السنة والجماعة والمتمسكين بها وبغضهم لأهل البدع.

(۴) لايستوحشون من قلة السالكين لأن الحق ضالة المؤمن ياخذ به ولوخالفه الناس.

(۵) الصدق فى الأقوال والأفعال بالتطبيق الصحيح لهدى الكتاب والسن.

(۶) التأسى برسول الله صلى الله عليه وسلم الذى كان خلفة القرآن.

(نور السنة ص ۳۴-۳۵)

(۱) یعنی قرآن وسنت کو حق جان کر ان پر مضبوطیٔ ایمان وعمل کے ساتھ پابندی کرنے والا ہوگا۔

(۲) جو اصول وفروع میں قرآن وحدیث کو حاکم اور فیصل مانے گا۔

(۳) جو لوگ اہل سنت والجماعت سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں، ان کے ساتھ مضبوطی سے جمار ہے گا۔

(۴) حق پر عمل کرنے اور حق کے ساتھ چلنے میں وحشت نہیں کریگا اگرچہ حق پر چلنے والوں کی تعداد کم ہو، نہ کسی کی ملامت اور طعن سے ڈرے گا اگرچہ لوگوں کی اکثریت مخالف ہوجاوے۔

(۵) اپنے اقوال وافعال میں سچا رہے گا قرآن واحادیث کی نصوص میں ایک کو دوسرے کے موافق ومطابق جانے گا اوران میں مخالفت نظر آوے تو تطبیق دے گا۔

(۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر عمل کرتا رہے گا اور رسومات وبدعات سے دور رہے گا۔

ان امور مذکورہ میں غور کرکے ہر صاحب رائے عقلمند فیصلہ کرسکتا ہے کہ ان گروہ (دیوبندی، بریلوی) میں سے کونسی جماعت حق پر ہے اور اہل سنت والجماعت کہلانے کی مستحق ہے۔

فلينظر شرائط أهل السنة والجماعة وليعتقد بمن فيهم الشرائط والله تعالىٰ أعلم وهو الهادى للحق والصواب لمن يشاء.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

کتبہ محمد کمال حسین مومن شاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
یکم محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

بَاب الإِيُمَان بِالْقَدُرِ

(۳) سوال:- تقدیر کے معنی کیا ہیں؟ قضا اور قدر کے درمیان کیا فرق ہے؟ تقدیر پر ایمان لانا کیا فرض ہے؟ اور تقدیر میں غور وفکر کرنا کیسا ہے؟ کیونکہ جب میں اس میں غور کرتا ہوں تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

تقدیر اور قدر کے معنی ہیں: اندازہ، ٹھہرانا، مقرر کرنا، حکم لگانا، یہ تقدیر کا لفظ قدر سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنی اندازہ کرنے کے ہیں، اصطلاح شریعت میں تقدیر کا مطلب ہوتا ہے کہ کائنات کی جملہ خلقت کے بارے میں خالقِ کائنات جو خیر وشر مقدر اور مقرر کرچکے ہیں اس پر بندہ کا یقین کرنا ایمان ہے

کہ اچھا اور بُرا جو بھی ہوگا اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طے شدہ فیصلہ کے مطابق ہوگا، اسی کو قضا وقدر سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

قضا وقدر کا فرق

علماء نے قضا اور قدر کا فرق بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ ”قضا“ تو اس حکم کلی کا نام ہے جو ازل میں اللہ تعالیٰ نے دیا جبکہ ”قدر“ اس کی جزئیاتِ تفصیلی کا نام ہے، اس صورت میں قضا پہلے ہوگی پھر قدر، دوسرا یہ کہ قدر طے شدہ امر اور قضا طے شدہ امر کے موافق حکم جاری ہونا، پھر تو قدر طے کرنا، مقرر کرنا ہے اور اس کے موافق حکم جاری کرنا اور جاری ہونا قضا ہے۔

تقدیر پر عقیدہ: -شریعت اسلامی میں تقدیر کو ایسے اہم اور بنیادی عقیدہ کا درجہ حاصل ہے، جو ایمانیات کے پہلو میں جگہ پائے ہوئے ہے، تقدیر پر ایمان لانا فرض اور لازم ہے، ”تقدیر“ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہونے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے اندازے اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہے، ہر چیز اس کے ارادہ وحکم کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے، اس کی مرضی ومشیت کے خلاف ایک پتہ تک نہیں ہلتا، ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، ہر عمل کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، عمل خواہ نیک ہو یا بد، اس نے ہر ایک کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کا ہر عمل لوح محفوظ میں لکھ چھوڑا ہے، جو بھی نیک یا بُرا عمل وقوع پذیر ہوتا ہے، وہ اس کے ارادہ وفیصلہ کے مطابق ہوتا ہے، البتہ اللہ تعالی کا یہ اصول بھی ہے کہ ایمان وطاعت سے وہ راضی وخوش ہوتا ہے اور کفر وگناہ سے ناراض وناخوش ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ چونکہ بندوں سے غایت درجہ محبت رکھتے ہیں اس لئے اس نے بندوں کو اختیار دیا ہے کہ اللہ تعالی کے چاہنے کے موافق وہ اگر نیک عمل کرے گا اس کا بہترین بدلہ دیگا اور اگر دنیا میں پڑ کر من مانی کرتا ہے، بے ایمانی کرتا ہے کفر وشرک اور نافرمانی کرتا ہے، تو اس کو بدلہ اس کا دیا جائے گا، ایمان والوں کا بدلہ جنت اور نعمتِ جنت ہے اور کافروں کا بدلہ جہنم اور اس کی سزا ہے۔

قضا وقدر کے مسئلہ میں غور وفکر اور بحث ومباحثہ لاحاصل ہے، یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ تقدیر یعنی قضا وقدر کا معاملہ ایک ایسی غیبی حقیقت ہے جو صرف مانے جانے اور تسلیم کئے جانے کی طالب ہے، نہ کہ غور وفکر اور بحث ومباحثہ کی، اس کے متعلق شارع اور شریعت نے جو کچھ بتایا ہے اور جتنا حکم دیا ہے بس اسی کو جوں کا توں ماننا، تسلیم کرنا اور اس پر کامل یقین رکھنا ہے، اپنے دین وایمان کو سلامت رکھنا ہے، اس مسئلہ میں غور وفکر اور بحث ومباحثہ کرنا اور عقلیت پسندی کا مظاہرہ کرنا نہ صرف یہ کہ

جائز نہیں ہے، بلکہ اپنے ایمانی وجود کو ایک مہلک راستہ پر ڈال لینے کے مترادف ہے، علماء راسخین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ تقدیر اللہ تعالیٰ کا ایسا ''بھید'' ہے جس کا عام انسانی عقل وادراک میں آنا تو درکنار اس کو نہ تو کسی مقرب ترین فرشتہ پر ظاہر کیا گیا ہے اور نہ ہی اس کی حقیقت کسی بڑے سے بڑے نبی اور رسول پر منکشف کی گئی ہے، لہٰذا اس بارہ میں غور وفکر اور بحث ومباحثہ سے اجتناب کر کے بس اس عقیدہ پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہئے کہ تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور مخلوق کا کام اپنے خالق، پروردگار کی عبادت واطاعت میں لگے رہنا ہے، اس نے اپنی صفت رحمت کے اظہار کیلئے جنت بنائی ہے اور صفت عدل کے اظہار کیلئے دوزخ، وہ جس کو چاہے اپنی رحمت سے جنت میں پہنچادے اور جس کو چاہے دوزخ میں ڈال دے، اس کو مالک ہونے کے اعتبار سے اختیار کلی ہے، مگر نظام ایسا ہے کہ کسی بندہ کو نہ بلاوجہ تقدیر کی وجہ سے جنت میں جگہ دیگا، نہ کسی کو دوزخ میں، بلکہ جو کچھ دیگا اس کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں کہ جو ایمان لائیگا اور اس کے مطابق عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کے ایمان وعمل کے بدلہ میں جنت دے گا اس کے برخلاف جو شرک وکفر اور بدعملی کرے گا وہ غضب الٰہی کے ساتھ اور کفر کرنے اور بدعملی کرنے کے بدلہ میں دوزخ میں لے جائیگا اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، نہ کرے گا، وہ رحیم ہے، بندوں سے رحمت کا معاملہ کرے گا اور یہ کہ وہ کسی کے ایمان وعمل کو ضائع کرتا ہے، نہ ضائع کرے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عرض کیا کہ مجھے تقدیر کے بارے میں بتائیے تو انہوں نے فرمایا: کہ یہ ایک ایسا (طویل اور پُر پیچ) راستہ ہے جس کو کبھی طے نہ کرسکو گے، لہٰذا اس راستہ پر نہ پڑو اس نے پھر پوچھا تو فرمایا کہ یہ ایک بہت گہرا سمندر ہے اس میں نہ اُترو، اس نے پھر پوچھا تو حضرت علی رضی عنہ نے فرمایا: عزیزم تقدیر اللہ کا بھید ہے جو تم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے، تمہیں اس کے پیچھے نہیں پڑنا چاہئے۔ (کذا فی المرقاۃ) فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح:
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۵؍صفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومن شاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۵؍صفر ۱۴۲۷ھ

دوا، منتر اور تعویذ تقدیری فیصلہ کو ہٹا سکتا ہے یا نہیں

(۴) سوال:- دوا، منتر اور تعویذ وغیرہ تقدیری فیصلہ کو ہٹا سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی تقدیر میں جو بیماری مقدر ہے اس کو اگر دوا ہٹا سکتی ہے تو تقدیر کا معنی اور حقیقت کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

دیکھئے! بیماری اللہ دیتا ہے اس کے لئے بھی ظاہری سبب ہے، بدپرہیزی کرنا، جب آدمی بدپرہیزی کرتا ہے تو کبھی اللہ تعالیٰ فضل کرتا ہے کہ بیماری سے بچ جاتا ہے لیکن کبھی اللہ تعالیٰ کا فضل نہیں ہوتا تو آدمی بیمار ہوجاتا ہے، اسی طرح بیماری کا دور کردینا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کام ہے، دوا ایک سبب ہے، اللہ نے اس میں شفا رکھی ہے، اگر وہ چاہے گا، تو دوا سے شفا دیگا ورنہ نہیں، تو دوا صرف ایک ظاہری ذریعہ ہے، حقیقی شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، چنانچہ حدیث میں ہے:

عن جابر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: لكل داء دواءٌ فإذا أصيب دواء الداء بُرءَ بإذن اللّٰه. رواه مسلم. (مشکوۃ: کتاب الطب والرقی ج۲ ص۳۸۷)

دوا وغیرہ سے شفا پانا یہ بھی تقدیری فیصلہ کے تحت داخل ہے، یعنی شاید تقدیر میں ایسا لکھا ہو کہ بیماری کی شفا دوا میں ہے پھر جب آدمی بیماری کی اس دوا کو استعمال کرے گا تو شفا پائے گا، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ شفا دینا چاہے۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ہے:

عن أبی خزامة عن أبيه قال: قلت: يارسول اللّٰه! اِأرأيت رقیً نستر قيها ودواء نتداوی به و تقاةً نتقيها هل ترد من قدر اللّٰه شيئاً؟ قال: هی من قدر اللّٰه.

(ترمذی، ابو اب الطب) باب ماجاء فی الرّقی و الأدوية، ۲/۲۷، ابن ماجه، ابو اب الطب، باب ماانزل اللّٰه داء الا انزل شفاء ص ۲۴۵، مسند احمد ۳/۴۲۱)

شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یعنی اس بات سے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہو کر رہے گا یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بیماری پر دم کرنا، یا اس کا علاج کرنا یا اس کیلئے دعا مانگنا یا اس سے صدقہ اور خیرات کرنا بیکار ہے یا یہ چیزیں تقدیر کے لکھے ہوئے کو ٹال دیتی ہیں؟ فرمایا کہ فائدہ بھی تقدیر میں درج ہے کہ اگر ایسا کیا جائے گا تو فائدہ ہوگا، علماء نے لکھا ہے کہ تقدیر کی دو قسمیں ہیں: (۱) مُبْرَمٌ (۲) مُعَلَّقٌ

”تقدیر مبرم“: میں ردوبدل نہیں ہوتا اور ”تقدیر معلّق“: جس میں ردوبدل ممکن ہے، لہٰذا مذکورہ بالا چیزوں کا تعلق تقدیر معلق سے ہے یا مبرم سے اس حقیقت کا پتہ انسان کو بعد میں چلتا ہے مثلاً دوا سے فائدہ تو سمجھتا ہے کہ مقدر کی بات ہے اس لئے چاہئے کہ انسان تقدیر کے معاملہ کو بے چوں وچرا مان لے، اس میں تردد نہ کرے، اس میں سلامتی ایمان ہے، اس میدان میں عقلیات کے گھوڑے دوڑانا کچھ کام نہیں آتا۔

لہٰذا دوا اور منتر اور تعویذ وغیرہ اشیاء تقدیر مبرم میں اثر نہیں ڈالتیں، البتہ تقدیر معلّق میں اثر کرتی ہیں اور یہ بھی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور یہ بھی مشروط ہے کہ دوا استعمال کرنے کے بعد جب اللہ چاہے گا تو شفا دیگا اور جب نہ چاہے گا تو شفا نہیں ملی گی، شفا دینا یہ اللہ کی رحمت ہے، اسکی مصلحت وہ جانتا ہے اور شفا دینا یہ بھی اس کی رحمت ہے، اس کی حکمت بھی وہ جانتا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۷/صفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۷/صفر ۱۴۲۷ھ

* * *

بابُ الأنبياءِ عليه السلام والرُّسُلِ عليه السلام

نبی اور رسول کی تعریف

(۵) سوال:- نبی اور رسول کن لوگوں کو کہتے ہیں؟ کل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعداد کتنی ہے؟ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث ہے؟ کہ جس میں ان کی تعداد کا ذکر ہے؟ بندہ نے ایک عالم صاحب سے اس بارے میں پوچھا تھا، توانہوں نے مشکوٰۃ شریف کی ایک حدیث کے حوالے سے ”ایک لاکھ چوبیس ہزار“ کہا اور بعض علماء دو لاکھ چوبیس ہزار بتاتے ہے“ اب دونوں عددوں میں کافی فرق ہے، نیز انکی تعداد کے متعلق ہمیں کیا عقیدہ رکھنا چاہئے؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

نبی وہ شخص ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کے احکام دوسرے تک پہنچانے کیلئے مقرر فرماتے ہیں، خواہ یہ احکام سابقہ نبی سے چلے آتے ہوں یا حضرت جبرائیل علیہ السلام کی معرفت سے ان کو ان باتوں کی اطلاع ملے اور ان کے ساتھ عقل میں نہ سمجھ میں آنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں، جنہیں معجزہ کہا جاتا ہے، اس عہدۂ نبوت کے بعد اگر اس کو کتاب بھی دیجاتی ہو وہ تو رسول بھی ہوتا ہے، ورنہ صرف نبی رہتے ہیں، ہر رسول نبی ہوتے ہیں مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔

قال فی ”المرقاة“ : والفرق بينهما أن الرسول من الأنبياء من جمع إلى المعجزة الكتاب المنزل عليه، والنبی غير الرسول من لم ينزل عليه كتاب، وإنما أمر أن يدعو إلى شريعة من قبله اه والمشهور فی الفرق بينهما أن الرسول من أمر بالتبليغ والنبی أعم والله تعالیٰ أعلم. (باب بدء الخلق وذكر الأنبياء عليهم الصلوٰة والسلام. (ج ١١ ص ٤٣. طبع باكستانی)

انبیاء علیہم السلام کی تعداد کا مسئلہ امر توقیفی ہے

عن أبی ذر رضی الله عنه قال: قلت: يارسول الله! أی الأنبياء كان أول؟ قال: آدم قلت يارسول الله! ونبی كان، قال: نعم نبیّ مكلمٌ قلت يارسول الله! كم

المرسلون؟ قال: ثلاثمأة بضعة عشر جمًا غفیرًا، وفی روایة عن أبی أمامة، قال أبو ذر: قلت یارسول اللّٰه! کم وفاء عدة الأنبیآء، قال؟ مائة ألف وأربعة وعشرون ألفاً، الرّسل من ذلک ثلثمائة وخمسة عشر جمًا غفیرًا.

(مشکوٰة .باب بدء الخلق وذکر الأ نبیاء : ج ۲ ص ۵۱۱)

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں: کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! سب سے پہلے نبی کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: حضرت آدمؑ! میں نے پھر پوچھا، کیا حضرت آدمؑ نبی تھے؟ فرمایا ہاں وہ نبی تھے انہیں اللہ رب العالمین سے شرف تکلم وتخاطب حاصل ہوا ہے اس کے بعد میں نے پوچھا: یارسول اللہ! انبیاء میں رسول کتنے ہوئے ہیں؟ آپ صلی اللہ وعلیہ وسلم نے فرمایا: کافی بڑی تعداد ہیں، تین سو دس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے اور ایک روایت میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منقول یہ الفاظ ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے عرض کیا ”یارسول اللہ“! تمام انبیاؑ کی کل تعداد (خواہ وہ رسول ہوں یا غیر رسول) کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ” ایک لاکھ چوبیس ہزار ہیں، ان میں رسول تین سو پندرہ ہوئے ہیں جو بڑی تعداد ہے۔

کل انبیاءؑ کی تعداد کے بارے میں اس حدیث میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ذکر ہے اور بعض روایتوں میں یہ تعداد دو لاکھ چوبیس ہزار بیان کی گئی ہے، بظاہر دونوں عدد میں زبردست تضاد ہے، اس لئے علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس بارے میں زیادہ تحقیق وجستجو نہ کرنی چاہئیے اور کوئی خاص عدد متعین نہ کرنا چاہیئے، بلکہ یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ انبیاءؑ کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اجمالی طور پر اس طرح ایمان لانا چاہئیے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول اور نبی بھیجے ہیں ہم ان سب کو رسول اور نبی برحق مانتے ہیں، اس عقیدہ اور اجمالی ایمان سے نہ کوئی نبی انبیاءؑ کے زمرہ سے باہر رہے گا اور نہ کوئی غیر نبی ان کے زمرہ میں شامل ہوگا۔

قال فی المرقاة شرح المشکوٰة: ”العدد فی هذا الحدیث وان کان مجزومًا به، لکنه لیس بمقطوع، فیجب الإیمان بالأنبیاء والرسل مجملًا من غیر حصر فی عدد، لئلا یخرج أحد منهم، ولایدخل أحد من غیر هم فیهم.

(باب بدء الخلق وذکر الأنبیاء ج۹ ص: ۷۳۱. طبع باکستانی)

فقط واللہ تعالی اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۵؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۱۵؍صفر المظفر ۱۴۲۶ھ

تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(۶) سوال:- تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر زندہ ہیں تو کیا کرتے ہیں؟ حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جمہور اہل سنت والجماعت کا عقیدہ جو کہ قرآن وحدیث اور اجماع امت کی روشنی میں ثابت ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسی طرح دیگر تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں اجساد عنصریہ کے ساتھ حیات ہیں اور یہ حیاتِ برزخی ہے اور یہ حیات برزخی، حیاتِ دنیوی سے کم نہیں ہے اور یہ حضرات دیدار الٰہی کے شوق میں نعمت اخروی کے احساسات میں تلذذ حاصل کرتے ہیں اور اپنی اپنی محبوب عبادتوں میں مصروف ہیں، یہ حیاتِ برزخی اگرچہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی، لیکن بلاشبہ حیات حسّی اور جسمانی ہے، اس لئے کہ روحانی اور معنوی حیات تو عام مؤمنین بلکہ ارواح کفار کو بھی حاصل ہے، انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس حیات کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں ملاقات ہوئی تھی ان سے باتیں کیں اور ان کی امامت کرائی اور روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہونے والوں کا آپ صلاۃ وسلام سنتے ہیں اور اس کا جواب دیتے ہیں۔

(۱) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الانبیاء علیہم السلام أحیاء فی قبور ہم یصلون

(شفاء السقام حیات الأنبیاء للبیہقی ص: ۱۳۴)

یعنی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

حدیث بالا کی صحت کے متعلق علامہ ہیثمیؒ فرماتے ہیں:

رجال أبی یعلی ثقات (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ۸/۲۱۱)

یعنی ابویعلیٰ کی سند کے سب راوی ثقہ ہیں۔

(۲) حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قال علیه الصلوۃ والسلام: ماھو احد یسلم علیّ إلارد اللہ علیّ روحی حتی أرد علیه السلام (ابوداود : ۲۷۹)

ترجمہ: کوئی شخص ایسا نہیں جو مجھ پر سلام پڑھتا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا جواب دیتا ہوں۔

حضرت حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ہے۔

رُواته ثقات. (فتح الباری : ۶/۱۷۹)

(۳) حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

لوٹانے کا معنی یہ کہ ارواح انبیاء مشاہدات باری تعالیٰ میں مشغول ہوتی ہیں، لیکن جب سلام پیش کرنے والے سلام کرتے ہیں تو ان کی روحوں کو اس کی طرف متوجہ کرادیتے ہیں تا کہ سلام کا جواب دیں۔

ان من افضل أیامکم یوم الجمعة، فیه خلق ادم وفیه قبض وفیه النفخة وفیه الصعقة فاکثر واعلیّ من الصلوٰة فیه فان صلوٰتکم معروضة علیّ قال قالوا: کیف تعرض صلوٰتنا علیک وقد ارمت قال یقولون بلیت، فقال: إن اللہ حرّم علی الأرض أجساد الأنبیاء.

(ابوداود: ج۱ ص ۱۵۰، نسائی: ۱/۱۶۴، مستدرک حاکم: ۴/۵۶۰)

ترجمہ: بے شک تمہارے افضل ترین ایام میں سے یوم جمعہ ہے، اس میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا کیا گیا اسی روز ان کی وفات ہوئی، اسی روز نفخہ اولیٰ ہوگا اور اسی روز میں نفخہ ثانیہ ہوگا، پس اس جمعہ کے روز تم لوگ کثرت کے ساتھ مجھ پر درود بھیجا کرو، کیونکہ تمہارا درود وسلام مجھ پر پیش کیا جاتا ہے راوی کہتے ہیں: صحابۂ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! بعد وفات دیگر اموات کی طرح آپ بھی ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، پھر ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا؟ پس آپ نے فرمایا اللہ نے زمین پر حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجساد کو حرام کردیا ہے، زمین ان کو کھا نہیں سکتی، فنا نہیں کرسکتی۔

(۴) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے ”فَنَبِیُّ حَیٌّ یُرْزَقُ“ (ابن ماجہ: ۱۱۹)

ترجمہ: پس اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں اُن کو رزق دیا جاتا ہے۔

- علامہ مناوی فرماتے ہیں: **ورجاله ثقات۔** (فیض القدیر ۲/۸۷)
- اور علامہ زرقانی فرماتے ہیں: **قلت رواه ابن ماجة برجال ثقات.**

(تهذيب التهذيب : ۳/۳۹۸)

- حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں. **قلت رجاله ثقات.** (تهذيب التهذيب:۳/۳۹۸)

(۵) حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال عليه الصلوٰة والسلام: من صلّى عند قبرى سمعته ومن صلى عليّ من بعيد أعلمته (جلاء الافهام لابن القيم : ۱۹)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے بھی میری قبر پر درود شریف پڑھا، تو میں اُسے خود سنتا ہوں اور جس نے مجھ پر دور سے درود اور سلام پڑھا تو بواسطۂ فرشتے مجھے بتلادیا جاتا ہے۔

- حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: **بسند جيد ،** (فتح البارى : ج۶ ص ۳۵۲)
- اور امام بخاریؒ فرماتے ہیں: **وسنده جيد .** (القول البديع :ص ۱۱۶)

(۶) علامہ تاج الدین سبکیؒ نے متکلمین اشاعرہ کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ومن عقائدنا أن الأنبياء عليهم السلام أحياء فى قبورهم.

(طبقات الشافعية الكبرىٰ : ج۶ ص ۲۶۶)

(۷) فقہ حنفی کی ابتدائی کتاب ''نورالایضاح'' میں ہے:

ولما هو مقرر عند المحققين أنه صلى الله عليه وسلم حيٌّ يرزق متمتع بجميع الملاذ والعبادات غيرانه حجب عن أبصار القاصرين عن شرائف المقامات (۱۷۷)

ترجمہ: محققین حنفیہ کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں زندہ ہیں، آپ کو رزق دیا جاتا ہے اور عبادات سے آپؐ لذت بھی اٹھاتے ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ وہ تمام ان لوگوں کی نگاہوں سے پردہ میں ہیں، جو ان کے مقامات تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

(۸) علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

إن الأنبياء أحياء فى قبورهم كماورد فى الحديث. (رسائل ابن عابدين :۲۰۳)

ترجمہ: حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

(۹) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

إن حياته صلى الله عليه وسلم في القبر لايعقبها موت بل يستمر حياته لأن الأنبياء أحياء في قبورهم (فتح الباری : ۴۷)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر میں زندگی ایسی ہے، جس پر کبھی موت طاری نہ ہوگی، بلکہ آپ ہمیشہ زندہ رہیں گے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں۔

(۱۰) حافظ بدر الدین عینیؒ فرماتے ہیں:

وإن الأنبياء عليهم السلام فإنهم لايموتون في قبورهم بل هم أحياء.

(عمدة القاری شرح البخاری : ج ۷ ص ۶۰۰)

انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، ان پر موت نہیں آئے گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ زندہ ہی رہیں گے۔

پس مذکورہ بالا نصوص اور روایات سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

لہٰذا حیات الانبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا عقیدہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے۔

نوٹ: مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو استاد محترم مدظلہ العالی کی کتاب ”جواہر الفتاوی“ جلد سوم مطالعہ کیا جائے وہاں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

وصلى الله عليه وسلم وآله وصحبه اجمعين .

فقط والله تعالىٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
مفتی محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بعض باتوں کی تحقیق

(۷) سوال:- جناب مفتی صاحب! گزشتہ ہفتے ایک جلسہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق چند باتیں سنی ہیں، ان میں سے بعض باتوں کی تحقیق جاننا چاہتا ہوں، جلسہ میں خطیب صاحب نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے اور قرب قیامت ان کو دوبارہ زمین پر لایا جائیگا۔

(۱) سوال یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے یا نہیں؟

(۲) اور اس وقت آپکی عمر کتنی تھی؟

(۳) اور قرب قیامت میں آپ کا نزول ہوگا وہ نزول کے بعد دنیا میں کتنی عمر زندہ رہیں گے؟

(۴) اور وفات کے بعد دفن کہاں کیا جائے گا؟

(۵) نزول کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام شادی کریں گے یا نہیں؟ اور ان کی اولاد وفرزند ہونگی یا نہیں؟

یہ باتیں احادیث سے جاننا چاہتا ہوں۔

(۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی علیہ السلام کی امت ہوکر نازل ہوں گے یا نبی ہوکر؟ اور آپ کس دین کی اتباع کریں گے؟

(۷) خطیب صاحب نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نماز عصر کے وقت نازل ہوں گے اور اسی نماز کی امامت حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کریں گے، اب سوال یہ ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام پیغمبر ہیں اور حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ امتی ہے تو ایک نبی کے ہوتے ہوئے امتی کیسے اور کیوں امامت کرے گا؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب(۱):- حضرت عیسیٰ علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا ہے ابھی تک وہ زندہ ہیں اور دوبارہ نزول تک زندہ رہیں گے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> إذقال الله یاعیسیٰ إنی متوفیک ورافعک الیّ ومطهرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا إلی یوم القیامة.

(ال عمران :ایة ۵۵)

ترجمہ: جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ (علیہ السلام کچھ غم نہ کرو) بیشک تم کو وفات دینے والا ہوں اور فی الحال میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں اور تم کو ان لوگوں سے پاک کرنیوالا ہوں جو منکر ہیں اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں انکو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ تمہارے منکر ہیں روز قیامت تک۔ (بیان القرآن)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

> وماقتلوه وماصلبوه ولكن شبه لهم (إلی قوله) وماقتلوه یقیناً بل رفعه اللهٰ إلیه

و کان اللّٰہ عزیزًا حکیمًا. (نساء: ۱۵۷)

ترجمہ: حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا لیکن ان کو اشتباہ ہو گیا الخ اور انہوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا بلکہ ان کو خدا تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں۔ (بیان القرآن)

ان آیات سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر زندہ اٹھایا گیا ہے۔

جواب (۲):- جس وقت حضرت عیسی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آسمان پر اٹھایا گیا، اس وقت ان کی عمر تینتیس سال تھی۔

کمافی "المرقاۃ" قال: إن عیسیٰ رفع به إلی السماء وعمره ثلاث وثلاثون سنةً. (باب نزول عیسیٰ علیه الصلاة والسلام ج ۹ ص ۴۴۲)

بعض نے اور بات کی ہیں لیکن صحیح یہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے۔

جواب (۳):- آسمان سے زمین پر اُترنے کے بعد وہ سات سال دنیا میں زندہ رہیں گے، تو دنیا کے لحاظ سے ان کی کل عمر اور مدتِ قیام چالیس سال ہے۔

کما فی "المرقاۃ": ویمکث فی الأرض بعد نزوله سبع سنین فیکون مجموع العدد أربعین لکن حدیث مکثه سبعًا رواہ مسلم فیتعین الجمع بماذکر أو ترجیح مافی الصحیح ولعل عدد الخمس ساقط من الاعتبار لإلغاء الکسر (ج ۹ ص ۴۴۲)

نوٹ:- واضح رہے کہ آسمان سے اُترنے کے بعد دنیا میں حضرت عیسی علیہ السلام کے رہنے کی مدت سات سال کے بارے میں امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے، لہٰذا یہ بات طے ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت "خمسًا وأربعین سنةً" جو پینتالیس سال مدت نقل کی گئی ہے، وہ دنیا میں ان کی مجموعی مدتِ قیام، ہے کہ اس مدت میں انکے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے کا عرصۂ قیام بھی شامل ہے اور آسمان سے اترنے کے بعد کی بھی مدت قیام۔ رہا چالیس اور پینتالیس کا فرق تو اس سلسلہ میں یا تو یہ کہا جائے کہ چالیس سال والے قول میں کسور یعنی پانچ کو حذف کر کے پوری مدت مراد لی گئی ہے، یا یہ کہ اس روایت کو راجح قرار دیا جائے جو صحیح مسلم میں منقول ہے۔

جواب (۴):- حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے وہاں دفن کیا جائے گا۔

عن عبداللّٰہ بن عمر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: ینزل عیسیٰ ابن مریم إلی الأرض فیتزوج ویولد له ویمکث خمسًا وأربعین سنة ثم یموت فیدفن معی فی قبری، فأقوم أنا وعیسیٰ ابن مریم فی قبر واحد بین أبی بکر وعمر.

(رواہ ابن الجوزی فی کتاب الوفاء، مشکوٰۃ: باب نزول عیسیٰ علیه الصلاوۃ والسلام: ج۲ ص ۴۸۰)

جواب(۵): -حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کریں گے کہ دجّال کو ماریں گے پھر تکلیف اٹھانے والوں کو تسلی دیں گے بیماروں اور زخمیوں کو باذن اللہ ہاتھ سے ٹھیک کریں گے پھر نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن عبداللّٰہ بن عمر قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: ینزل عیسیٰ ابن مریم إلی الأرض فیتزوج ویولد له الخ

(مشکوٰۃ: باب نزول عیسیٰ علیه الصلاۃ والسلام: ج۲ ص ۴۸۰)

جواب(۶): -یہ بات صحیح احادیث کے ذریعہ بالتحقیق ثابت ہے کہ قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اُتر کر دنیا میں تشریف لائیں گے اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی اتباع کریں گے اور اپنے تمام احکام شریعت محمدی ﷺ کے مطابق جاری ونافذ کریں گے اور خود بھی اس پر عمل کریں گے، اُن کی سابقہ شریعت منسوخ ہوگئی ہے، اس لئے اس پر عمل نہیں کریں گے۔

عن أبی هریرة رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: والذی نفسی بیده أن ینزل فیکم ابن مریم حکمًا وعدلاً فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة و یفیض المال حتی لایقبله أحد حتی تکون السجدة الواحدة خیرًا من الدنیا وما فیها ثم یقول أبوهریرة: فاقرء وا إن شئتم وإن من أهل الکتاب إلالیؤ منن به قبل موته. إلایة. متفق علیه:

(مشکوٰۃ: ج۲ ص ۴۷۹)

لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ نزول فرمائیں گے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوکر نازل ہوں گے، مگر اس کے باوجود اپنی شان نبوت ورسالت کے مرتبہ میں گھٹاؤ نہیں ہوگا، بلکہ انکو اپنی نبوت کے مرتبہ کے ساتھ اور ایک۔ اور درجہ (یعنی امت محمدیہ میں شامل ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوگا) پس یہ نہیں کہا جائے کہ وہ بھی عام امت کی طرح ہیں۔

واضح رہے کہ بعض محدثین نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہوکر نازل نہیں ہوں گے، بلکہ دین محمدی کے مقرر اور معین ہوکر نازل ہوں گے۔ چنانچہ مرقات میں ہے:

(إذا نزل ابن مريم فيكم وإمامكم منكم) أى من أهل دينكم وقيل من قريش وهو المهدى والحاصل أن إمامكم واحد منكم دون عيسىٰ فإنه بمنزلة الخليفة وقيل: فيه دليل على أن عيسىٰ عليه الصلوٰة والسلام لايكون من أمة محمدعليه الصلوٰة والسلام بل مقررًا لملته ومعينًا لأمته عليهما السلام

(مرقاة :باب نزول عيسىٰ عليه الصلاوة والسلام : ج۹ ص ۴۴۰)

جواب (۷):- حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود امامت سے انکار کریں گے پھر حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ امامت کریں گے: چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن جابر قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: لاتزال طائفة من أمتى يقاتلون على الحق ظاهرين إلى يوم القيامة قال: فينزل عيسىٰ ابن مريم، فيقول أميرهم: تعال! صَلِّ لنا فيقول: لا ان بعضكم على بعض أمراء تكرمة اللّٰه هذه الأمة، رواه مسلم. (مشكوٰة : ج۲ ص ۴۸۰)

حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کے امام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتدی ہونے کے متعلق حضرات محدثین کرام کی توضیح وتشریح یہ ہے کہ یہ بات اس امت محمدیہ کی تعظیم وتکریم کے پیش نظر ہوگی، چنانچہ حدیث مذکور میں اس کی تصریح ہے لہٰذا اس زمانہ میں حاکم وخلیفہ اور خیر وبھلائی کی تعلیم وتلقین کرنے کے ذمہ دار حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہوں گے، لیکن نماز کی امامت کا شرف حضرت امام مہدی رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل رہے گا، لیکن بعض روایتوں میں یہ منقول ہے کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے اور نماز میں شامل ہونے کا ارادہ کریں گے تو حضرت امام مہدی رحمہ اللہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی حالت میں ہوں گے اور چاہیں گے کہ امامت کے مصلے سے پیچھے ہٹ جائیں تاکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امامت کریں، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس وقت کی نماز کی امامت نہیں کریں گے، بلکہ خود حضرت مہدی رحمہ اللہ ہی کے پیچھے نماز پڑھیں گے، البتہ اس وقت کی نماز کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی امامت کیا کریں گے، کیونکہ وہ بہرحال حضرت امام مہدیؒ سے افضل ہیں۔

كمافى " المرقاة": "والمعنى شرع اللّٰه أن يكون إمام المسلمين منهم وأميرهم من عدادهم تكرمة لهم وتفخيمًا لشانئهم........ قال التفتازنى فى شرح

العقائد: الأصح أن عیسیٰ علیه الصلوٰة والسلام یصلی بالناس ویؤمهم ویقتدی به المهدی لأنه أفضل وإمامته أولیٰ

(باب نزول عیسیٰ علیه الصلاة والسلام: ج۷ ص ۳۲۱)

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۴/ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

بَابٌ فِي الْمُعْجِزَاتِ

معجزات اور کرامات کی تعریف اور ان کی اقسام

(۸) سوال:- معجزات اور کرامات کسے کہتے ہیں اور خوارق عادات کے انواع تو بہت ہیں، بندہ اس بارے میں ذرا تفصیل جاننا چاہتا ہے، امید ہے کہ جواب صواب سے نوازیں گے۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

معجزات معجزہ کی جمع ہے، جس کا معنی ہے وہ خارق عادت اشیاء جس کو اللہ تعالیٰ کسی نبی اور رسول کے ہاتھ سے ظاہر کردے اور دوسرے اس سے عاجز ہوں، لفظ معجزہ اصل میں ''عجز'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ناتواں ہونا، عاجز ہونے کے ہیں، اسی لفظ سے معجزہ بنا ہے، جس کے معنی ہیں عاجز کرنے والا، اعجاز دکھانے والا، اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کی سچائی ثابت کرنے کے لئے اور ان کی نبوت ورسالت کی دلیل کے طور پر جو خارق عادت نشانیاں ظاہر فرماتا ہے ان کو معجزہ کہا جاتا ہے، اور اس کو معجزہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ جس نبی اور رسول کے ہاتھ سے معجزہ ظاہر ہوتا ہے اس کی امت اور قوم کے لوگ نہ صرف یہ کہ مقابلہ میں اس معجزہ کی طرح کا کوئی کرشمہ دکھانے اور پیش کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، بلکہ اگر کوئی چاہے کہ اس معجزہ کا توڑ کردے تو یہ ممکن نہیں ہوتا۔ (کمافی المرقاة: ج ۱ ص ۱۸۳)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے ''معجزہ کا لفظ اعجاز سے لیا گیا ہے جس کے معنی عاجز کرنے کے ہیں اور معجزہ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو خارق عادت ہو اور جس سے نبوت

ورسالت کا دعویٰ بظاہر ثابت ہوتا ہے اور جو خارق عادت ظہور نبوت سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں، ان کو معجزات نہیں کہتے، بلکہ ''ارہاصات'' کہتے ہیں جو ''ارہاص'' کی جمع ہے، اور ''رہاص'' کے لغوی معنی مکان کو اینٹ مٹی اور پتھر کے ساتھ مضبوط و مستحکم بنانے کے ہیں، لہٰذا نبوت کے ظہور ہونے سے پہلے ہونے والے خوارق عادات گویا نبوت ورسالت کی عمارت کو مستحکم و مضبوط بنانے کا ابتدائی ذریعہ ہوتے ہیں۔

''کرامات'' دراصل کرامت کی جمع ہے، جو اکرام اور تکریم کا اسم ہے، اس لفظ کے لغوی معنی نفیس ہونا، عزت دار ہونا اور سخی ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاح شرع میں کرامت اس خارق عادت فعل یعنی کرشمہ کو کہتے ہیں، جو مؤمن نیکوکار کے ہاتھ پر ظاہر ہو، لیکن وہ نہ نبوت کے دعوے کے ساتھ ہو اور نہ اس کا مقصد کفار کا معارضہ ومقابلہ ہو، کیونکہ جو خارق عادت نبوت کے دعوے کے ساتھ ہو اور کفار کے معارضہ ومقابلہ پر ہو اس کو معجزہ کہا جاتا ہے، اہل سنت والجماعت کے حضرات کرامات کو حق جانتے اور حق مانتے ہیں لہٰذا وہ اس کے قائل ہیں جبکہ معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں۔

(کمافی المرقاۃ: ج۱۰ ص۲۸۳)

خارق عادت کی پانچ قسمیں ہیں۔

(۱) معجزہ (۲) کرامت (۳) معونت (۴) استدراج (۵) اہانت۔

(۱) **معجزہ :-** وہ خارق عادت امر ہے جو نبی اور رسول سے ظاہر ہو۔

(۲) **کرامت:-** وہ خارق عادت جو خلاف عادات اشیاء ہیں جس کو اللہ تعالیٰ کسی ولی کے ہاتھ پر اسکی تشریف وتکریم کے لئے ظاہر فرماتے ہیں۔

(۳) **معونت:-** وہ خارق عادت ہے جو عام مؤمن سے ظاہر ہو، جس کا ولی یا فاسق ہونا مستور ہو۔

(۴) **استدراج :-** وہ خارق عادت امور ہیں جو کفّار وفجّار سے صادر ہوتے ہیں، جس سے وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی سعی کرتے ہیں۔

(۵) **اہانت:-** وہ خارق عادت اشیاء ہیں جو کافر کے ہاتھ پر اپنے دعویٰ کے خلاف ظاہر ہوں۔

(شرح عقائد) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍صفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲؍صفر ۱۴۲۷ھ

بَابُ كَلِمَاتِ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ

کفر اور شرک کی تعریف

(۹) سوال:- کفر اور شرک کسے کہتے ہیں اور افعال شرکیہ کیا کیا ہیں؟ کچھ مثالیں پیش کریں تا کہ ہمیں شرک و کفر سے بچنے میں آسانی ہو۔

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے ان میں سے کسی ایک بات کو بھی نہ ماننا کفر ہے، مثلاً کوئی شخص خدا تعالیٰ کی ذات کو نہ مانے یا خدا تعالیٰ کی صفتوں میں سے کسی صفات کا انکار کرے یا فرشتوں کا انکار کرے یا خدا تعالیٰ کی آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب کا انکار کرے یا کسی پیغمبر کو نہ مانے یا تقدیر کا منکر ہو یا قیامت کے دن کو نہ مانے یا خدائے تعالیٰ کے قطعی احکام میں سے کسی حکم کا انکار کرے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کسی خبر صحیح کو جھوٹا سمجھے، یہ سب باتیں کفریات ہیں، انمیں سے کوئی بھی بات پائی جاوے تو اس سے آدمی کافر ہو جائے گا، اگر آدمی پہلے مسلمان تھا تو اِن مذکورہ باتوں میں سے کسی ایک بات کے انکار سے وہ آدمی مرتد ہو جائیگا، اس پر ارتداد کے احکام لاگو ہوں گے، کفر کے احکام آئیں گے۔

شرک فی الصفات کی اقسام

- اور شرک کہتے ہیں: کہ خدا تعالیٰ کی ذات یا صفات میں سے کسی ایک میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو شریک کرنا مثلاً اللہ تعالیٰ قادر ہے، مخلوق میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرح قادر ماننا۔
- اور مشرک کہتے ہیں: اس آدمی کو جس میں شرک کا گناہ پایا جاوے مثلاً کوئی آدمی اگر خدا تعالیٰ کی ذات یا صفات میں سے کسی ایک امر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھہراوے تو وہ مشرک ہے۔
- اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کرنے کا معنی یہ ہے کہ دو تین خدا ماننے لگے جیسے عیسائی ہیں وہ تین

خدا مانتے ہیں، (۱) اللہ کو (۲) عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں (۳) مریمؑ کو خدا کی بیوی مانتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ لوگ مشرک ہیں اور جیسے آتش پرست ہیں کہ وہ دو خدا مانتے ہیں ایک خدا تعالیٰ کو اور دوسرا آگ کو جس وجہ سے وہ بھی مشرک ہیں اور اسی طرح بت پرست ہیں کہ وہ لوگ بہت سے خدا مانتے ہیں جس وجہ سے وہ مشرک ہوئے ہیں۔

- **اللہ تعالیٰ کی صفات:** - میں شرک کرنے کا معنی یہ ہے کہ خدا کی صفات میں سے کسی صفت کو دوسرے کے لئے خدا کی طرح ثابت کرے یہ بھی شرک ہے۔

چونکہ کسی مخلوق کو خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی یا ولی یا شہید، یا پیر ہو یا امام ہو، کسی کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی طرح صفت حاصل نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات میں صفت علیم ہے، قدیر ہے، مخلوق میں سے کسی کو بھی آپکے برابر علم نہیں نہ آپ کی قدرت کے برابر کوئی مخلوق قدرت رکھتی ہے اور جس قدر علم یا قدرت مخلوق رکھتی ہے وہ تھوڑی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ سمندر کے مقابلہ میں قطرہ کے برابر بھی نہیں۔

- **شرک فی الصفات:** - کی ایک مثال یوں سمجھ لیجئے کہ فلاں ولی یا بزرگ وغیرہ آسمان سے جب چاہے بارش برسا سکتا ہے یا بیٹا بیٹی دے سکتا ہے یا مرادیں پوری کرسکتا ہے یا روزی دے سکتا ہے یا مارنا جلانا ان کے قبضے میں ہے یا کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتا ہے، یہ تمام باتیں شرک ہیں، ان سے آدمی بے ایمان اور کافر ہوجاتا ہے، اگر تجدید ایمان اور توبہ نہ کی تو آدمی جہنم میں جائیگا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا۔
- **شرک فی العلم:** - یعنی خدا تعالیٰ کی طرح فلاں ولی، بزرگ وغیرہ غیب کا علم رکھتے ہیں، یا خدا تعالیٰ کی طرح ذرہ ذرہ کا انھیں علم ہے، یا ہمارے تمام حالات سے وہ واقف ہیں، یا دور و نزدیک کی چیزوں کی خبر رکھتے ہیں، یہ سب شرک فی العلم کے عقیدے ہیں، جن سے آدمی کافر اور بے ایمان ہوجاتا ہے۔
- **شرک فی السماع:** - مثلاً یہ اعتقاد رکھنا کہ فلاں پیغمبر یا ولی ہماری تمام باتوں کو دور و نزدیک سے سن لیتے ہیں یا دیکھ لیتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی صفت سمع و بصر میں شرک کرنا ہے جس سے آدمی مشرک اور بے ایمان بن جاتا ہے۔
- **شرک فی العبادات:** - یعنی خدا تعالیٰ کی طرح کسی دوسری مخلوق کو عبادت کا مستحق سمجھنا مثلاً کسی قبر یا پیر کو عبادت کی نیت سے سجدہ کرنا یا کسی ولی کے لئے رکوع کرنا یا کسی پیر، بزرگ، ولی، امام کے نام

کا روزہ رکھنا یا ان میں سے کسی کی نذر اور منت ماننا یا کسی قبر یا مرشد کے گھر کا خانہ کعبہ کی طرح طواف کرنا، یہ سب شرک فی العبادات ہیں، اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو ہر طرح کے شرک وکفر اور بدعت سے بچنے کی توفیق بخشے آمین۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ

قرآن وحدیث کو گولی مارتا ہوں کلمات کفر میں سے ہیں

(۱۰) سوال:- جناب مفتی صاحب! میرا تیسرا بیٹا محمد یعقوب ڈگری پڑھتا ہے سہ ماہی امتحان کی تعطیل میں گھر آیا حضور! اس کی طبیعت میں غصہ زیادہ ہے، بات یہ ہے کہ اس کی ماں نے بازار جانے کو کہا اس نے ساتھ ساتھ انکار کردیا، تو اس کی ماں نے کہا کہ بیٹا بیٹھ بیٹھ کر کھاتے ہو اور میرا بیٹا عبد المنان اور عبد الرحیم کام کرتے کرتے جان ختم کرچکے ہیں تجھے شرم نہیں آتی؟ جاؤ! بازار جاکر کچھ لاؤ، لیکن اس نے انکار کردیا تو اس کی ماں نے کہا انتظار کرو تیرے باپ باہر سے آرہے ہے، یہ سنکر اس نے کہا باپ نہیں، اگر اللہ تعالیٰ آکر کہے گا تو بھی بازار نہیں جاؤنگا، نہ بازار لاؤنگا، پھر ماں نے کہا بیٹا تبلیغ کرتے ہو، قرآن وحدیث سنتے ہو، کیا مربیوں نے والدین سے ایسا سلوک کرنے کو کہا؟ اور قرآن وحدیث میں والدین سے ایسا برتاؤ کرنے کیلئے کہا ہے اچانک لڑکے نے کہا کہ میں قرآن وحدیث کو گولی مارتا ہوں اس پر میں جو اس کھو بیٹھی کہ اس نے یہ کیا کہدیا، آج تین روز ہوئے ہیں فی الحال لڑکے نے نماز وغیرہ چھوڑ رکھا ہے، میں نے اس بارے میں مسجد کے امام صاحب سے بات کی جبکہ امام صاحب بھی تبلیغی ہیں اور ان کے ساتھ اس کی دوستی بھی ہے، امام صاحب نے "إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون" پڑھکر کہا کہ یہ کلمات تو کفر کے ہیں، وہ مرتد ہوگیا، اس کے لئے تجدید ایمان ضروری ہے، اب سوال یہ ہے کہ امام صاحب کی بات درست ہے یا نہیں؟ اگر درست ہے تو مندرجہ ذیل مسائل کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) تجدید ایمان کس طرح کریگا؟

(۲) تین دنوں کی نمازیں جو اُس سے چھٹی ہوئی ہیں ان کی قضا ضروری ہے یا نہیں؟ اس نے اپنے باپ کے پیسے سے فرض حج کیا ہے، اب اسے دوبارہ حج کرنا پڑیگا یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱) :- واضح رہے کہ توہین قرآن موجب کفر ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

إذا أنكر اٰيةً من القرآن أو سخر باٰية من القرآن وفى الخزانة أوعاب فقد كفر.

(كتاب احكام المرتدين فيما يتعلق بالقرآن : ۴۹۰/۵)

ایسے ہی اگر کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے آکر ایسے کرنے کو کہے، تو بھی میں نہیں کرونگا، یہ الفاظ بھی کلمات کفر میں سے ہیں۔

قال فى الهندية . إذا قال لَوْ أَمَرَنِیْ اللّٰهُ بكذا لم أفعل فقد كفر كذافى الكافى.

(الباب التاسع فى احكام المرتدين ۳۵۸/۲)

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا بیٹا بے ایمان ہوگیا، وہ اسلام سے نکل گیا ہے اور اس کی زندگی کی تمام بندگی برباد ہوگئی، اب اس کے لئے تجدید ایمان ضروری ہے۔

تجدید ایمان کی صورت یہ ہوگی کہ وہ پھر کلمۂ شہادتین پڑھے اور دین کے تمام ضروری عقائد کو مان لے اور جو کچھ کہا ہے اس سے توبہ کرلیوے اس پر نادم اور شرمندہ ہوجاوے۔

جواب (۲) :- فوت شدہ نمازوں کی قضا ضروری نہیں ہے جبکہ اس وقت وہ شریعت کے اعتبار سے بے ایمان تھا یعنی وہ شریعت کا مکلّف نہیں تھا، تاہم توبہ کے طور پر اتنی یا زیادہ نمازیں تجدید ایمان کے بعد پڑھے گا تو بہت اجر ملے گا۔

جواب (۳) :- اگر حج فرض ہونے کی مقدار اُسے مال حاصل ہوگا تو پھر حج فرض ہوگا۔

كما فى " الخلاصة الفتاوى " ومنها أن من ارتدثم أسلم وقد حج مرةً فعليه أن يحج ثانيًا وليس عليه إعادة الصلوات والزكوات والصيامات لأن بالردة صار كأنه لم يزل كان كافرًا فأسلم هو غنى فعليه الحج فليس عليه قضاء سائر العبادات الكل فى سير الأجناس. (الفصل الثانى فى ألفاظ الكفر مايكون كفرًا ومالايكون كفرًا . ج۳ ص ۳۸۳) وكذافى درالمختار مع الشامية، مطلب

لوتاب المرتد هل تعود حسناته ، کتاب جهاد باب المرتد :

(ج ۵ ص ۲۵۲)

فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ : محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معین مفتی دار الافتاء
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

"عزرائیل علیہ السلام میرے بیٹے کا دشمن ہے" کہنا موجب کفر ہے

(۱۱) سوال :- (۱) ایک عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اس کا صرف ایک لڑکا ہے وہ راجشاہی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا، تعطیل میں گھر آتا تھا اس مرتبہ گھر آتے وقت بس کے حادثہ میں اس کا بھی انتقال ہوگیا، تو اس کی ماں چلّا چلّا کر کہتی ہے کہ اللہ کی نظر میں صرف میرا بیٹا پڑا ہے اور کسی کو نہیں دیکھا اور عزرائیل میرے بیٹے کا دشمن ہے، وہ کیسے بے رحم فرشتہ ہے کہ میرے بیٹے کی جان قبض کر لی ہے ایسا کہنا کیسا ہے اور شرعاً اس عورت کا حکم کیا ہے؟

(۲) مرتدہ عورت کے لئے تجدید ایمان کے ساتھ تجدید نکاح ضروری ہے یا نہیں؟ اور تجدید نکاح کی صورت میں خاوند اگر نیا مہر دینے پر راضی نہ ہو تو تجدید نکاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

الجواب وهو الموفّق للصّواب

جواب (۱) :- صورت مسئولہ میں مذکورہ کلمات کے کہنے سے عورت بے ایمان ہوگئی، اب اس کے لئے تجدید ایمان ضروری ہے۔

قال فی "خلاصة الفتاویٰ" لوقال لقائک کلقاء ملک الموت قال الحاکم عبدالرحمٰن: إن کان قال لکراهة الموت لایکفر لوقال لعداوة ملک الموت یکفر. (الفصل الثانی فی ألفاظ الکفر مایکون أومالایکون. الجنس الثالث.

(ج ۴ ص ۳۸۶)

جواب (۲) :- تجدید ایمان کے ساتھ ساتھ تجدید نکاح بھی ضروری ہے اور اگر عورت راضی ہو تو معمولی مہر کے ساتھ بھی نکاح درست ہے یا مہر رکھ کر عورت کی طرف سے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

قال فی "الشامیة" (قوله وعلی تجدید النکاح) فلکل قاضٍ أن یجدده بمهر یسیر ولو بدینارٍ رضیت أم لا . (کتاب النکاح، باب نکاح الکافر: ج۳ص ۱۹۴) .

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۶؍صفرالمظفر ۱۴۲۶ھ	۶؍صفرالمظفر ۱۴۲۶ھ

’’حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اگر گندم نہ کھاتے تو ہم شقی نہ ہوتے‘‘ کہنا موجب کفر ہے

(۱۲)سوال:- ایک آدمی نے کہا کہ حضرت آدم علیہ السّلام اگر گندم نہ کھاتے تو ہمیں دنیا میں آنا نہیں ہوتا بلکہ ہم جنت میں رہتے اور دنیا کی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھانا نہیں پڑتیں، بدبختی اور نیک بختی کا مسئلہ بھی پیش نہیں آتا، اسطرح کے کلمات کہنا کیسا ہے کتنا گناہ ہے، دوبارہ ایمان لانا ضروری ہے یانہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ کسی کا اگر ایسا عقیدہ ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے گندم کھانے کی وجہ سے انسان کو دنیا میں آنا پڑا اوران میں سے بعض شقی اور بعض سعید ہوئے یعنی باپ کے گناہ کی وجہ سے بیٹے شقی ہوئے، تو یہ کفریہ عقیدہ ہے، ایسا کہنے والا آدمی بے ایمان ہوجاتا ہے۔

کمافی " الخلاصة " لوقال الرجل لولم یأکل ادم الحنطة ماصرنا أشقیاء یکفر (کتاب الفاظ الکفر، الفصل الثانی فی الفاظ الکفر مایکون کفرًا ومالایکون: (۳۸۵/۴)

لہٰذا صورت مسئولہ میں وہ آدمی بے ایمان ہوگیا، اب اُسے تجدید ایمان اور تجدید نکاح کرنا ہوگی، نیز خالص دل سے توبہ واستغفار بھی کرے۔

فقط و اللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

حضرات شیخینؓ کو سبّ و شتم کرنے والا کافر ہے

(۱۳) سوال:- حضرات شیخینؓ کو سبّ و شتم کرنے والا اور حضرت علیؓ کو ان دونوں پر فضیلت دینے والے آدمی کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ اس امت میں سب سے بہترین آدمی حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

(١) عن عبد خير الهمدانی قال: سمعت علی بن أبی طالب يقول علی هذا المنبر: ألا أخبركم بخير هذه الأمة بعدنبیّه صلی الله عليه وسلم، قال فذكر أبابكر (رضی الله عنه) قال: ثم قال: ألا أخبركم بالثانی، قال فذكر عمر بن الخطاب الخ (أخرج أحمد وابنه فی زوائده ج ١ ص ١١٢)

ترجمہ: یعنی عبد خیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے منبر پر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: کہ اس امت کے بہترین لوگ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد کون ہیں؟ میں تمہیں نہ بتاؤں! پھر فرمایا ابوبکرؓ سب سے بہتر اور افضل ہیں، پھر فرمایا عمرؓ ابوبکرؓ کے بعد بہترین شخص ہیں۔

(۲) ابن عساکرؒ نے حدیث نقل کی ہے:

أن رسول الله صلی الله عليه وسلم قال: حبُّ أبی بكر وعمر إيمان وبغضهما كفر.

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوبکر وعمر سے محبت رکھنا ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض وعناد رکھنا کفر ہے۔

(۳) عبداللہ ابن احمد رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بطریق مرفوع نقل کیا ہے:

أى لأرجو لأمتى فى حبّهم لأبى بكر و عمر ما أرجولهم فى قول. "لاإله إلا اللّٰه".

ترجمہ: بلاشبہ میں اپنی امت کیلئے ان کی اس محبت کے عوض کہ جو وہ ابوبکر وعمر کے ساتھ رکھیں اس چیز کی امید رکھتا ہوں جو ان کلمۂ "لاإله إلا اللّٰه" کہنے پر رکھتا ہوں۔

لہٰذا حضرات شیخینؓ کو سبّ وشتم کرنے والا کافر ہے، البتہ جو شخص سبّ وشتم نہیں کرتا، بلکہ حضرت علیؓ کو شیخین پر فضیلت دیتا ہے، وہ کافر تو نہیں مگر مبتدع اور گمراہ ہے اور اہل سنت والجماعت سے خارج ہے۔

قال فى "الخلاصة" الرافضى إن كان يسبّ الشيخين ويلعنهما فهو كافر وإن كان يفضل عليّا على أبى بكر وعمرؓ لايكون كافرا لكنه مبتدع.

(کتاب الفاظ الکفر ج ۴ ص ۳۸۱)

فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

یارسول اللہ یاغوث الاعظم کا نعرہ لگانا

(۱۴) سوال: نعرۂ رسالت یارسول اللہ، نعرہ غوثیہ یاغوث الاعظم دست گیر کا نعرہ لگانا کیسا ہے؟

الجواب وھوالموفّق للصّواب

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کیلئے چاہے نبی ہو یا ولی حاضر وناظر ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے اور کسی مخلوق کو اسی طرح حاجت روا ہونے کا عقیدہ رکھنا بھی کفر ہے، یہ استعانت بالغیر ہے، لہٰذا اس قسم کا نعرہ لگانا ناجائز ہے۔

(۱) فتاویٰ بزازیہ میں ہے: **من قال أرواح المشائخ حاضرة يكفر.**
(یعنی جو کوئی کہے کہ بزرگوں کی روحیں ہر جگہ حاضر وناظر ہیں وہ کافر ہے)

(۲) **قال فى "النهر الفائق وشرح درر البحر". منها ظن أن الميت يتصرف فى الأمر**

واعتقاد ها كفر . وكذافى الشامية.

(۳) قاضی شہاب الدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

يقومون عند ذكر مولده صلى الله عليه وسلم ويزعمون ان روحه ﷺ يجئ وحاضر فزعمهم باطل بل هذا الاعتقاد شرك وقد منع الأئمة الأربعة عن مثل هذا (الجنة لاهل السنة)

لہٰذا صورت مسئولہ کے الفاظ اس اعتقاد سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی طرح یہ حضرات بھی ہر جگہ حاضر وناضر ہیں یا ہماری پکار اور فریاد کو سنتے ہیں اور حاجت روا ہیں جائز نہیں ہے، بلکہ کفر ہے، اس سے توبہ کرنا لازم ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ	یکم ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ

* * *

قل إنما أنا بشر مثلكم يوحى الىّ أنما إلٰهكم إله واحد. (القرآن)
قال: خلقت أنا وأبوبكر وعمر من طين واحدةٍ. (الحديث)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں نور یا بشر ہونے کی شرعی تحقیق

- قرآن کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔
- قرآن میں صیغۂ امر کے ساتھ آپ کو بشر ہونے کے اعلان کا حکم۔
- تمام انبیاءؑ ورسلؑ اولادِ آدم ہیں اور آدم زاد تھے کوئی فرشتہ نہ تھے۔
- آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔
- حدیث کی روشنی میں آپ صلی اللہ وسلم بشر ہیں۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع ہے۔
- تفسیر کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت پر حنفی مشائخ کے اقوال۔
- " " " مالکی " "
- " " " شافعی " "
- " " " حنبلی " "
- اجماع کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔
- قیاس کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا منکر کافر ہے۔

(۱۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے یہاں ایک سرکاری نصاب کے مطابق درجۂ کامل تک کا مدرسہ ہے اس کے ہیڈ محدث صاحب سرسینہ کے فارغ ہیں ذی استعداد بھی ہیں بخاری شریف پڑھاتے ہیں اور شہر کی مرکزی جامع مسجد کے خطیب ہیں، انہوں نے گزشتہ جمعہ کی تقریر میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں بشر نہیں یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کا اصل مادہ مٹی کا نہیں، جو کوئی آپ کو بشر کہے وہ کافر ہے، حاضرین مجلس سے بار بار خطاب کر کے کہتے رہے کہ میں بحث کرنے کو تیار ہوں، اتفاق سے ہمارے جامعہ کے نائب صاحب (جو فاضل دار العلوم دیوبند ہیں اور اہل علم بھی ہیں) اسی مجلسِ وعظ میں جمعہ کے روز حاضر تھے، خطیب صاحب انکو جانتے ہیں شاید ان کو دیکھ کر بار بار بحث کا اعلان کیا، بعد نماز جمعہ دیگر لوگوں نے نائب صاحب سے کہا کہ آپ لوگ اب کیوں خاموش بیٹھے رہے، دوسری محفل میں تو اس موضوع پر زوردار تقریر کرتے رہتے ہو، اب کیا ہوا پھر نائب صاحب نے کہا: ڈرنے کی بات تو نہیں لیکن فساد کرنا نہیں چاہتا ہوں پھر کچھ نمازیوں سے کہا اچھا پھر ٹھیک ہے، بحث کی تاریخ تعیین کرو، آیندہ ۱۰ (دس) مارچ ۲۰۰۳ھ صبح دس بجے جامع مسجد کے میدان میں بحث کی تاریخ طے ہوئی۔

نائب صاحب نے مدرسہ میں آکر اس سلسلہ میں مدیر جامعہ اور دیگر اساتذۂ کرام سے مشورہ کیا، پھر حاضرین مجلس نے بندہ راقم الحروف کو بلایا اور اسی موضوع پر قرآن، حدیث، اجماع، قیاس کی روشنی میں ایک مضمون دلائل کے ساتھ لکھنے کو کہا، تو میں نے عرض کیا کہ اس کے لئے تو کافی کتابوں کی ضرورت ہے، ہمارے یہاں تو اتنی کتابیں نہیں ہیں، یہ کیسے ہوگا، اور بدون دلائل ان سے بحث و مباحثہ کرنا رسوائی اور بدنامی کا سبب ہوگا، حاضرین مجلس میں سے جناب مفتی عبید الرحمٰن صاحب نے کہا: بات درست ہے، ایک کام کرو، کسی "دارالافتاء" میں خط لکھدو اور ان سے درخواست کیجاوے کہ اس بارے میں قرآن وسنت اور اجماع امت کی روشنی میں مسئلہ کو لکھدیں۔ اگر انہوں نے مدلل مضمون لکھدیا ہے تو اسکی روشنی میں بحث ہو سکے گی۔

لہٰذا میرے ذہن میں آپ لوگوں کے دارالافتاء کا خیال آیا جناب عالی اور دوسرے رفقاء سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی محققانہ نظر تحریر فرمائیں تا کہ مضمون حجت بالغہ وقاطعہ ثابت ہو۔

مستفتی: احقر مفتی عبد الرشید۔

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ. اما بعد!

واضح رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی انسان کے ساتھ تشبیہ دیکر حقیر بنانے کی کوشش کرنا جس طرح کفر ہے، ویسا ہی آپ کو اپنی شان رسالت اور عبدیت سے اعلیٰ وبالا بنا کر آپ ﷺ کی بشریت کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔

اس لئے اہل سنت والجماعت اور انکے متبعین کا عقیدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام خلائق سے اعلیٰ وافضل ترین انسان وبشر ہیں، آپ ﷺ خلقت کے اعتبار سے بشر ہیں، جیسے دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بشر تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں کے سردار ہیں، آپ ﷺ کا مقام تمام انبیاء اور رسولوں سے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعد ہی آپ ﷺ کا مقام ہے، اس کے باوجود آپ بشر ہیں، بشر کے بیٹے ہیں، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین اور بہشت کی مٹی ملاکر پیدا فرمایا تھا اور یہی تخلیقی عنصر تمام نبی ورسول میں موجود ہے اور سید الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی موجود ہے، فلہٰذا آپ کی بشریت کا انکار کفر ہے، دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن کی روشنی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کے متعلق قرآن مجید میں کئی اور مختلف اندازوں میں آیات نازل ہوئی ہیں۔ چنانچہ:

(۱) صیغۂ امر کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ آپ لوگوں کو کہدیں کہ آپ بشر ہیں، یعنی نسل انسانی میں سے ہیں فرشتے یا جنات کی نسل میں سے نہیں ہیں۔

(۲) غرض آپ انسان اور بشر میں سے ہیں جو انسان اور بشر کے گھرانے میں پیدا کئے گئے ہیں، فرق یہ کہ آپ کو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز کیا گیا، آپ پر وحی آتی ہے جبکہ دوسرے انسان ایسے نہیں ہیں، یہی وجہ تھی کہ جب آپ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو کفار نے تعجب کیا اور انکار کرنے لگے کہ بشر کیسے نبی ہوگا۔ محمد ﷺ تو قریش خاندان میں پیدا ہوئے، ہمارے سامنے پیدا ہوئے تو ایک انسان کیسے نبی ہوگا، وہ تو فرشتہ ہونا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

(۳) تمام انبیاء اور مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں اور سب کے

سب نبی ورسول ہونے کے ساتھ ساتھ بشر بن البشر تھے، انہیں کفار مکہ کے تعجب اور اعتراض کے باوجود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے اندر صیغۂ امر کے ساتھ آپ ﷺ کو بشر ہونے کے اعلان کا حکم کیا۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

(١) قل إنماأنا بشر مثلكم يوحى إلىّ أنما إلٰهكم إلٰهٌ واحد.
(سورۃ کہف ص١١٠)

ترجمہ: اور آپ (یوں بھی) کہہ دیجئے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں میرے پاس یہ وحی آئی کہ میرا اور تمہارا معبود (برحق) ایک ہی معبود ہے۔ (بیان القرآن)

یعنی میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں خدا نہیں جس کو خود بخود ذاتی طور پر تمام علوم وکمالات حاصل ہوں، ہاں اللہ تعالیٰ جسقدر علوم حقہ اور معارف قدسیہ میری طرف وحی نازل کرتا ہے جن میں اصل الاصول علم توحید ہے، میں صرف انہیں علوم ومعارف کو جانتا ہوں۔

(٢) قل سبحان ربی هل كنت إلابشرًا رسولًا (بنی اسرائیل ٩٣)

ترجمہ: آپ لوگوں کو فرما دیجئے کہ سبحان اللہ میں بجز اس کے کہ آدمی ہوں اور اللہ کے رسول ہوں اور کچھ نہیں ہوں۔ (بیان القرآن)

یعنی میں ایک بشر ہوں مگر رسول ہوں، جیسے پہلے بھی رسول آئے اور وہ آدمی تھے، میں بھی نبی اور رسول ہوں اور ساتھ ساتھ بشر ہوں۔

(٣) قل إنما أنا بشرمثلكم يوحى إلي إنما إلٰهكم إله واحد . (حٰم سجدة: ص ٦)

ترجمہ: آپ ان سے فرما دیجئے کہ میں بھی تم جیسا بشر ہوں مگر فرق یہ ہے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ (بیان القرآن)

یعنی نہ میں خدا ہوں کہ زبردستی تمہارے دلوں کو پھیر سکوں، نہ فرشتہ ہوں جس کے بھیجے جانے کی تم فرمائش کیا کرتے ہو نہ کوئی اور مخلوق ہوں بلکہ تمہاری جنس میں ایک آدمی ہوں جس کی بات کا سمجھنا تم کو ہم جنس ہونے کی بنا پر آسان ہونا چاہئے اور میں ایسا آدمی ہوں جسے حق تعالیٰ نے اپنی آخری اور کامل ترین وحی کیلئے چن لیا ہے۔

(٤) قالت لهم رسلهم إن نحن إلابشر مثلكم ولكن اللّٰه يمن علىٰ من يشاء من عباده . (ابراهيم: ١١)

ترجمہ: ان کے رسولوں نے اس کے جواب میں کہا کہ ہم بھی تمہارے جیسے آدمی ہی ہیں لیکن

اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان فرمادے یعنی نبوت ورسالت سے سرفراز فرمائے۔ (بیان القرآن)

یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام تمام بشر تھے مگر کامل بشر یعنی تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ ہم نہ فرشتے ہیں نہ کوئی اور مخلوق، بلکہ نفس بشریت میں تم جیسے ہیں، لیکن نوع بشر کے افراد میں احوال ومدارج کے اعتبار سے کسقدر تفاوت ہے آسمان وزمین کے درمیان جو فرق ہے اس سے بھی زیادہ ہے اتنا تو تم بھی مشاہدہ کرتے ہو کہ حق تعالیٰ نے جسمانی، نظریاتی، اخلاقی اور معاشی ومعاشرتی لحاظ سے بعض انسانوں کو بعض پر کس قدر فضیلت دی ہے، تم لوگ جانتے ہو، اسی طرح نبیوں کو دوسرے انسانوں پر جو فضیلت دی ہے، اس میں بھی غور وفکر کروگے تو تم لوگ کچھ اندازہ کرسکوگے۔ تم لوگ کیوں غور وفکر نہیں کرتے ہو۔

(۵) لاهية قلوبهم وأسروا النجوى الذين ظلموا هل هذا إلا بشر مثلكم أفتأتون السحر وأنتم تبصرون. (أنبیاء: ۳)

ترجمہ: (اور) ان کے دل متوجہ نہیں ہوئے اور یہ لوگ یعنی ظالم (اور کافر) لوگ آپس میں چپکے چپکے سرگوشی کرتے ہیں کہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) محض تم جیسے ایک (معمولی) آدمی ہیں تم پھر بھی جادو (کی بات سننے کو ان) کے پاس جاؤگے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ جادوگر ہے جادو کی بات کرتا ہے۔ (بیان القرآن)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کفار کا یہ مشورہ ہے کہ جب یہ لوگ نصیحت سنتے سنتے تنگ آگئے تو چند بے انصافوں نے خفیہ میٹنگ کرکے قرآن اور پیغمبر کے متعلق کہنا شروع کیا کہ یہ پیغمبر تو ہمارے جیسے ایک آدمی ہیں ہمارے اور اس کے درمیان کچھ فرق نہیں، نہ تو یہ فرشتہ ہے، نہ ہم سے زیادہ کوئی ظاہری امتیاز رکھتا ہے، البتہ ان کو جادو آتا ہے، جو کلام پڑھ کر سناتا ہے، وہ جادو کا کلام ہے، پھر تمہیں کس مصیبت نے گھیرا کہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ان کے جادو میں پھنستے ہو، ان کی مجلسوں میں جاتے ہو اور متاثر ہوتے ہو۔

غرض کفار بھی جانتے تھے آپ بشر تھے مگر وہ تعجب کرتے تھے کہ بشر نبی ورسول کیسے ہوسکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما أرسلنا قبلک إلا رجالا نوحي إليهم (انبیاء: ۷)

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے قبل صرف آدمیوں ہی کو پیغمبر بنایا جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے۔ (بیان القرآن)

تشریح: یہ کہ پچھلے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام اور رسول بھی بشر اور مردوں میں سے تھے، ہم ان کی طرف وحی بھیجا کرتے تھے، یہ ان کے قول " ھل ھذا إلا بشر مثلکم " کا جواب ہوا، یعنی پہلے بھی جو پیغمبر اور رسول آئے وہ فرشتے یا جنات میں سے نہ تھے جسطرح پہلے انبیاء علیہم السلام کا کفار نے انکار کیا تھا اور ان پیغمبروں سے نشانیاں طلب کی تھیں کہ تم رسول ہونے کا ثبوت پیش کرو، ان کی امتوں کی طرح نشانیاں دکھلانے کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تم لوگ مطالبہ کرتے ہو، اگر اتنی مشہور بات کی بھی اپنی جہالت کی وجہ سے تم کو خبر نہیں، تو خبر رکھنے والوں سے دریافت کرلو، آخر یہود ونصاریٰ اہل کتاب سے تمہارے تعلقات ہیں، اتنی موٹی بات ان سے ہی پوچھ لینا تھا کہ پہلے زمانوں میں جو انبیاء ورسلؑ تشریف لائے تھے وہ بشر تھے یا آسمان کے فرشتے؟ پھر وہ لوگ ضرور تمہیں بتائیں گے کہ نبی ورسول سب کے سب بشر اور انسان ہی میں سے آئے تھے۔

کفار کو یہ بھی اعتراض تھا کہ بشر نبی ہو تو ان پر موت طاری نہیں ہونی چاہئے تھی بلکہ ان کو زندہ رہنا چاہیے، پھر اللہ تعالیٰ انکے اس شبہ کے جواب میں فرماتے ہیں:

(۱) وماجعلنا لبشر من قبلک الخلد أفائِن الخٰلدون مِتَّ فهم الخالدون .

(انبیاء ص: ۳۴)

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر جو نبی ورسول بھی تھے ان کے لئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا جیسے اور رسولوں پر موت طاری ہوتی ہے آپ پر بھی موت طاری ہوگی جیسے دوسرے سب انبیاء پر موت طاری ہوئی تھی اے نبی! ان سے ذرا سوال کریں کہ آپ اگر مرجائیں گے تو کیا ہوا؟ موت کے بعد آپ میرے پاس آئیں گے، کیا یہ لوگ زندہ رہیں گے؟ میرے پاس نہیں آئیں گے؟

(۲) إذقالوا ماأنزل اللّٰه علی بشر من شئ قل من أنزل الکتاب الذی جاء به موسیٰ (انعام: ۹۱)

ترجمہ: جبکہ کافروں نے یوں کہدیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز بھی نازل نہیں کی تو آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے۔ (بیان القرآن)

کیا موسیٰ عمران کا بیٹا نہیں تھا جس کو ہم نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ غرض یہ کہ موسیٰ ابن عمران بشر تھے ان پر ہم نے تورات کتاب نازل کی اسی طرح محمد بن عبداللہ بھی بشر ہیں، ان پر ہم نے قرآن اُتارا۔ اس میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟ کیوں شک ہے؟

(٣) وما منع الناس أن يؤمنوا إذ جاء هم الهدى إلا أن قالوا أبعث الله بشرًا رسولًا. (بنی اسرائیل: ٩٤)

ترجمہ: اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی قابل التفات بات نہیں ہوئی کہ انہوں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ (بیان القرآن)

یعنی نور ہدایت پہنچنے کے بعد ان کی آنکھیں نہ کھلیں یہی کہتے رہے کہ انسان اور آدمی ہو کر رسول کیسے ہو سکتے ہیں اگر خدا کو پیغمبر بھیجنا تھا تو آسمان سے کوئی فرشتہ اُتارتے، غرض یہ کہ رسول کے بشر ہونے کو کافروں نے قابل اعتراض سمجھا ہے جبکہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے نزدیک اور فرشتوں کے نزدیک اور تمام صحابۂ کرام کے نزدیک قابل اعتراض بات بالکل نہیں، بلکہ یہ اعتراض کافروں کی کم فہمی اور کج فہمی کے سوا کچھ نہ تھا۔

رسولوں کا انسانوں میں سے بھیجنا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا بڑا احسان ہے۔

(١) لقد جاء كم رسول من أنفسكم عزيز عليه ماعنتم حريص بالمؤمنين عليكم رء وف رحيم. (سورۂ توبہ: ١٢٨)

ترجمہ: (اے لوگوں) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں (یہ حالت رسول کی تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ بڑا ہی شفیق اور مہربان ہیں تمہارے ہم جنس انسان میں سے رسول بھیجنا اللہ کی بڑی رحمت کی بات ہے اعتراض کی بات ہرگز نہیں۔ (بیان القرآن)

(٢) لقد مَنَّ الله على المؤمنين إذ بعث فيهم رسولاً من أنفسهم. (عمران: ١٦٤)

ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جبکہ ان ہی کی جنس سے ایک پیغمبر بھیجا۔

یعنی انہی کی جنس اور قوم میں سے ایک آدمی رسول بنا کر بھیجا جس کے پاس بیٹھنا، بات چیت کرنا،

زبان سمجھنا اور ہر قسم کے انوار و برکات کا استفادہ کرنا آسان ہوگیا ہے اپنی ہی قوم اور کنبے کے آدمی سے جب معجزات ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو یقین لانے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، فرض کرو کوئی جن یا فرشتہ رسول بنا کر بھیجا جاتا تو معجزات دیکھ کر یہ خیال کر لینا ممکن تھا کہ چونکہ جنس بشر سے جداگانہ مخلوق ہے شاید یہ خوارق اس کی خاص صورت نوعیہ اور طبیعت ملکیہ وجنّیہ کا نتیجہ ہوں ہمارا اس سے عاجز رہ جانا دلیل نبوت نہیں بن سکتا۔

(۳) یابنی آدم اِمّا یاتینکم رسل منکم یقصون علیکم ایاتی، فمن أتقی وأصلح فلاخوف علیهم ولاهم یحزنون. (اعراف:۳۵)

ترجمہ: اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس پیغمبر آویں جو تم ہی میں سے ہونگے جو میرے احکام تم سے بیان کرینگے سو جو شخص پرہیز رکھے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (بیان القرآن)

قرآنی آیات کو اپنی زبان کے نبی سے سننے اور پڑھنے کے بعد جو اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کریگا اور اپنے برے احوال کو درست کریگا ان پر آخرت میں نہ کچھ خوف کا خطرہ ہے نہ غم کا اندیشہ ہے۔

(۴) کماآرسلنا فیکم رسولامنکم یتلوا علیکم أیاتنا. (بقرہ: ۱۵۱)

ترجمہ: جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول بھیجا تم ہی میں سے جو ہماری آیات (واحکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں۔ (بیان القرآن)

نوٹ:- مذکورہ بالا آیتوں میں "مِنکُمْ" اور "مِنهُمْ" کی ضمیر کا مرجع اولاد آدم ہے، یعنی تمام انبیاء اور رسل علیہ السلام حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں سے مبعوث ہوئے ہیں اور یہ بات ہر فرد و شخص پر روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ باپ بیٹے کی جنس و مادہ ایک ہوتا ہے، تو حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کا مادہ جب مٹی کا تھا تو تمام اولاد آدم انکی اولاد خاص پیغمبروں کا جسمانی مادہ بھی اصل کے اعتبار سے مٹی کا ہونا ضروری ہے، تاکہ جسمانی اعتبار سے اصل اور فرع باپ اور بیٹے کے درمیان اتحاد باقی رہے، البتہ روحانی اعتبار سے انبیاء اور رسولوں کی ارواح کی مرتبت عام بنی آدم کی روحانی حیثیت سے بہت اونچی اور اعلیٰ ہے، ساتھ ساتھ ان پر وحی آتی ہے جب کہ عام بنی آدم پر وحی نہیں آتی، لہٰذا انبیاء اور رسل جسمانی اعتبار سے اگرچہ من جنس الارض ہیں، لیکن روحانیت میں وحی کے نازل ہونے میں عام بنی آدم سے کہیں ارفع واعلیٰ مرتبت کے مالک ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔

چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) إذقال ربک للملائکة إني خالق بشرًا من طين . (سورة ص: ۷۱)

ترجمہ: جبکہ آپ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں مٹی کے گارے سے ایک انسان کو یعنی اس کے پُتلے کو بنانے والا ہوں۔ (بیان القرآن)

(۲) لقد خلقنا الإنسان من صلصال من حماء مسنون والجان خلقناه من قبل من نار السموم. إذقال ربک للملائکة إني خالق بشرًا من صلصال من حماء مسنون. (حجر: ۲۹)

ترجمہ: جبکہ ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی ہوئی تھی پیدا کیا، اور جن کو اس کے قبل آگ سے کہ وہ ایک گرم ہوا تھی پیدا کر چکے تھے اور وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے جب آپ کے رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی پیدا کرنے والا ہوں۔ (بیان القرآن)

(۴) ولقد خلقنا الإنسان من سلالة من طين (مؤمنون: ۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا۔ (بیان القرآن)

یعنی تمام انسان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو منتخب مٹی سے پیدا کیا گیا ہے جبکہ آدم کی اولاد اور سب بنی آدم نطفہ سے پیدا ہوتے ہیں اور نطفہ بھی مٹی سے نکلی ہوئی غذاؤں کا خلاصہ ہے۔

(۵) قل لو كان في الأرض ملائكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السماء ملكًا رسولاً (بنی اسرائیل: ۹۵)

ترجمہ: اے نبی آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے (رہتے) ہوتے کہ وہ فرشتے اس میں چلتے بستے تو البتہ ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے۔ (بیان القرآن)

یعنی زمین میں عبادت کے واسطے ہم نے جب جن اور انسان کو بسایا ہے اب ان کی ہدایت کے واسطے انسان ہی میں سے نبی و رسول بھیجے ہیں۔

ان مذکورہ آیتوں میں انسان کے مادۂ خلقت "مِنْ طِينٍ" یعنی مٹی سے ہونا بیان کیا گیا ہے، البتہ جن کا مادۂ خلقت نار کو اور فرشتوں کا مادۂ خلقت نور کو کہا گیا ہے نیز یہ بھی نصوص صحیحہ سے ثابت ہے کہ کوئی

نبی ورسول نہ جنات میں سے تھے اور نہ فرشتوں میں سے تھے۔

پس قرآن کی روشنی میں ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشمول تمام انبیاء ورسل علیہم الصلوۃ والسلام بشر ہیں، سب کے جسموں میں مٹی کا عنصر شامل ہے، اس میں نہ تاویل کی گنجائش ہے، نہ انکار کی۔

حدیث کی روشنی میں انبیاء ورسولوںؑ کی بشریت اور نبوت کا اجتماع ہونا ملاحظہ کیا جائے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بشریت کا اقرار کیا، چنانچہ:

(۱) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إنما أنا بشر. الخ

(بخاری شریف کتاب اللقطة، باب اثم من خاصم فی باطل وھو یعلمہ ج ۱ ص ۳۳۲) وکذا فی مسلم کتاب الأقضیة، باب بیان حکم الحاکم لایغیر الباطن. (ج ۲ ص ۷۴) کذافی أبی داود، کتاب القضاء باب فی قضاء إذاأخطأ: ج ۲ ص ۵۰۴)

ترجمہ: بے شک میں تو تمہاری طرح کا بشر ہوں۔ (جن یا فرشتہ نہیں ہوں)

(۲) یقول: اللّٰھم إنما محمّد بشر یغضب کمایغضب البشر. الخ

(مسلم شریف ، کتاب البر والصلة ، باب من لعنه النبی ﷺ أوسبه أودعاعلیه الخ. (ج ۲ ص ۳۲۴)

ترجمہ: اے میرے پروردگار! میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بشر ہوں مجھے بھی غصّہ آجاتا ہے جیسے دوسرے انسان کو آتا ہے۔

(۳) ألا یاأیھاالناس إنما أنا بشر یوشک أن یأتینی رسول ربی عزوجل فأجیب الخ (مشکوۃ باب مناقب اھل البیت النبی ﷺ. ۵٦۸/۳)

ترجمہ: خبردار اے لوگو! پختہ بات ہے کہ میں تو بشر ہوں قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا قاصد ملک الموت آجائے اور میں اس کے حکم کی تعمیل کروں۔

مطلب یہ ہے کہ میرا تعلق جنس بشر سے ہے جیسے تمام بشر پر موت طاری ہوتی ہے میرے اوپر بھی موت طاری ہوگی۔

(۴) قال أنابشر وإنی کنت جنبًا. الخ

(ابوداود شریف، کتاب الطھارة، باب فی الجنب یصلی بالقوم ھو ناسٍ: ج ۱ ص ۳۰)

”میں بشر ہوں اور جنبی بھی ہوتا ہوں پھر پاکی حاصل کرتا ہوں“

یہاں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی چار احادیث کو ہم نے ذکر کیا ہے ورنہ اس پر احادیث کثیرہ وارد ہیں کہ آپ کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، آپ بشر ابن البشر تھے جنات اور فرشتوں میں سے نہ تھے۔

آپ ﷺ اور ابو بکرؓ و عمرؓ کے جسم مبارک کو ایک ہی جگہ کی مٹی سے بنایا گیا ہے۔

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

قال خلقت أنا وأبو بكر وعمر من طين واحدة الخ.

(الديلمی عن ابن عباس، کنز العمال، کتاب الفضائل، ابی بکر وعمر من الإکمال ج ۱۱ ص ۲۵۹)

یعنی مجھے اور ابو ابو بکرؓ و عمرؓ کو ایک ہی جگہ کی مٹی سے بنایا گیا۔

(۲) حضرت محمد ابن سیرینؒ فرماتے ہیں :

وعند الترمذی أبي عبد اللّٰه قال محمد بن سرين لو حلفت صادقًا بارًا ولا مستثنٍ إن اللّٰه تعالىٰ ماخلق نبيه ولا أبابكر ولا عمر إلا من طينة واحدة ردهم إلى تلك الطينة .(عمدة القاری شرح البخاری باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ وأبی بکرؓ وعمرؓ تحت حدیث محمد بن مقاتل: ج۸ ص ۲۲۶)

ترجمہ: حضرت محمد بن سرین فرماتے ہیں اگر میں حلف کھا کر کہوں تو میں سچا نکلوں گا میری قسم پوری ہوگی نہ ٹوٹے گی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور ابو بکرؓ و عمرؓ کو ایک ہی جگہ کی مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک ہی جگہ میں واپس لوٹا دے۔

ان حدیثوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ میری تخلیق مٹی سے ہوئی، اب اگر کوئی اس بات کو نہیں مانتا تو وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلاتا ہے وہ منکر اور کافر ہے۔

آپ ﷺ کی بشریت پر صحابہ کرام کی روایات

(۱) ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

قالت عائشة (رضی اللّٰه عنها) كان رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم بشرًا من البشر (شمایل ترمذی، باب فی تواضع رسول اللہ ﷺ)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنس بشر میں سے ایک بشر تھے۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

قالوا: تکتب کل شيء تسمعه، ورسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بشر یتکلم فی الغضب والرضا الخ. (ابوداود شریف، کتاب العلم، کتابة العلم: ج۲ص ۵۱۴)

ترجمہ: قریش کے لوگوں نے مجھے کہا کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے ہو لکھتے ہو، حالانکہ واقع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں، آپ کو غصّہ آتا ہے جیسا کہ دوسرے بشر کو غصّہ آتا ہے۔

غرض غصہ میں آدمی الٹی سیدھی ہر طرح کی باتیں کرتا ہے جب تم لوگ اچھا برا سب کو لکھتے ہو تو اچھی اور غلط سب باتیں جمع ہو جائیں گی اس میں کیا فائدہ ہوگا پھر رسول اللہ نے فرمایا: مجھے بشر ہونے کے اعتبار سے غصہ آتا ہے، لیکن ہر حال میں حق ہی کہتا ہوں۔

مذکورہ بالا حدیثوں کی روشنی میں معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے، آپ کے اندر بشر کی خصوصیات تھیں، آپ کھانا کھاتے، پانی پیتے اور سوتے تھے اور آپ نے انسانی تقاضے کے تحت نکاح اور آپ سے بچے پیدا ہوئے۔

آپ ﷺ کی بشریت تفسیر کی روشنی میں

(۱) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبریؒ متوفی ۳۱۰ھ قولہ تعالیٰ "إنما انا بشر مثلکم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

یقول تعالیٰ ذکرہ: قل لهولاء المشرکین یامحمد! إنما أنا بشر مثلکم من بنی آدم لاعلم لی إلا ماعلمنی اللّٰه. (تفسیر طبری ج۹ص ۵۰)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے محمد! آپ کہہ دیجئے ان کافروں کو جو کہ آپ کے بشر ہو کر نبی ہونے پر تعجب کرتے ہیں کہ واقعی میں تو تمہارے جیسا بشر ہوں اور اولاد آدم میں سے ہوں میرے پاس صرف وہی علم ہیں جو کہ اللہ نے مجھے تعلیم دیا اس سے مزید کچھ نہیں جانتا۔

(۲) امام نصر بن محمد سمرقندیؒ متوفی ۳۷۵ھ "قالوا أبعث اللّٰه بشرًا رسولاً" کی تفسیر میں فرماتے

ہیں: "الرسول من الآدمیین" (رسول آدمی کی جنس میں سے ہے)۔ (تفسیر سمرقندی)

(۳) امام محمد الامینؒ متوفی ۱۳۹۲ھ قولہ تعالیٰ: "إنما أنا بشر مثلکم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"أی لا أقول لکم إنی ملک ولا غیر بشر بل أنا بشر من جنس البشر."

(أضوء البیان فی ایضاح القرآن: ج۳ ص۳۵۶)

(۴) امام عبدالرحمٰن بن علی جوزیؒ متوفی ۵۹۷ھ حضرت ابن عباس کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فأمر أن یقر علی نفسه بأنه آدمی إلا أنه أکرم بالوحی."

(فی زاد المیسر فی علم التفسیر: ج۵ ص۱۴۹)

(۵) امام احمد مصطفیٰ مراغیؒ قولہ تعالیٰ "قل إنما نما بشر مثلکم" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"أی قل لهم أیها الرسول: إنما أنا بشر مثل ما أنتم کذلک."

(تفسیر المراغی: ج۶ ص۲۵)

مذکورہ بالا تفسیری حوالہ جات سے بھی واضح ہوا کہ آپ کی بشریت پر تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

آپ ﷺ کی بشریت پر محدثین کرام کی رائے

(۱) شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

قال فی "عمدة القاری شرح البخاری": وصية عائشة إلى ابن الزبیرؓ: أن لا یدفنها معهم خشیة أن تزکی بذلک وهذا من متواضعها وإقرارها بالحق لأهله وإیثار هابه علی نفسها ورأیت عمر (رضی الله تعالیٰ عنه) أهلا وأیضا لقرب طینتهما من طینة الخ

(عمدة القاری شرح البخاری باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ وأبی بکرؓ وعمرؓ تحت حدیث محمد بن مقاتل: ج۸ ص۲۲۲)

(۲) اور علامہ عینیؒ "عمدة القاری" کی دوسری جگہ میں لکھتے ہیں:

وقد استدلت جماعة علی فضیلة الشیخین بمجاورتهما ملحده صلی الله علیه وسلم ولقرب طینهما من طینه لما فی حدیث أبی سعید الخدریؓ فی الحبشی المذکور فی اوائل الباب وله شواهد أکثر ها صحیحة: منها حدیث

جندب بن سفیان یرفعه "إذا أراد اللّٰه قبض عبدٍ بأرض جعل له حاجةً" وحديث ابن مسعود ومطر بن مكامس وعروة بن مضرس بنحوه، وفى الحلية لابى نعيم الحافظ عن أبى هريرة قال: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: "مامن مولود إلاوقد ذرعليه من تراب حفرته الخ.

(عمدة القارى شرح البخارى باب ماجاء فى قبر النبى ﷺ وابى بكرؓ وعمرؓ تحت حديث محمدبن مقاتل: (ج۸ ص ۲۲۶)

(۳) ملا علی قاریؒ متوفی ۱۰۱۴ھ لکھتے ہیں:

روى ابن الجوزى فى الوفاء عن كعب الأحبار أنه تعالى: 'لما أراد أن يخلق محمّدًا صلى اللّٰه عليه وسلم أمر جبرائيل عليه الصلاة والسلام: أن ياتيه بالطينة البيضاء فهبط فى ملاء من ملائكة الفردوس وقبض قبضة من موضع قبره بيضاء نيرة، فعجنت بماء التسنيم. (شرح الشفاء طبع مصر: ج ۱ ص ۲۰۱)

ترجمہ: ابن جوزیؒ نے "کتاب الوفاء" میں حضرت کعب احبار سے روایت کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کرے، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ الصلوۃ والسلام کو حکم دیا کہ وہ سفید مٹی لے آئے چنانچہ وہ فردوس کے فرشتوں کی جماعت میں اُترے اور آپ کی قبر مبارک کی جگہ سے سفید اور درخشندہ مٹی کی ایک مٹھی بھر لی سو وہ مٹی تسنیم کے پانی سے گوندھی گئی۔

(۴) محدث کبیر امام ابوحاتم بن ادریس متوفی ۲۷۳ھ فرماتے ہیں:

مانجد لأبى بكر وعمر فضيلة مثل هذه الفضيلة لان طينتهما من طينة رسول اللّٰه ﷺ

(مختصر تذكره القرطبى لعبد الوهاب شعرانى ص: ۲۶ طبع مصر)

ترجمہ: ہم حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کی اس جیسی اور کوئی فضیلت نہیں پاتے کہ ان کا اصل مادہ بھی اس مٹی سے بنا ہے جس مٹی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود تیار ہوا ہے آپ اصل خلقت کی اعتبار سے بشر تھے آپ کی تخلیق بھی مٹی سے ہوئی۔

محدثین کرامؒ نے اپنے اقوال میں تصریح کردی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور آپ کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔

آپ ﷺ کی بشریت پر فقہائے کرام کے اقوال اور ارباب فتاویٰ کے فتاویٰ

حنفی مشائخ کے اقوال:

(۱) محقق ابن ہمامؒ متوفی ۸۶۱ھ ’’مسایرہ شرح مسامرہ‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’لأن النبي صلى الله عليه وسلم إنسان بعثه الله لتبليغ ماأوحى إليه وكذا الرسول فلا فرق.‘‘ (مسايره مع مسامره.)

ترجمہ: نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کئے ہوئے احکام کی تبلیغ کیلئے مبعوث فرمایا ہے اس لحاظ سے دونوں یعنی نبی و رسول میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۲) امام محمد بن محمد کردریؒ متوفی ۸۲۷ھ فرماتے ہیں:

’’لأن النّبي صلى الله عليه وسلم بشر والبشر جنس يلحقهم المعرة إلامن أكرمهم الله.‘‘ (فتاوى بزازية على هامش الهندية: ج٦ ص ٣١١)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور بشر ایک ایسی جنس ہے جس کو عیب لاحق ہوسکتا ہے ہاں جن کو اللہ تعالیٰ کی عزت بخشی وہ عیب سے پاک صاف ہیں، (یعنی تمام انبیاءؑ و مرسلین یہ حضرات سب کے سب معصوم ہیں)

(۳) علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ فتاویٰ شامی کے اندر فرماتے ہیں:

’’وحاصله انه قسم البشر إلى ثلاثة أقسام! خواص: كالأنبياء وأوساط كالصالحين من الصحابة وغيرهم وعوا: كباقي الناس.‘‘

(كتاب الصلوة، باب صفة الصلوة، مطلب في تفضيل البشر على الملائكة: ج ١ ص ٥٢٧)

ترجمہ: تمام انسانوں کے تین طبقے ہیں خواص، اوساط، عوام، طبقۂ خواص میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام ہیں اور طبقۂ اوساط میں صحابہ کرام اور صلحاء و مشائخ دین ہیں اور طبقۂ عوام میں باقی مسلمان شامل ہیں۔

(۴) علامہ طحطاویؒ فرماتے ہیں:

’’ويشترط لصحة الإيمان به صلى الله عليه وسلم: معرفة إسمه إذلا يتم إلا به، وكونه بشرًا من العرب، وكونه خاتم النبيين اتفاقًا لورود ذلك بالقواطع

المتواترة."

ترجمہ: صحت ایمان کیلئے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت، کہ آپ کا نام ونسب معلوم ہو اور یہ کہ آپ بشر ہیں اور یہ کہ آپ خاتم النبیین ہیں اس میں سب کا اتفاق ہے کیونکہ اس بارے میں احادیث وآثار تواتر کے ساتھ وارد ہوئے ہیں، جو قطعیت پر دال ہیں۔

(۵) فصول عمادیہ میں ہے:

"ومن قال: لاأدرى أن النّبى صلى اللّٰه عليه كان إنسيا أوجنيا؟ يكفر."

(فصول عماديه)

ترجمہ: جو شخص کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن تھا یا انسان میں نہیں جانتا؟ اس پر کفر کا حکم لگایا جائیگا۔

(۶) حضرت شیخ احمد سرہندیؒ مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۴ھ فرماتے ہیں:

"اے برادر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بان علوشان بشر بود۔" (مکتوب:۱۷۳۔ دفتر اوّل ص:۱۷۷)

آپ ﷺ کی بشریت پر مالکی مشائخ کے اقوال

(۱) قاضی عیاض بن موسیٰ متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

"قد قدمنا أنه صلى ا للّٰه عليه وسلم وسائر الأنبياء والرسل من البشر، وأن جسمه وظاهره خالص للبشر يجوز عليه من الأفات والتغيرات والآلام والأسقام وتجرع كأس الحمام مايجوز على البشر، وهذا كله ليس بنقيصة فيه الخ." (الشفاء: ج ۲ ص۱۵۷)

ترجمہ: بلاشبہ ہم پہلے بیان کر چکے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور باقی تمام حضرات انبیاء اور رسل علیہم الصلوۃ والسلام بشر تھے اور آپ کا جسم مبارک اور ظاہر خالص بشری تھا۔ آپ کی ذات پر وہ سب کچھ جائز ہے جو اور انسانوں پر طاری ہوسکتا ہے، مثلاً: تکالیف، مصائب، آلام، بیماریاں، موت کا پیالہ پینا وغیرہ اور ان سب امور کی وجہ سے آپ کی شان میں کوئی کمی اور نقص نہیں آتا۔

(۲) علامہ محمد بن عبدالباقی زرقانیؒ متوفی ۱۱۲۲ھ "شرح مواہب" میں لکھتے ہیں:

فإن قلت: هل العلم بكونه صلى اللّٰه عليه وسلم بشرًا ومن العرب شرط فى

صحة الإيمان أو هو من فروض الكفاية على الأبوين مثلا فإذا علم أحدهما ولده المميز وذالک سقط طلب عن الاخر؟ أجاب الشيخ ولی الدين أحمد بن عبد الرحيم العراقی الحافظ بن الحافظ: أنه شرط فی صحة الإيمان فلو قال شخص: أُوْمِنُ برسالة محمد صلی اللّٰہ عليه وسلم إلى جميع الخلق، ولكن لا أدری هل هو من البشر أو من الملائكة أو من الجن؟ أو لا أدری هل هو من العرب أو العجم؟ فلا شک فی كفره، لتكذيبه القرآن لقوله تعالیٰ: "هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِیْ الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِنْهُمْ" وقال تعالیٰ: "وَلاأَقُوْلُ لَكُمْ إِنِّیْ مَلَکٌ" وجحده ماتلقته قرون الإسلام خلفًا عن سلف وصار معلومًا بالضرورةِ عند الخاص والعامّ ولا أعلم فی ذلک خلافًا.
(الزرقانی شرح مواهب طبع مصر: ۶۸/۲)

(۳) علامہ علاء الدین بن محمد بن ابراھیم بغدادیؒ فرماتے ہیں:

"قوله تعالیٰ: "قالت لهم رسلهم إن نحن إلا بشر مثلكم" الخ يعنی لما قالوا إن أنتم إلا بشر مثلنا قالت لهم رسلهم مجيبين لهم: هب أن الأمر كما قلتم فنحن بشر لا ننكر ذلک." (تفسير الخازن ج۳ ص۸۸) وكذا فی (تفسير القرطبی ج۱۰ ص۳۳۱)

آپ ﷺ کی بشریت پر شافعی فقہاء وعلماء کے اقوال

(۱) علامہ جلال الدین دوانیؒ متوفی ۹۳۸ھ فرماتے ہیں:

"النبی هو إنسان بعثه اللّٰہ إلى الخلق لتبليغ ما أوحی إليه." (شرح عقائد جلالی. ص۲)

ترجمہ: نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف تبلیغ کی خاطر مبعوث کرتا ہے۔

(۲) امام محمد بن عمر رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں:

"كان محمد صلی اللّٰہ عليه وسلم من البشر." (تفسير كبير طبع مصر: (ج۵ ص ۳۵)

ترجمہ: یعنی امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے۔

(۳) حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عمر عربیؒ متوفی ۶۳۸ھ فرماتے ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ عليه وسلم فی كل وقت وهو فی مرتبة الرسالة

والخلافة: ”إنما أنا بشر“ ”مثلكم“ فلم تحجه المرتبة عن معرفة نشأته.“

(فتوحات مکیه : ج ۲ ص ۲۳ : طبع مصر)

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ وقت جبکہ آپ رسالت اور خلافت الٰہی کے بلند مرتبے پر فائز تھے یہی فرماتے رہے کہ میں تو تمہاری طرح کا بشر ہوں آپ کے اس بلند مقام نے آپ ﷺ کو اپنی حقیقت کے اعتراف سے نہیں روکا۔

(۴) امیر یمانی محمد بن اسماعیلؒ متوفی ۱۱۸۲ھ فرماتے ہیں :

”وفي لسان الشرع عبارة عن إنسان أنزل عليه شريعة من عند اللّٰه بطريق الوحي فإذا أمر بتبليغها إلى الغير سمي رسولاً.“ (سبل السلام ج ۱ ص ۹ طبع مصر)

ترجمہ: اور شریعت کی اصطلاح میں نبی اس انسان کو کہتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ شریعت نازل کی گئی ہو اور جب دوسرے لوگوں کی خاطر اُسے شریعت کی تعلیم و تبلیغ کا حکم دیا گیا ہو تو اُسے رسول کہتے ہیں۔

آپ ﷺ کی بشریت پر حنبلی فقہاء وعلماء کے اقوال

امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں آپکی بشریت کے ثبوت پر ایک حدیث نقل کی اور وہ یہ ہے:

”عن أبي رمثة قال: انطلقت مع أبي نحو رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فلما رأيته قال لي أبي هل تدري من هذا؟ فقال لي أبي: هذا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فاقشعرت حين ذلك وكنت أظن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم شيئا لا يشبه الناس فإذا بشر له وفرة.“ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۲۶)

پس قرآن وحدیث اور تفسیر وفقہی حوالہ جات سے یہ بات بالکل قطعی طور پر معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ جملہ انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام نبی ورسول ہونے کے ساتھ ساتھ بشر بھی تھے، فرشتے یا جنات میں سے نہ تھے، اس بات پر ائمہ اربعہ اور تمام علماء اسلام وفقہائے ملت متفق ہیں، جس کا انکار جہالت وعناد کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اجماع کی روشنی میں آپ ﷺ بشر ہیں۔

(۱) مفسر قرآن علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ متوفی ۱۲۷۰ھ فرماتے ہیں:

قوله تعالیٰ "هل كنت الا بشرًا رسولًا" سورۃ بنی اسرائیل کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قال فی "روح المعانی": وَلَمْ يُنْكِرْ أحدٌ بشريته صلى الله عليه وسلم ."
(ج۸ ص ۱۷۰)

ترجمہ: آپ ﷺ کی بشریت پر تمام امت کا اجماع ہے، اس سے کسی عالم نے انکار نہیں کیا۔

(۲) شیخ محمد عبدہ "تفسیر منار" میں فرماتے ہیں:

"قال فی "تفسیر المنار،،: والأنبياء أفضل البشر بالإجماع." (ج۷ ص ۶۰۸)

ترجمہ: حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بالاجماع افضل بشر ہیں۔

(۳) علامہ خفاجیؒ فرماتے ہیں:

قال فی "نسیم الریاض فی شرح الشفاء،، (تمت كلمة الإجماع) أی انعقد إجماع من يعتد بإجماعه اتفقوا عليه حتى كان كلامهم واحدة تامة (على خروجه) اى خروج النبى صلى لله عليه وسلم من جنس البسر."
(ج ۱ ص ۵۴۷)

قیاس کی روشنی میں آپ ﷺ بشر ہیں

(۱) امام محمد حسین طباءطبائی قولہ تعالیٰ "إنما نا بشر مثلكم" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قال فی "المیزان فی تفسیر القرآن،،: فمحصله قل لهم: أنابشر أعاشر كما يعاشر كم أحد كم بعضًا، وأكلمكم كمايكلمكم أحد كم صاحبه، فلست من جنس يباينكم كالملک حتى تكون بيني وبينكم حجاب مضروب أولاينفذ كلامي في اذانكم: (ج۱۷ ص ۳۶۱)

(۲) امام فخر الدین رازیؒ متوفی ۶۰۶ھ قولہ تعالیٰ "لاهية قلوبهم" سورۃ انبیاء کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قال فی "تفسیر الکبیر": فيجب أن يكون نبيًا بل الأولىٰ أن يكون المبعوث إلى البشر بشرًا لأن المرأ إلى القبول من أشكاله أقرب وهو به انس. (ج۵ ص ۳۵

پس قرآن، حدیث، اجماع، قیاس کی روشنی میں ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ باعتبار خلقت بشر بن بشر اور آدم زاد ہیں، ساتھ ساتھ نبی ورسول بھی ہیں اور اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر نور نبوت ورسالت بدرجۂ اکمل واتم موجود ہیں۔

لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باعتبار خلقت بشر ماننا اور باعتبار نبی ورسول اور صاحب قرآن کے صاحب نور، نور والا ماننا ضروری ہے، بشریت میں آپ ﷺ اعلیٰ درجہ کے بشر اور صاحب نور تھے اور نبی ورسول میں بھی اکمل واتم درجہ کے نور والے تھے، ان سب باتوں کا ماننا ضروری ہے اور ان کا انکار کرنا حقیقت کا انکار اور کفر ہے۔

آپ ﷺ کی بشریت کے منکرین کافر ہیں۔

(۱) مفسر قرآن علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ فرماتے ہیں:

"قال فی "روح المعانی": وقد سئل الشیخ ولی الدین العراقی هل العلم بکونه صلی اللّٰه علیه بشرًا من العرب شرط فی صحة الإیمان أومن الفروض الکفایة: فأجاب: بأنه شرط فی صحة الإیمان ثم قال: فلو قال شخص: أُومِنُ برسالة محمد صلّی اللّٰه علیه وسلم إلی جمیع الخلق، لکن لاأدری هل هو من البشر أومن الملائکة أو من الجن؟ أولا أدری هل هومن العرب أو العجم؟ فلاشک فی کفره لتکذیبه القرآن وجحده ماتلقته قرون الاسلام خلفا عن سلف وصارمعلومًا بالضرورة عند الخواص والعوام لاأعلم فی ذلک خلافاً، فلو کان غبیاً لایعرف ذلک، وجب تعلیم إیاه، فإن جحده بعد ذلک حکمنا بکفره. مبحث" لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ إِذْبَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلاً مِنْ اَنْفُسِهِمْ. "

(ج٣ص ١١٣ وکذا فی الزرقانی شرح مواهب: ج ٢ ص ٦٨)

ترجمہ: شیخ ولی الدین عراقیؒ سے سوال کیا گیا کہ کیا یہ جاننا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر اور عربی ہیں، صحت ایمان کے لئے شرط ہے یا فرض کفایہ ہے؟ تو انہوں نے اس کا جواب دیا: کہ یہ صحت ایمان کے لئے شرط ہے، سو اگر کسی شخص نے یہ کہا کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو تمام مخلوق کے لیے مانتا ہوں، لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ بشر تھے یا فرشتہ یا جن؟ یا یہ کہا کہ میں نہیں جانتا کہ آپ عربی تھے یا عجمی؟ تو اس شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اس نے قرآن پاک کی تکذیب کی ہے اور اس چیز کا انکار کیا ہے، جس کو خلف وسلف اور تمام قرون اسلام میں تلقی بالقبول حاصل ہے اور جو چیز خاص وعام کے نزدیک بداهۃً معلوم ہو چکی ہے اور اس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے پھر بھی اس کو نہیں جانتا پس اگر کوئی شخص

غبی ہے جو اس کو نہیں جانتا تو اس کو اس کی تعلیم دینا واجب ہے، اگر تعلیم کے بعد بھی وہ اس کا انکار کرے تو ہم اس کے کفر کا حکم دیں گے۔

(۲) ابوحنیفہ ثانی علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

" قال فی " البحر " فیکفر...... وبقوله لاأدری کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم: إنسیًا أو جنیاً. " (باب احکام المرتدین: ج۵ص: ۱۲۱)

(۳) فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہیں:

"ولو قال لاأدری أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان إنسیًا أو جنیا؟ یکفر."

(فتاوی تاتارخانیه ج ۵ص: ۴۸۰)

(۴) فصول عمادیہ میں ہے :

"من قال: لاأدری أن النّبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان إنسیًا أو جنیًا؟ یکفر."

(فصول عمادیه ص: ۱۳۵)

ترجمہ: جو شخص یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے یا جن؟ تو وہ شخص کافر ہے۔

خلاصہ: یہ کہ قرآن وسنت کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی بشریت ثابت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی بشریت کا منکر کافر ہے اور اگر پہلے سے مسلمان تھا تو اب بشریت کے انکار سے مرتد بن جائیگا۔

هذا ماظهر لی وهذا صراطی وصراط جمیع المسلمین والتوفیق من للّٰه تعالیٰ هو یهدی السبیل وصلی اللّٰه علیه وسلم وآله وصحبه اجمعین یا رب العٰلمین.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ

اضافہ: -واضح رہے کہ محمد بن عبد اللہ محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم علیہ الصلوٰۃ والسلام صلوٰۃ دائمۃ ابدًا ابدًا، اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول تھے باعتبار خلقت وپیدائش انسان ابن انسان حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیٹوں میں سے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو نور ہدایت ونور شریعت سے منور بنا کر مبعوث کیا تھا، تاکہ کفر وضلال کی ظلمتوں سے انسان کو نکال کر نور ہدایت سے منور کرسکیں، یہ سب باتیں

قرآن واحادیث کی نصوص سے ثابت ہیں، ان میں ہر بات پر ایمان وعقیدہ رکھنا واجب ہے اور کسی بات کا انکار کرنا کفر ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کے ایمان واعمال کو درست کرنے کی توفیق بخشے اور جن کے ایمان واعمال درست ہیں اسکی حفاظت کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں۔ آمین یارب **العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی عبدہ ونبیہ الامی دائمًاابدًا ابدًا والہ و اصحابہ اجمعین.**"

کتبہ: محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

جَاءَ الحق وزهق الباطل إن الباطل كان زهوقا (الاية)

رسول اللہ ﷺ کی عدم بشریت پر اہل بدعت کے دلائل اور ان کے جوابات

- پہلی دلیل: قَدْجَاءَ کُمْ مِنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ۔" آلآیة۔
- دوسری دلیل: "یَاجَابِرُ اِنَّ اللّٰہَ قَدْخَلَقَ نُوْرَنَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِ ہٖ" کی تحقیق۔
- تیسری دلیل: ایک موضوع روایت ہے۔
- چوتھی دلیل: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا آپ ﷺ کے دانتوں کے نور سے گری ہوئی سوئی کا اٹھالینے والی روایت، یہ بھی موضوع ہے۔
- پانچویں دلیل: ملا علی قاریؒ کی نقل، یہ بھی موضوع ہے۔
- چھٹی دلیل: خصائص الکبریٰ اور جمع الوسائل کی روایتیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔
- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ تھا، یہ روایات صحیحہ سے ثابت ہے۔
- خصائص الکبریٰ اور جمع الوسائل کی روایتیں پہلی والی روایات کے مقابلہ میں قابل استدلال نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی عدم بشریت پر بریلوی حضرات کے دلائل اوران کے جوابات

(۱۶)سوال:- بریلوی علماء حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونور مانتے ہیں اورانکی اکثریت آپ ﷺ کے بشرہونے کے منکر ہیں، عدم بشریت پران کے دلائل کے جوابات چاہئیں۔

پہلی دلیل:- بعض بریلوی حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے پرآیت قرآنی ''قَدْ جَاءَ کُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ کِتَابٌ مُّبِیْنٌ یَهْدِیْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ۔'' (مائدۃ ۲) سے استدلال کرتے ہیں یعنی وہ لوگ کہتے ہیں: کہ آیت مذکورہ میں لفظ ''نور'' سے آپکی ذات گرامی مراد ہے، چنانچہ تفسیر جلالین، قرطبی وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے، لہٰذا اس بارے میں علماء اہل سنت والجماعت کی تحقیقات مطلوب ہیں۔

الجواب وهوالموفّق للصّواب

جواب(۱):- مذکورہ بالا آیت کے اندر لفظ ''نور'' سے کیا مراد ہے اس بارے میں مفسرین کرام کے مختلف اقوال ہیں، چنانچہ فخر الدین رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

وفيه أقوال: (الأوّل) أن المراد بالنور محمّد، وبالكتاب القرآن، (والثانى) أن المراد بالنور الإسلام وبالكتاب القرآن (الثالث) النور والكتاب هو القرآن هذا ضعيف لأن العطف يوجب المغايرة. (تفسير كبير)

ترجمہ: اوراس آیت میں کئی اقوال ہیں پہلا قول یہ ہے کہ آیت میں نور سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور کتاب سے مراد قرآن کریم، دوسرا قول یہ ہے کہ نور سے مراد دین اسلام ہے اور کتاب سے مراد قرآن کریم ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ نور اور کتاب دونوں سے مراد قرآن کریم ہے اور یہ قولِ ضعیف ہے، کیونکہ عطف مغایرت کو چاہتا ہے۔

یعنی بعض مفسرین نے آیت کے اندر نور سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد لی ہے اور کتاب سے قرآن کریم مراد لیا ہے اور بعض نے تور سے دین اسلام مراد لیا ہے اور کتاب سے قرآن کریم،

یہی تفسیر اصح ہے، کیونکہ اس صورت میں نصوص صریحہ اور صحیحہ کے ساتھ کوئی تعارض باقی نہیں رہتا، باقی نور اور کتاب دونوں سے قرآن کریم مراد ہونے کی صورت میں بھی کوئی تعارض نہیں ہوتا، اس وجہ سے کہ اس صورت میں نور اور کتاب کا عطف، عطف تفسیری ہوگا، جس میں معطوف اور معطوف علیہ میں ذاتًا تغایر نہیں، بلکہ صفت کے لحاظ سے تغایر ہے اور معنی یہ ہوگا کہ قرآن مجید نور بھی ہے اور وہ باتوں کو کھول کر بیان بھی کرتا ہے اس لئے ''کتاب مبین'' بھی ہے۔

(۱) چنانچہ بیہقی وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وجاز أن يكون العطف تفسيرًا وسمىٰ محمدًا صلى الله عليه وسلم والقرآن نورًا لكونهما كاشفين لظلمات الكفر." (تفسیر مظهری: ج۳ص۶۸)

ترجمہ: عطف تفسیری مراد لینا بھی درست ہے اور مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نور فرمایا اور کتاب قرآن کو بھی نور فرمایا ہے، اس میں کوئی تضاد وتعارض نہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ظلمات کفر وشرک کو ہٹانے والے ہے اور قرآن بھی۔

(۲) امام ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بیضاویؒ متوفیٰ ۱۹۶ھ فرماتے ہیں:

"يعني القرآن فإنه الكاشف لظلمات الشك والضلال، والكتاب الواضح الإعجاز، وقيل: يريد بالنور محمّد صلّى الله عليه وسلم." (تفسير بيضاوى تحت قوله تعالىٰ قدجاء كم من الله نور الخ)

ترجمہ: قرآن اس لئے کہ وہ شک اور گمراہی کی تاریکیوں کو کھولنے والا ہے اور کتاب واضح اعجاز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نور سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

(۳) امام محمد بن یوسف (معروف ابوحیان) اندلسی غرناطی رحمۃ اللہ علیہ قولہ تعالیٰ: "قدجاء كم من الله نور الخ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قيل: القرآن! سماه نورًا لكشف ظلمات الشرك والشك، أولأنه ظاهر الإعجاز الخ." (تفسير البحر المحيط ج۳ ص۴۴۸).

ترجمہ: کہا گیا کہ وہ قرآن ہے اور نام رکھا ہے اس کا نور اس لئے کہ وہ شرک اور شک کی تاریکیوں کو کھولنے والا ہے یا اس لئے کہ وہ واضح اعجاز ہے۔

(۴) ''تفسیر خازن'' میں ہے:

"(قدجاء كم من الله نور و كتاب مبين) يريد القرآن لكشفه ظلمات الشرك

والشک، ولإتيانه ما كان خافيا على الناس من الحق أو لأنه ظاهر الإعجاز الخ.“

(ازمجموعہ تفاسیر: ج ۱ ص ۲۵۴)

تو مذکورہ بالا تفاسیر سے واضح ہوا کہ آیات قرآنی کے اندر لفظ ”نور“ سے قرآن مراد ہونا ہی راجح اور واضح ہے، چونکہ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر ”نور“ قرآن مجید کی صفت بیان ہوئی، چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) **”وأنزلنآ إليكم نورًا مبيناً.“** (سورۃ نساء: ۱۷۵)

ترجمہ: اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور (قرآن مجید) بھیجا ہے۔ (بیان القرآن)

(۲) **”فالذين اٰمنوا به وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذى أنزل معه أولئك هم المفلحون.“** (الاعراف: ۱۵۷)

ترجمہ: سو جو لوگ (نبی موصوف) پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور یعنی کتاب کی اتباع کرتے ہیں، جو انکے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں۔ (بیان القرآن)

(۳) **”ما كنت تدرى ما الكتاب ولا الإيمان ولكن جعلناه نورًا نهدى به من نشاء من عبادنا.“** (شوریٰ: ۵۲)

ترجمہ: آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا چیز ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان کا انتہائی کمال کیا ہے لیکن ہم نے اس قرآن کو ایک نور بنایا جسکے ذریعہ آپ ہدایت کا راستہ بندوں کو بتلاتے ہیں اور ان میں سے جس کو ہم چاہیں ہدایت دیتے ہیں۔ (بیان القرآن)

(۴) **”فاٰمنوا بالله ورسوله والنور الذى أنزلنا.“** (تغابن: ۸)

ترجمہ: سو تم (کو چاہیے کہ) اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس نور پر (یعنی قرآن) کہ ہم نے نازل کیا ہے اس کو، تم لوگ اس پر ایمان لاؤ۔ (بیان القرآن)

ان آیتوں میں لفظ ”نور“ سے قرآن کریم مراد ہے، اس لئے اکثر مفسرین نے ”**نُورٌ وَّكِتَابٌ مُّبِينٌ**“ میں بھی لفظ نور سے قرآن کریم مراد لیا ہے اور عطف محض عطف تفسیری ہے، جس میں معطوف اور معطوف علیہ میں ذاتاً کوئی تغایر نہیں ہوتا، بلکہ محض صفت کے لحاظ سے تغایر ہوتا ہے، البتہ امام رازیؒ کے قول ”**هذا ضعيف لأن العطف يوجب المغايرة**“ کا جواب یہ ہے کہ عطف تفسیری میں ذاتاً تغایر نہیں ہوتا ہے، لہٰذا کوئی اشکال نہیں ہے۔

جواب (۲):- لفظ ''نور'' سے آپکی ذات گرامی مراد لینے کی صورت میں بھی کوئی اشکال واعتراض نہیں، کیونکہ نور سے مراد آپ کی خلقت اور پیدائشی حقیقت بیان نہیں کی جارہی ہے، بلکہ آپکی صفات وکمالات کو بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کتاب، جو سراسر نور ہے اور نور نبوت، جو کہ وصف نورانی ہے، دیکر مبعوث فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے، کہ آپ اگرچہ خلقۃً بشر ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر نور نبوت کے ساتھ ساتھ کلام الٰہی کو بھی ودیعت رکھدیئے ہے۔

لہٰذا بشر ہونے کے ساتھ آپ کو نور نبوت اور نور وحی، کتاب اللہ سے منوّر بنا کر مبعوث کیا گیا ہے، تاکہ کفر وشرک اور ضلال کی ظلمتوں سے انسان کو نکال کر نور ایمان وہدایت سے منور کرسکیں، چنانچہ نور کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مفسرین کرام لکھتے ہیں:

(۱) ''تفسیر نسفی'' میں ہے:

"(قد جاء كم من الله نور) يعني محمّدًا صلى الله عليه وسلم إنما سماه الله نورًا لأنه يهتدى به كما يهتدى بالنور فى الظلام وقيل النور الإسلام."

(از مجموعة تفاسیر: ج ۱ ص ۲۵۴)

ترجمہ: قرآن کریم میں آپ کی ذات گرامی کو نور بتایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ لوگ آپ کے ذریعہ شرک وکفر اور ضلال کی اندھیریوں سے نجات پاتے ہیں جس طرح لوگ اندھیری میں نور اور روشنی کے ذریعہ راہ پاتے ہیں۔

(۲) ''تفسیر خازن'' میں ہے:

"أو النور محمد صلّى الله عليه وسلم لأنه يهتدى به كما سمى سراجًا."

(از مجموعہ تفاسیر ج ۱ ص ۲۵۴)

ترجمہ: نور سے آپکی ذات گرامی مراد لی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی برکت سے لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری جگہ میں آپ کو چراغ کہا گیا۔

مذکورہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوا کہ قرآن میں آپ کو جو ''نور'' کہا گیا ہے اس نور سے مراد آپ کے نور نبوت اور نور رسالت اور نور کتاب سے مراد نور شریعت ہے یعنی خلقۃً آپ بشر اور انسان تھے اور اسکے ساتھ نور نبوت ونور شریعت سے منوّر تھے، پس بریلوی حضرات نے ''نور'' نے جو آپکی خلقت نور سے ہونا سمجھی ہے وہ غلط ہے، کیونکہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپکی تخلیق اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے ہوئی ہے، آپ بشر وانسان نہیں تھے، یہ غلط اور باطل ہے۔

جواب (۳): - جن مفسرین نے نور سے آپ کی ذات گرامی مراد لی ہے، ان حضرات کے نزدیک بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے، بشر تھے، وہ حضرات آپ کی بشریت سے منکر نہ تھے، بلکہ باعتبار پیدائش آپ کو بشر اور باعتبار نبوت و رسالت آپ کو نور کہتے تھے، چنانچہ: ان کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتَابٌ مُّبِيْنٌ يَهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ‘‘. (مائدۃ: ۲) کی تفسیر میں نور سے آپکی ذات گرامی مراد لی ہے۔ اور سورۂ کہف کی آیت ’’قُلْ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں ’’بشر أی آدمی‘‘ یعنی آپ انسان ہیں۔ (تفسیر جلالین: ج ۱ ص ۲۵۳)

(۲) فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت کی تفسیر میں نور کے متعلق تین اقوال ذکر کئے۔ ان میں سے ایک قول میں نور سے آپ کی ذات گرامی مراد لی ہے، مگر دوسری آیت ’’لاهية قلوبهم وأسروا النجوى الذين ظلموا هل هذا إلا بشر مثلكم‘‘ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’فيجب أن يكون نبيًا بل الأولى أن يكون المبعوث إلى البشر بشرًا لأن المرأ إلى القبول من أشكاله أقرب وهو به أنس.‘‘ (تفسیر کبیر ج۸ ص ۱۳۰)

پس مذکورہ عبارتوں سے واضح ہوا کہ جن مفسرین نے ان قرآنی آیات میں نور سے آپ کی ذات گرامی مراد لی ہے، انکا مقصد و مطلب بھی یہ ہے کہ آپ خلقۃً تو بشر اور انسان تھے اور باعتبار نبوت و رسالت آپ نور تھے، تو ان مفسرین کی عبارتوں سے عدم بشریت پر استدلال کرنا ایسا ہے جیسا کہ بعض جہلاء ’’وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى‘‘ کو حذف کر کے ’’وَلَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ‘‘ سے عدم فرضیتِ صلوۃ پر استدلال کرتے ہیں اور ’’وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى‘‘ کی طرف التفات نہیں کرتے ہیں، جو کہ غلط اور باطل ہے۔

بریلوی حضرات کی دوسری دلیل

اہل بدعت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے پر دوسری دلیل یوں پیش کرتے ہیں کہ امام عبدالرزاق نے اپنی مسند کے اندر حضرت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں مجھے خبر دیجئے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے کون سی چیز پیدا کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"یَاجَابِرُ! اِنَّ اللّٰہَ قَدْخَلَقَ نُوْرَنَبِیِّکَ مِنْ نُوْرِہٖ" (زرقانی شرح مواھب ج ۱ ص ۷)

ترجمہ: اے جابر (رضی اللہ عنہ) بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء سے قبل تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا کیا ہے۔

جواب (۱): - اسی روایت سے آپ کی بشریت وانسانیت کا انکار کرنا اور آپ کے بارے میں محض نور الٰہی کا عقیدہ ثابت کرنا درست نہیں۔

پہلی وجہ: - اس روایت کے رواۃ سب مجہول ہیں اور عبدالرزاق شیعہ تھے البتہ غالی نہ تھے، ایسے راوی کی نقل کردہ روایت ضعیف ہوتی ہے اور ضعیف روایتوں سے عقائد کا مسئلہ ثابت نہیں ہوتا ہے۔

- نیز بعض چیزوں میں وہ منفرد ہیں، ثقہ راویوں میں سے کوئی انکا ساتھ نہیں دیتا۔

(تذکرۃ الحفاظ ۱/ ۲۳۱)

- خصوصاً فضائل کے بارے میں تو انہوں نے ایسی روایات بھی بیان کی ہیں جن میں ان کا ساتھ کسی نے نہیں دیا، چنانچہ ملک المظفر ابوبکر ایوب حنفی فرماتے ہیں:

"قال ابن عدی: حدث عبدالرزاق بأحادیث فی الفضائل لم یوافق أحد علیها الخ."

(السھم المصیب: ۱۳۰)

ترجمہ: محدث ابن عدی فرماتے ہیں: کہ عبدالرزاق نے فضائل کے باب میں ایسی ایسی روایات بھی بیان کی ہیں جن میں ان کے ساتھ کسی نے موافقت نہیں کی۔

- علامہ محمد طاہر حنفیؒ متوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں:

عبدالرزاق بن ہمام آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے، اور ان کے بھانجے احمد بن عبداللہ نے ان کی کتابوں میں باطل روایتیں بھی داخل کر دی تھیں، جس کی وجہ سے وہ کاذب مشہور ہو گئے تھے۔

(قانون الموضوعات: ۲۶۹)

دوسری وجہ: - عبدالرزاق کی تصنیف کتب حدیث کے طبقۂ ثالثہ میں شمار ہے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ متوفی ۱۲۳۹ھ فرماتے ہیں:

"اکثر آن احادیث معمول بہ نزد فقہاء نشدہ اند بلکہ اجماع برخلاف آنہا منعقد گشتہ۔

(عجالہ نافعہ ص ۷ تصنیف شاہ عبدالعزیز محدث دھلویؒ)

ترجمہ: ان سے مروی اکثر حدیثوں پر فقہائے کرام کے نزدیک عمل نہیں ہوا بلکہ ان کے خلاف اجماع منعقد ہوا۔

تیسری وجہ: - یہ روایت اس صحیح روایت کے خلاف ہے، جس میں آتا ہے، کہ آپ نے فرمایا: اِنَّ اَوَّلَ

مَاخَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ لَهُ: اكْتُبْ."

(أبوداود: ج۲ ص:٦٧. ا وکذافی الترمذی وقال: حسن صحیح غریب: ج۲ ص ١٦٧. وکذاأخرجه أحمد)

ترجمہ: سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا، پس اس سے فرمایا: کہ تو لکھ۔

✿ حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ فرماتے ہیں:

"والوارد فی أوّل ماخلق اللّٰه حدیث أوّل ماخلق القلم وهو ثبت."

(بحوالۂ موضوعات کبیر: ص ۳۱)

ترجمہ: سب سے پہلی مخلوق کے بارے میں جو حدیث وارد ہوئی وہ "اوّل ماخلق اللّٰہ القلم" ہے اور وہ روایت ثابت ہے۔

پس اس صحیح روایت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم تقدیر کو پیدا کیا ہے، نیز شراح حدیث اور محققین نے جہاں اوّل المخلوقات کی تحقیق و بحث کی ہے، وہاں قلم، عرش، اور عقل وغیرہ کا ذکر کیا، مگر نور کا ذکر نہیں کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ "اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ" والی حدیث ان کے نزدیک ثابت و صحیح نہیں ورنہ اختلاف کے مقام پر وہ حضرات اسکو ضرور ذکر فرماتے، البتہ ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقات ج ا ص ۱۴۶ اور "جمع الوسائل" میں اوّل مخلوقات میں آپ کے نور کا ذکر کیا ہے، مگر خود ان کی کتابوں میں اسکی تصریح موجود ہے، کہ نور سے مراد روح ہے، چنانچہ اس کا ذکر آرہا ہے۔

چوتھی وجہ :- جس طرح اسی روایت میں آپ کے نور کی اوّلیت کا ذکر آتا ہے اسی طرح روح مبارک کی اوّلیت کا ذکر بھی ہے، چنانچہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"فإنه كما قال صلى اللّٰه عليه وسلم أوّل ماخلق اللّٰه روحی وسائر الأرواح إنما خلق ببركة روحه ونور وجوده." (شرح الشفاء. ج ا ص ١٧. طبع مصر)

ترجمہ: بیشک جیسا کہ آپ نے فرمایا: کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میری روح پیدا کی اور باقی تمام ارواح آپ کی روح آپکے وجود کے نور کی برکت سے پیدا ہوئی ہیں۔

✿ دوسری جگہ میں فرماتے ہیں:

"قوله أوّل ماخلق اللّٰه نوری و فی رواية روحی ومعناهما واحد فإن الأرواح نورانية ای أوّل ماخلق اللّٰه من الأرواح روحی." (مرقات ج ا ص ١٦٧. طبع امدادیه ملتان)

ترجمہ: آپ کا ارشاد ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرا نور پیدا کیا اور ایک روایت میں

ہے کہ میری روح کو پیدا کیا اور دونوں کا مطلب ایک ہی ہے کیونکہ ارواح نورانی چیز ہیں تو مطلب یہ ہوا کہ سب ارواح سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میری روح کو پیدا کیا ہے۔

پس جس طرح ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِیْ'' کی روایت ہے، اسی طرح ''اَوَّلُ مَاخَلَقَ اللّٰهُ رُوْحِی'' کی بھی روایت ہے اب دونوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ نور سے مراد روح ہے کیونکہ روح بھی ایک نورانی چیز اور جوہر لطیف ہے۔

✿ چنانچہ علامہ احمد بن محمد خفاجی حنفیؒ متوفی ۱۰۶۹ھ فرماتے ہیں:

''إن اللّٰه خلق روحه قبل سائر الارواح وخلع عليها خلعة التشريف بالنبوة إلى أن قال وهذا هو المراد بقوله صلى اللّٰه عليه وسلم: إن اللّٰه خلق نوره قبل أن يخلق آدم عليه الصلوٰة والسلام.'' (نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۰۰ طبع مصر)

ان تحقیقات سے واضح ہوا کہ مذکورہ حدیث اضطراب لفظی کبھی ''نوری'' اور کبھی ''روحی'' کیوجہ سے اور کبھی مخالف روایت ثقات کی وجہ سے شاذ ہے، پس اسی روایات سے استدلال درست نہیں۔

جواب (۲):- بالفرض اگر حدیث مذکورہ کو صحیح بھی مان لیا جاوے تو بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ اس وقت تفسیر یہ ہوگی کہ نور سے نور نبوت مراد ہے یعنی آپ ﷺ آدم زاد ہونے کے اعتبار سے تو بعد میں پیدا ہوئے اور دنیا میں تمام نبیوں کے بعد تشریف لائے، لیکن باعتبار نورِ نبوت کے آپ ﷺ سب نبیوں کے نورِ نبوت سے قبل پیدا کیا گیا ہے، تو اس تفصیل کے بعد آپ ﷺ بشر ہونے کے ساتھ ساتھ حامل نور نبوت بھی ہیں جس کی تخلیق سب نبیوں کے نور نبوت سے قبل ہوئی اس صورت میں آپ ﷺ کے بشر ہونے اور نور ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ بشر اور انسان ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کو نورِ نبوت ورسالت سے بھی منوّر بنا کر بھیجا گیا ہے، پس بشریت اور نور ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

بریلوی حضرات کی تیسری دلیل

(١) إن اللّٰه قبض من نور وجهه قبضة ونظر إليها فعرفت وذلقت فخلق اللّٰه من كل نقطة نبيًا وأن القبضة كانت هي النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وأنه كان كوكبًا دريًا وأن العالم كله خلق منه وأنه كان موجودًا قبل أن يخلق أبواه وأنه

یحفظ القران قبل أن یأتیه جبریل.“

(الأثارة المرفوعة فی الأخبار الموضوعة لعبدالحي لکھنوی ج۵ ص ۳۲)

اس روایت سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے بشر نہ تھے یعنی اس روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے چہرے کے نور سے ایک مٹھی لی......وہ مٹھی آپ کی ذات گرامی تھی اس سے سارا جہاں پیدا ہوا۔

جواب:-اس روایت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت موضوع وباطل ہے۔

- چنانچہ حافظ ابن کثیر اور ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں:

”کل ذلک کذب مفتری باتفاق أهل العلم بحدیثه انتهی.“

(الأثارة المرفوعة فی الاخبار الموضوعة : ۳۲/۵)

ترجمہ: یہ سب کا سب جھوٹ اور افتراء ہے علم حدیث کے جاننے والوں کا اس پر اتفاق ہے۔

لہٰذا اس موضوع روایت سے آپ کی تخلیق نور سے ہونے پر استدلال درست نہیں۔

بریلوی حضرات کی چوتھی دلیل

عن عائشة رضی اللہ عنها أنها کانت مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم علی فراشه فی لیلة مظلمة، فسقط من یدها ابرة إلی الأرض، فکشفت من وجهه صلی اللہ علیه وسلم، فوجدتها بنور جبینه فرفعتها.“

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک اندھیری رات کو وہ حضور صلی اللہ علیہ السلام کے ہمراہ بستر پر تھیں اچانک ان کے ہاتھ سے سوئی زمین پر گر گئی، پس وہ آپ کے چہرہ انور سے ظاہر ہوئی اور حضرت عائشہؓ نے آپکی پیشانی کے نور کی برکت سے سوئی کو پایا اور زمین سے اٹھایا۔

اسی روایت سے اہل بدعت کہتے ہیں کہ اندھیری رات میں حضرت عائشہ رضی اللہ نے آپ کے نور کی روشنی کے ذریعہ گری ہوئی سوئی کو زمین سے چن لیا تھا، پس اِس سے ثابت ہوا کہ آپ نور تھے بشر نہ تھے۔

جواب:-اصول حدیث کی کتابوں میں تصریح موجود ہے کہ موضوع حدیث پر حدیث سمجھ کر عمل کرنا اور موضوع ہونے کی تصریح کئے بغیر اس کو روایت کرنا ناجائز وحرام ہے، پھر عقیدہ کے مسئلہ پر استدلال کرنا

اور اس سے عقائد ثابت کرنا کیسے جائز ہوگا، جبکہ حدیث مذکورہ کے باطل ہونے پر محدثین کرام کی تصریحات موجود ہیں، چنانچہ:

(ا) حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الآثار المرفوعة فی الأخبار الموضوعة" میں لکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف منسوب جس روایت میں سوئی ملنے کا ذکر ہے وہ روایت باطل اور موضوع ہے، چنانچہ

> ومنها مايذكره الوعاظ عندذكر الحسن المحمّدى أنه فى ليلة من الليالى سقطت عن يدعائشة رضى اللّٰه عنها إبرة ففقدت فالتسمتها ولم تجد فضحك النبى صلى اللّٰه عليه وسلم وخرجت لمعة أسنانه فأضاء ت الحجرة ورأت عائشة رضى اللّٰه عنها بذلك الضوء ابرة وهذا وإن كان مذكورًافى معارج النبوة وغيره من كتب السير الجامعة للرطب واليابس فلايستند كل مافيها إلا النائم والناعس لكنه لم يثبت روايةً ودرايةً انتهى .

(الآثار المرفوعة فى الأخبار الموضوعة لعبدالحي لكهنوى ج۵ ص۳۴)

ترجمہ: اور ان (موضوع روایتوں) میں وہ روایت بھی ہے جس کو واعظ حضرات حسن محمدی کے ذکر میں بیان کرتے ہیں، کہ ایک رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ سے سوئی گر گئی اور وہ گم ہوگئی اور انہوں نے اس کو تلاش کیا مگر نہ ملی، اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے اور آپ کے دانتوں سے نور کی ایک شعاع نکلی جس کے ذریعہ حجرہ روشن ہوگیا اور اسی روشنی کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوئی دیکھ لی اور یہ اگرچہ معارج النبوۃ وغیرہ سیرت کی کتابوں میں جن میں رطب ویابس سب کچھ ہوتا ہے، مذکور ہے لیکن ان میں درج شدہ ہر چیز سے صرف وہی استناد کرے گا، جو سویا ہوا ہو یا اونگھ رہا ہو، مگر یہ روایت روایۃً اور درایۃً ثابت نہیں ہے۔

نیز یہ روایت صحاح ستہ کی صحیح روایات کے خلاف ہے، چنانچہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

> كنت أنام بين يدى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ورجلاى فى قبلته فإذا سجد غمزنى فقبضت رجلى وإذا قام بسطتهما، قالت: والبيوت يومئذليس فيها مصابيح. (بخاری: ج ۱ ص ۵۶)

ترجمہ: میں آپ کے سامنے سویا کرتی تھی اور میرے دونوں پاؤں آپ کے قبلہ کی طرف

ہوتے تھے جب آپ سجدہ کرتے تو مجھے ہاتھ سے ہلاتے، تو میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی اور جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پاؤں پھیلا لیتی اور گھروں میں اس زمانہ میں چراغ نہیں ہوتا تھا، تاکہ میرے پاؤں چھوڑ کر سجدہ فرماتے، سجدہ کے وقت جب ہاتھ میں میرا پاؤں لگ جاتا، پھر آپ ہلاتے تو میں پاؤں کو کھینچ لیتی۔

✿ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "لیس فیها مصابیح" کی شرح میں لکھتے ہیں:

أرادت به الاعتذار تقول لو كان فيها مصابيح لقبضت رجلي عند إرادة السجود ولما أحوجته إلى غمزى انتهىٰ.

(شرح مسلم: ج ۱ ص ۱۹۸، کذافی العمدة للعینی: ج ۴ ص ۱۱۴)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا "لیس فیها مصابیح" کے جملہ سے عذر پیش کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اگر گھروں میں چراغ کی (روشنی) ہوتی تو آپ کے سجدہ کے وقت میں اپنے پاؤں کو خود سمیٹ لیتی اور آپ کو مجھے ہاتھ سے ہلانے کی ضرورت پیش نہ آتی (اس وقت چونکہ گھر میں روشنی نہ تھی اندھیرا تھا لہٰذا پاؤں پر ہاتھ لگنے کے بعد میں کھینچ لیتی تھی)

خلاصہ یہ کہ آپ کی موجودگی میں بھی حجرہ میں اندھیرا رہتا تھا، اب اگر آپ کے نور سے سب جگہ روشنی ہوتی تو پھر اندھیری کی شکایت کیوں ہوئی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چراغ نہ ہونے کا عذر کیوں بیان کیا۔

تحقیق بالا سے ثابت ہوا کہ نور والی حدیث موضوع اور باطل ہے، ایسی حدیثوں سے تو عمل ہی ثابت کرنا مشکل ہے، پھر عقیدہ کو کیسے ثابت کیا جا سکے گا، لہٰذا اس روایت سے استدلال درست نہیں۔

بریلوی حضرات کی پانچویں دلیل

✿ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے، اور وہ یہ ہے:

وأما نوره عليه الصلوٰة والسلام فهو فى غاية من الظهور شرقًا وغربًا وأوّل ماخلق اللّٰه نوره وسماه فى كتابه نورًا. (موضوعات کبیر حدیث نمبر: ۱۱۰۵)

ترجمہ: بہر کیف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور شرقاً وغرباً غایت ظہور میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی کتاب میں نور سے موسوم فرمایا۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے بشر نہ تھے۔

جواب:- ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جس نور کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد حسّی نور نہیں، بلکہ معنوی نور مراد ہے، جس کو نورِ نبوت و رسالت اور نورِ ہدایت و شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو مشرق مغرب اور شمال سے جنوب تک پھیلا ہوا ہے، یعنی نورِ نبوت سے کفر و شرک اور ضلالت کا اندھیرا دور ہو کر ہدایت کے نور سے مشرق و مغرب تک منوّر ہو گئے ہیں، تو نور سے حسیّ نور مراد نہیں جو ہر ایک کو ظاہراً نظر آئے کیونکہ خود ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لكن هٰذا النور ليس له الظهور إلافي عين أهل البصيرة فإنهالاتعمى الأبصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور. (موضوعات كبير)

ترجمہ: یہ نور ظاہری نہیں اگر یہ حسی نور ہوتا تو یقیناً سب کو اس کا احساس ہوتا اور وہ کسی پر مخفی نہیں رہتا، بلکہ یہ نورِ، نورِ نبوت اور نورِ شریعت ہے، جس کی بصیرت، اہل بصیرت کو ہے جنکے سینے نورِ ہدایت سے منوّر ہیں، وہ اس کو محسوس کرتے ہیں۔

بریلوی حضرات کی چھٹی دلیل

بعض بریلوی حضرات کہتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ کا سایہ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے ورنہ بشر کا سایہ ہوتا ہے۔

چنانچہ (۱) خصائص الکبریٰ میں ہے:

أخرج الحكيم الترمذي من طريق عبدالرحمٰن بن قيس الزعفراني عن عبد الملك بن الوليد عن ذكو ان أن رسول الله صلى الله عليه وسلّم لم يكن يرىٰ له ظل في شمس ولاقمر الخ. (الخصائص الكبرىٰ: ج ۱ ص ۷۱)

(۲) جمع الوسائل میں ہے:

عن ابن عباس قال لم يكن لرسول الله صلى الله عليه وسلّم ظل ولم يقم مع شمس قط إلا غلب ضوئه على ضوء الشمس ولم يقم مع سراج قط إلا غلب ضوئه على ضوء السراج.

پس ان روایتوں سے ثابت ہوا کہ آپ ﷺ نور تھے بشر نہ تھے۔

آپ ﷺ کے سایہ نہ ہونے کی روایت کی تحقیق

جواب:- احادیث صحیحہ اور محدثین کرام کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا سایہ تھا، چنانچہ امام حاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحافظ متوفی ۴۰۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

أخبرني محمد بن المؤمل ثنا الحسن ثنا الفضل بن محمد البيهقي ثنانعيم بن حماد أنباعبدالله بن وهب أخبرني معاوية بن صالح عن عيسى بن عاصم عن زربن حبيش عن انس بن مالک قال بينما النّبي صلّى الله عليه وسلم يصلي ذات ليلة صلوٰةً إذمَدَّيَدَهُ ثم أخّرها فقلنا يارسول الله رأيناک صنعت في هذه الصلوٰة شيًا لم تكن تصنعه فيما قبله قال أجل إنه عرضت عليّ الجنّة فرأيت فيها دالية قطوفها دانيةفأردت أن أتناول منها شيئا فأوحى إليّ أن استاخر فاستاخرت وعرضت عليّ النار فيما بيني وبينكم حتى رأيت ظلي وظلكم فيها فأوميت إليكم أن استاخروا فأوحى إليّ أن أقرهم فإنک أسلمت وأسلموا وهاجرت وهاجروا وجاهدت وجاهدوا فلم أرلک فضلاً عليهم إلابالنبوة فاوّلت ذلک مايلقى أمتي بعدى من الفتن هذاحديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه. (مستدرک حاکم : کتاب الفتن والملاحم . قال الحاکم والذهبی صحیح: ج۴ص۴۵۶)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا پھر پیچھے ہٹالیا پس ہم نے کہا یارسول اللہ ہم نے آپ کو اس نماز میں ایسا کام کرتے دیکھا ہے، جو آپ نے اس سے قبل کبھی نہیں کیا فرمایا! ہاں بلاشبہ مجھ پر جنت پیش کی گئی تو میں نے اس میں اونچے درخت دیکھے جن کے گچھے نیچے کو جھکے ہوئے تھے، تو میں نے ارادہ کیا کہ ان سے کچھ لے لوں پس میری طرف وحی آئی کہ پیچھے ہٹ جا، سو میں پیچھے ہٹ گیا اور مجھ پر دوزخ بھی پیش کی گئی جو میرے اور تمہارے درمیان تھی، یہاں تک کہ اس کی آگ کی روشنی میں میں نے اپنا اور تمہارا سایہ دیکھا پس میں نے تمہیں اشارہ کیا کہ پیچھے ہٹ جاؤ، سو میری طرف وحی آئی کہ ان کو ان کی جگہ پر ٹکا رہنے دے، کیونکہ تو نے اسلام قبول کیا اور انہوں نے بھی، تو نے

بھی ہجرت کی اور انہوں نے بھی، تو نے بھی جہاد کیا انہوں نے بھی پس میں تیری ان پر بجز نبوت کے اور کوئی فضیلت نہیں دیکھتا پس میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ میری امت میرے بعد فتنوں میں مبتلا ہوگی۔

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ میں اپنا اور صحابہؓ کرام کا سایہ دیکھا ہے، پس اسی روایت سے ثابت ہوا کہ آپ کا سایہ تھا۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے اور اس سفر میں بعض دیگر ازواج مطہرات بھی آپ کے ساتھ تھیں، حضرت صفیہّ رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہوگیا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس اپنی ضرورت سے زائد اونٹ تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ صفیہ کا اونٹ بیمار ہے اے زینب اگر اُسے تم اپنا زائد اونٹ دیدو تو بہتر ہوگا، انہوں نے کہا کیا میں اس یہودیہ کو اونٹ دے دوں؟ ان کے نازیبا جواب سے آپ ناراض ہوگئے اور آپ ﷺ نے ذوالحجہ، محرم دو یا تین ماہ تک حضرت زینب کے پاس جانا ہی ترک کر دیا۔

قالت حتى يئست منه وحولت سريري قالت بينما أنا يومًا بنصف النهار إذا أنا بظل رسول الله صلى الله عليه سلم مقبلاً الخ (طبقات ابن سعد: ج ۷ ص ۱۲۶)

ترجمہ: حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ صفیہّ رضی اللہ عنہا کو طعنہ دینے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ پر ناراض ہوگئے تھے، میں آپ سے ناامید ہوگئی اور میں نے اپنی چارپائی وہاں سے ہٹادی، فرماتی ہیں کہ میں اسی حالت میں تھی کہ اچانک ایک دن دوپہر کے وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ دیکھا جو میری طرف آرہا تھا۔

حدیث مذکور سے ثابت ہوا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے آپ ﷺ کے تشریف لانے کا سایہ دیکھا ہے، پس آپ ﷺ کا سایہ تھا۔

حدیث بالا کے رواۃ کے احوال

(۱) عفان بن مسلمؒ صحاح ستہ کے راوی ہیں، امام عجلی نے ان کو ثقہ اور ثبت کہا ہے، امام ابوحاتم نے ثقہ اور متقن کہا ہے، علامہ ابن سعد نے ان کو ثقہ کثیر الحدیث ثبت اور حجت کہا ہے، امام ابن خراش نے ان کو ثقہ من خیار المسلمین کہا ہے، محدث ابن قانع نے ان کو ثقہ اور مامون کہا ہے، امام ابن حبّان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔ (تهذيب التهذيب: ج ۷ ص ۲۳۱)

(۲) حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ امام ذہبی نے ان کو الامام الحافظ اور شیخ الاسلام کہا ہے
(تذکرۃ حفاظ: ج ۱ ص ۱۸۸)

(۳) ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی صحاح ستہ کے مرکزی راوی ہیں، امام نسائی اور عجلی نے ان کو ثقہ کہا ہے، علامہ ابن سعد نے ان کو ثقہ اور مامون کہا ہے، امام ابن حبان نے ان کو ثقات میں شمار کیا ہے۔

(۴) شمیسہ رحمۃ اللہ علیہ حافظ ابن حجر نے لکھا کہ مقبولۃ من الثالثۃ یعنی تیسرے طبقے کے راویوں میں سے ہیں اور مقبول ہیں، ان پر کسی کی کوئی جرح منقول نہیں۔ (تقریب: ص ۴۷۳)

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وہ صحابیہ ہیں جو ازواج مطہرات میں سے اور سیدۃ اہل الجنۃ ہیں۔

تو مذکورہ بالا روایت کے سب راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت مسند احمد اور مجمع الزوائد میں بھی ہے، اس کے آخر میں الفاظ اسطرح ہیں۔

فلما كان شهر ربيع الأوّل دخل عليها فرأت ظله فقالت إن هذا لظل رجل ومايدخل علىّ النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم فمن هذا ؟ فدخل النبى صلى اللّٰه عليه وسلم. (مسند احمد: ج ۶ ص ۳۳۶، مجمع الزوائد: ج ۴ ص ۳۲۳)

ترجمہ: جب ربیع الاوّل کا مہینے آیا تو آپ ﷺ میرے پاس آئے، فرماتی ہیں کہ جب میں نے آپ کا سایہ دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ سایہ تو مرد کا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس نہیں آتے تھے، پس میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ میرے پاس آئے، میں نے آنکھوں سے آپ کو دیکھ لیا۔

مسند احمد کے رواۃ اور ان کے احوال

(۱) عبدالرزاقؒ کو محدثین کرام نے ثقہ کہا ہے (تذکرۃ الحفاظ: ۱/۳۳۱)

(۲) جعفر بن سلیمانؒ امام احمدؒ نے ان کو لا بأس بہ کہا ہے اور امام ابن معین نے ان کو ثقہ کہا ہے، علامہ ابن سعد نے ان کو ثقہ کہا ہے اور امام ابو احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو حسن الحدیث کہا ہے اور امام علی ابن مدینی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، امام بزار نے ان کو مستقیم الحدیث کہا ہے۔ (تہذیب التہذیب: ۲/۹۵)

(۳) ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ (ان کا ذکر گزر چکا ہے) (۴) شمیسہؒ (ان کا ذکر گزر چکا ہے)

(۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تو حضرت عائشہ ہیں۔

پس اس روایت کے جملہ راوی بھی ثقہ ہیں۔

ان صحیح روایتوں سے معلوم ہوا کہ آپ کا سایہ تھا، نیز جبکہ نصوص قطعیہ سے آپ کی بشریت اور انسانیت ثابت ہے تو بشریت کے تمام لوازمات آپ کے اندر تھے، سایہ کا انکار کرنا دراصل یہ شیعہ مذہب والوں کا عقیدہ ہے، جیسا کہ شیعہ کی مشہور کتاب "الکافی مع الصافی": (ج۳ ص۱۵۲) میں ہے "ولم یکن له فئی الخ" یعنی آپ کا سایہ نہ تھا، پس یہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ نہیں ہے، اب رہ گیا "خصائص الکبریٰ" اور "جمع الوسائل" کی روایتوں کا جواب کیا ہے؟ اب ان دونوں روایتوں کے جوابات ملاحظہ فرمایئے۔

ملاعلی القاریؒ اور امام سیوطیؒ کی روایتوں کا جواب

واضح رہے کہ آپ کے سایہ نہ ہونے کے بارے میں "خصائص الکبریٰ" اور "جمع الوسائل" کی روایتیں صحیح نہیں ہیں۔

"خصائص الکبریٰ" کی روایت کے رواۃ کے احوال ملاحظہ فرمایئے:

(۱) اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن قیس الزعفرانی نامی ایک راوی ہے امام ذھبی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

کان ابن مهدی یکذبه وقال أحمد: حدیثه ضعیف ولم یکن بشئ متروک الحدیث وقال النسائی: متروک الحدیث وقال زکریاء الساجی: ضعیف، وقال صالح بن محمد: کان یضع الحدیث قال ابن عدی: عامة مایرویه لایتابعه علیه الثقات. (تهذیب التهذیب: ج ٥ ص ١٦٤ و کذا فی تاریخ بغداد ج١ ص ٢٥٢)

ترجمہ: محدث کبیر امام عبدالرحمٰن بن مہدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو جھوٹا کہا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ للہ علیہ نے کہا کہ اس کی حدیث ضعیف ہے اور وہ محض ہیچ اور متروک الحدیث ہے، امام ابوزرعہؒ نے اسکو کذاب کہا ہے، امام مسلم بن الحجاجؒ نے فرمایا کہ وہ ذاہب الحدیث ہے، امام صالح بن محمدؒ نے فرمایا کہ وہ جعلی حدیثیں بنایا کرتا تھا، امام نسائیؒ نے فرمایا کہ وہ متروک الحدیث ہے، امام ساجیؒ نے فرمایا کہ وہ ضعیف ہے، محدث ابن عدیؒ نے فرمایا کہ ان کی اکثر احادیث میں ثقات نے ان کی متابعت نہیں کی۔

(۲) ملاعلی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ذکره الحکیم الترمذی فی نوادر الأصول عن عبدالرحمٰن بن قیس وهو مطعون عن عبدالملک بن عبداللّٰه بن الولید وهو مجهول عن ذکوان.

(شرح الشفاء: ج ۳ ص ۲۸۲)

ترجمہ: حکیم ترمذی نے اس روایت کو اپنی کتاب ’’نوادر الاصول‘‘ میں عبدالرحمٰن بن قیس کے طریق سے ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ عبدالرحمٰن مطعون ہے اور اس نے عبدالملک بن عبداللہ بن الولید سے روایت کی ہے اور وہ مجہول ہے اور اس نے ذکوان سے روایت کی ہے۔

(۳) شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’نوادر الاصول ‘‘اکثر احادیث غیر معتبر وارد۔ یعنی نوادر الاصول کی اکثر حدیث غیر معتبر ہیں۔

(بستان المحدثین: ص ۶۸)

(۴) ذکوان تابعی ہیں ان کی براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت وسماعت نہیں ہے، پس یہ حدیث مقطوع ہے اور حاکم کی روایت حدیث مرفوع اور صحیح ہے۔

لہٰذا عبدالرحمٰن بن قیس کی روایت حاکم کی روایت کے مقابلہ میں قابل حجت اور لائق استدلال نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ ہونے کی روایت قوی اور صحیح ہے اور سایہ نہ ہونے کی روایت ضعیف اور باطل ہے، لہٰذا جب آپ کے نور ہونے کا معنی واضح ہوگیا، تو اس سے ثابت ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باعتبار خلقت وپیدائش کے بشر بن بشر حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے ایک بیٹے تھے، آپ کو نور نبوت ورسالت اور شریعت سے منوّر کر کے مبعوث کیا گیا ہے، اس لحاظ سے آپ نور اور صاحب نور تھے، اس کی طرف بعض آیتوں اور حدیثوں میں اشارہ کیا گیا ہے، مگر بریلوی حضرات نادانی میں یا حقیقت کو چھپاتے ہوئے خود بھی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں اور عامۃ الناس کو بھی گمراہ کرنے کیلئے تلے ہوئے ہیں، آپ ﷺ کے نور اور صاحب نور کی نصوص اور روایات کی غلط تاویلات کر کے آپ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں، یہ ان کی بڑی جہالت اور بہت بڑی گمراہی ہے اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت نصیب فرماوے اور سب مسلمانوں کو ان کی جہالت اور ضلالت سے محفوظ فرمائیں۔

ونسئله عزوجل أن يعصمنا والمسلمين جميعاً من طاعة الهوى والشيطان إنه على كل شيئ قدير ولاحول ولاقوة إلاباللّٰه العلىّ العظيم . والحمد للّٰه رب العالمين . وصلى اللّٰه عليه وسلم واله وصحبه أجمعين .

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ
۲۰؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۰؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

قال اللّٰہ تعالیٰ :

قل لایعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب إلا اللّٰہ۔ (الآیة)

واللّٰہ لاادری و أنا رسول اللّٰہ ما یفعل بی ولابکم (الحدیث)

آپ ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا عقیدہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

آپ ﷺ کا ہر جگہ حاضر وناظر ہونے کا عقیدہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

- قرآن کی روشنی میں آپ ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا عقیدہ رکھنا باطل ہے۔
- حدیث کی روشنی میں آپ ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا عقیدہ رکھنا باطل ہے۔
- اس بارے میں فقہائے کرام کے اقوال اور ارباب فتاویٰ کے فتاویٰ۔
- اس بارے میں فقہ اکبر کا فتویٰ۔
- آپ ﷺ کا کسی محفل میلاد میں حاضر ہونے کا دعویٰ کرنا روایۃً ودرایۃً باطل ہے۔

آپ ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا عقیدہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

(۱۷) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہم چند افراد ایک مسجد میں تبلیغی جماعت کی نسبت سے گئے وہاں کے خطیب صاحب بریلوی مسلک کے ہیں، خطیب صاحب نے نماز جمعہ کے بعد مروّجہ میلاد و قیام کیا اکثر مقتدیوں نے بھی قیام کیا، ہم لوگوں نے قیام نہیں کیا، پھر خطیب صاحب غصّہ ہو کر کہنے لگے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، حق تعالیٰ نے اپنا سارا علم غیب آپ کو عطا فرما دیا تھا، آج بھی ہر شخص کی ظاہری اور باطنی بھلائی اور بُرائی سے وہ واقف ہیں حتیٰ کہ مچھر کے پر ہلانے کا بھی آپ کو علم ہو جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بالذات ہر ایک کی آواز سن لیتے ہیں، خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں، اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والا کافر ہے الخ۔

بعد میں ہم لوگ وہاں سے آگئے لیکن دل میں وسوسہ رہا کہ خطیب صاحب نے تو آپ ﷺ کو عالم الغیب نہ جاننے والوں کو پکا کافر ہونے کا حکم لگا دیا ہے، اب اس بارے میں شرعی تحقیقی فتویٰ چاہیئے نیز اب سوال یہ ہے کہ: (الف) ایسا عقیدہ رکھنے والا مسلمان ہے یا کافر اور ان سے مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جائے یا کافروں جیسا؟ (ب) ایسے آدمی کی اقتداء میں نماز درست ہے یا نہیں؟ (ج) اس کا ذبیحہ حلال ہے یا حرام؟ (د) مسجد کی انتظامیہ کمیٹی اگر اس کو سبکدوش نہ کرے تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے یا نہیں؟۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ علم غیب بالذات خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے علم کے برابر کسی مخلوق کو علم نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو اپنی خدائی میں شریک کیا ہے، جسطرح وہ اپنی ذات میں یکتا ہے، اسی طرح صفات میں بھی یکتا ہے، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علم میں اللہ تعالیٰ کے مانند کسی کو شریک ٹھہرائے بلاشبہ یہ خالص شرک ہے، ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے، اگر تجدید ایمان اور توبہ نہیں کرتا، تو وہ مشرک ہو کر مرے گا، جہنمی ہوگا، جن نصوص میں مخلوق سے علم غیب کی نفی کی گئی ہے، وہاں مطلق علم غیب مراد ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی علم ہے اور جہاں اثبات ہے وہاں اللہ تعالیٰ کے خبر دینے

سے علم غیب کی بعض باتیں معلوم ہو جانا مراد ہیں اور یہ عطائی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاشبہ بے شمار غیب کی باتوں کا علم بذریعۂ وحی حاصل ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں کم، تھوڑا اور متناہی ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات جیسے غیر محدود ہے آپ کا علم بھی غیر محدود ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی سمندر کے پانی کیطرح ہے، مخلوق اور بشمول نبیوں کا علم قطرہ پانی کے برابر ہے اور یہ علم عطائی ہے، البتہ خداوند قدوس نے جس قدر علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا ہے بلاشبہ وہ علم تمام مخلوق سے خواہ وہ فرشتہ ہو یا نبی یا غوث یا قطب اور جن وانسان سب سے بڑھ کر ہے، اس صفت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مثل کوئی نہیں ہے، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر علم دیا گیا ہے، اس کی نسبت باقی مخلوق کے علم کی نسبت بھی دریا اور کوزہ کے پانی کی طرح ہے، ان باتوں کو وہی سمجھے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کی فہم اور سمجھ دی ہے ورنہ اندھا جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔ فللّٰہ الحمد

اب ان باتوں پر قرآنی نصوص ملاحظہ کی جائیں

(۱) وعندہ مفاتح الغیب لایعلمہا إلاھو. (انعام. ۵۹)

ترجمہ: اور اس کے (یعنی اللہ تعالیٰ کے) پاس ہیں خزانے تمام مخفی اشیاء کے ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔

(۲) قل لایعلم من فی السمٰوٰت والارض الغیب إلااللّٰہ (نمل. ۶۵)

ترجمہ: آپ لوگوں کو کہہ دیجئے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمینوں میں موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے۔

(۳) وللّٰہ غَیبُ السّمٰوٰت والارض (نحل۔۷۷)

ترجمہ: اور آسمانوں کی (تمام) پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے ساتھ خاص ہیں۔

(۵) لَوْ کُنْتُ أَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَامَسَّنِیَ السُّوْءِ. (اعراف: ۱۸۸)

ترجمہ: (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں) اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کرلیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی۔

(۶) قل ماکنت بدعًا من الرسل وما ادری مایفعل بی ولابکم (اعقاب: ۹)

ترجمہ: آپ انکو کہدیں میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جاویگا اور نہ یہ معلوم کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائیگا۔

مذکورہ بالا آیتوں کے مطالعہ کرنے کے بعد ہر ذی عقل آدمی سمجھ سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام غیب کی باتوں کو جانتے نہیں تھے صرف اللہ تعالیٰ نے جس قدر وحی کے ذریعہ بتایا ہے وہ جانتے تھے۔

اب چند احادیث لیجئے

(۱) صحیح بخاری شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

واللّٰہِ لاَادری واللّٰہِ لاَاَدرِیُ وَأنَارَسول اللّٰہ ما یفعل بی ولابکم.

(رواہ البخاری عن ام العلاء، مشکوٰۃ ، کتاب الرقاق، باب البکاء والخوف : ج۲ ص ۴۵۶)

ترجمہ: خدا کی قسم مجھے علم نہیں خدا کی قسم مجھے علم نہیں کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔

(۲) عن الربیع بنت معوّذبن عفراء قالت جاء النّبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فدخل حین بنی علیّ فجلس علی فراشی کمجلسک منی فجعلت جویریات لنا یضربن الدف ویندبن من قتل من آبائی یوم بدر اذ قالت إحد اھن وفینا نبی یعلم مافی غدفقال دعی ھذہ وقولی بالذی کنت تقولین رواہ البخاری .

(بحوالۃ مشکوٰۃ ، کتاب النکاح ، باب اعلان النکاح : ج۲ ص ۲۷۱)

ترجمہ: حضرت ربیع بنت معوّذ بن عفراء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں جب میں (نکاح کے بعد) اپنے شوہر کے گھر رخصت ہوکر آئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے اور میرے بستر پر اسی طرح بیٹھ گئے جس طرح تم میرے بستر پر بیٹھے ہو (ربیع نے یہ بات حضرت خالد بن ذکوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہی جنہوں نے یہ روایت نقل کی ہے) اور ہمارے خاندان کی بچیوں نے (جو اس وقت ہمارے گھر میں موجود تھیں) دف بجانا شروع کیا اور ہمارے آباء میں جو لوگ بدر کے دن شہید ہوگئے تھے ان کی خوبیوں اور شجاعت پر مشتمل اشعار پڑھنے لگیں اس دوران ایک بچی نے یہ کہا کہ "ہمارے درمیان وہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جو کل کو ہونے والی بات کو جانتے ہیں"، یعنی مستقبل کی باتیں جانتے ہیں تو فوراً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹوکا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس بات کو چھوڑ دو (یعنی اس قسم کی باتیں نہ کہو) بلکہ وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں۔

غرض: بچیوں نے جب اس طرح اشعار پڑھے جس میں غیب جاننے کی باتیں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا کہ غیب جاننے کی باتیں نہ کہو باقی اشعار پڑھو۔

(۳) حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

قَالَ رَسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم إنی فرطکم علی الحوض من مر علیّ شرب ومن شرب لم یظمأ أبداً لیردن علیّ أقوام أعرفهم ویعرفوننی ثم یحال بینی وبینهم فأقول إنهم منی فیقال إنک لاتدری ماأحدثوا بعدک فأقول سحقًا سحقًا لمن غیّر بعدی متفق علیه .

(مشکوۃ ، کتاب الفتن ، باب الحوض الشفاعة: ج ۲ ص ۴۸۷)

ترجمہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں حوض کوثر پر تمہارا امیر سامان ہوں گا یعنی وہاں تم سب سے پہلے پہنچ کر تمہارا استقبال کروں گا جو شخص بھی میرے پاس سے گزرے گا وہ اس حوض کوثر کا پانی پیئے گا اور جو شخص بھی اس کا پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہیں رہے گا وہاں میرے پاس میری امت کے کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے پہچان لیں گے لیکن میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل کر دی جائے گی (تاکہ وہ مجھ سے اور حوض کوثر سے دور رہیں) میں (یہ دیکھ کر) کہوں گا کہ یہ لوگ میرے اپنے ہیں یعنی یہ لوگ میری امت کے افراد ہیں، پھر ان کو میرے پاس آنے سے کیوں روکا جارہا ہے، اس کے جواب میں مجھے بتایا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی باتیں پیدا کیں ہیں (یہ سن کر) میں کہوں گا کہ جو کوئی میرے دین میں نئی بات پیدا کرنے والا ہو وہ مجھ سے دور رہے، وہ مجھ سے دور رہو، خدا کی رحمت سے دور ہے جس میری وفات کے بعد دین وسنت میں تبدیلی کی۔

(۴) عن مسروق عن عائشة رضی اللّٰه عنها من حدثک أن محمدًا رای ربّه فقد کذب وهو یقول لاتدرکه الأبصار ومن حدثک أنه یعلم الغیب فقد کذب وهو یقول لایعلم الغیب إلا اللّٰه .

(صحیح البخاری، کتاب الرد علی الجمهیة وغیرهم التوحید ، باب قوله تعالیٰ اللّٰه عالم الغیب فلایظهر علی غیبه ۲/ ۱۰۹۸)

(۵) عن عائشة رضی اللّٰه عنها قالت من أخبرک أن محمدًا ﷺ یعلم

الخمس التی قال اللّٰہ تعالیٰ ان اللّٰہ عندہ علم الساعة وینزل الغیث فقد اعظم الفریة (مشکوٰۃ: باب رؤیة اللہ تعالیٰ ج ۲ ص ۵۰۱)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ کوئی آدمی اگر تم سے یہ کہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کی تاریخ کا علم ہے یا آپ کو بارش ہونے کا علم ہے یا حمل کا علم ہے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی یا آنے والے کل کی بات کا علم ہے یا یہ علم ہے کہ انسان کہاں مرے گا، وہ آدمی بڑا ہی جھوٹا ہے (بخاری شریف)

علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس حیات بابرکات کے ہزاروں واقعات ایسے ہیں جو صاف پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ آپ ﷺ ہر علم غیب سے آگاہ نہیں تھے۔

نمونے کے طور پر کچھ واقعات بھی پڑھ لیجئے۔

(۶) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت باندھنے کا واقعہ مشہور ہے، محبوب رب العالمین کی محبوبہ بیوی جو کہ الزام سے بری تھیں ان پر بعض لوگوں نے تہمت لگائی اور بعض دوسروں نے اس کی تشہیر کی جس پر آپ ﷺ پریشان ہوئے پھر آپ نے واقعہ کی تحقیق و تفتیش میں ہر چند کوشش کی، بڑے بڑے صحابیوں سے مشورہ بھی کیا لیکن صحیح بات آپ کو معلوم نہ ہو سکی، آپ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو اپنے والدین کے گھر جانے کی اجازت دی پھر مکمل ایک ماہ کے بعد وحی کے ذریعہ حق تعالیٰ نے واقعہ کی اصلیت آپ بتا دی قرآن حکیم کی آیات کے ذریعہ آپ کی برأت کا اعلان کیا کہ عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کا دامنِ عصمت بالکل پاک صاف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکمل ایک ماہ تک کچھ پتہ نہ چلا جس کی بنا پر بے حد پریشانی ہوئی مگر وحی کے ذریعہ مسئلہ کا علم ہوا اور آپ کی پریشانی دور ہوئی لہٰذا اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کا علم نہ تھا ورنہ لوگوں سے حضرت عائشہؓ کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت کیا تھی آپ ﷺ کو پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں۔

(۷) سورۂ تحریم کے شان نزول کے بارے میں مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد بہت مرغوب تھا آپ اکثر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس جا کر شہد پیتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے جس سے آپ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر جانا کم ہو جائے آخر کار یہ بات طے پائی کہ آپ جس کسی کے پاس بھی تشریف لائیں وہ آپ سے یہ کہہ دے کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے آپ فرمائیں گے کہ میں شہد پی کر آ رہا ہوں تو پھر یہ جواب دیا جائے کہ ضرور شہد کی مکھیاں مغافیر پر بیٹھی ہوں گی چونکہ آپ کو بد

بو سے سخت نفرت ہے اس لئے آپ شہد پینا بند فرمادیں گے اور ہمارا مقصد حاصل ہوجائے گا آخر کار آپ ﷺ سے ایسا کہا گیا پھر آپ نے قسم کھالی کہ کبھی شہد نہیں پیوں گا، اس پر سورۂ تحریم کی یہ آیات نازل ہوئیں "یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآاَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ الخ. (تحریم)

یہاں پر بھی ازواج مطہرات کی جانب سے جو مغافیر استعمال کرنے کا الزام تھا اس بارے مین آپ ﷺ کو یہ علم نہ ہوسکا کہ ازواج مطہرات کی طرف سے بنائی ہوئی ترکیب تھی اگر آپ کو غیب کا علم ہوتا تو آپ فوراً بتادیتے کہ یہ تمہارا بنایا ہوا حیلہ ہے۔

(۸) بیرَ معونہ کا واقعہ جسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے آپ ﷺ سے آکر کہا کہ چند علماء کو ہمارے ساتھ کردیا جائے جو ہماری قوم کو دینی باتیں سکھائیں اگر ہماری قوم مسلمان ہوجائے گی تو ہم بھی مسلمان ہوجائیں گے آپ نے ستر ۷۰ جلیل القدر صحابۂ کرام کو جو قاری قرآن تھے ان کے ساتھ کردیا راستہ میں ان کے لوگ جمع تھے جب حضرات صحابۂ کرام وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے صحابۂ کرام کو شہید کردیا، دیکھئے کفار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دیکر علمائے صحابہ کی جماعت کو لیجاکر شہید کردیا، مگر آپ ﷺ کو پہلے سے پتہ نہ تھا اگر پتہ ہوتا تو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا تھا آپ ﷺ صحابۂ کرام کو وہاں نہ بھیجتے پھر لیجانے کے بعد قتل کا علم آپ ﷺ کو غیب کے علم سے نہ ہوا بلکہ صحابۂ کرام کی اطلاع دینے سے ہوا، آپ ﷺ نے اس واقعہ کی اطلاع پر انتہائی رنج وغم اور حسرت وافسوس کا اظہار کیا اور ایک مہینہ تک نماز میں ان بدعہد کافروں پر بددعا بھی فرمائی (بخاری)

مذکورہ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں تھے، آپ اللہ کے رسول اور بندہ ہیں جو باتیں بتائی جاتیں انکا علم آپ کو ہوجاتا تھا۔

اس بارے میں فقہائے کرام کے اقوال وفتاویٰ

(۱) قال فی الفتاوی القاضی خان. رجل تزوج امراة بغیر شهود فقال الرجل والمرأة خدا و پیغمبر را گواه کردیم قالوا یکون کفرًا لأنه اعتقد أن رسول الله صلی الله علیه وسلم یعلم الغیب وهو ما کان یعلم الغیب فی الحیوة کیف بعد الموت. (قاضی خان، باب مایکون کفرا من المسلم ومالا یکون: ج۴ص ۱۶۰)

ترجمہ: اگر کسی نے بلاگواہان شرعی کے نکاح کرلیا اور نکاح کے وقت یہ کہا کہ میں نے خدا

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنالیا تھا، تو اس کے کہنے ہی سے کفر لازم آگیا، کیونکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں غیب داں ہونے کا اعتقاد رکھا حالانکہ آپ ﷺ تو زندگی میں غیب داں تھے نہیں، پھر وفات کے بعد کس طرح غیب داں بن گئے تا کہ یہ کہنا جائز ہو کہ خدا کے ساتھ رسول بھی گواہ بن جائیں

(۲) علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قلت: وحاصله أن دعوى علم الغيب معارضة لنص القرآن فيكفر بها ......و كذا لو أسنده إلى أمارة عادية بجعل اللّٰه تعالىٰ.

(فتاویٰ شامیة ، باب المرتد مطلب فی دعوی علم الغیب: ج۴ص ۲۴۳)

ترجمہ: حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علم غیب رکھنے کا دعویٰ نصوص قرآنی کے خلاف ہے ایسے مدعی کو کافر قرار دیا جائیگا اس طرح جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے سب علمِ غیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیدیا تھا اس کو بھی کافر قرار دیا جائیگا۔

(۳) فقہ اکبر کی شرح میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

اعلم أن الأنبياء لم يعلموا المغيبات من الأشياء إلا ما أعلم اللّٰه تعالىٰ أحيانًا وذكر الحنفية تصريحاً بالتكفير باعتقاد أن النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم يعلم الغيب لمعارضة قوله تعالىٰ: " قُلْ لَايَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ". (ص ۱۸۱)

ترجمہ: یقین سے مانو انبیاء علیہم السلام غیب کی باتیں نہیں جانتے تھے مگر جس قدر اور جب کبھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے بعض باتیں بتائیں، حنفیہ نے صراحت سے اس شخص کو کافر کہا ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ آپ ﷺ غیب داں ہیں کیونکہ قرآن کی آیت "قُلْ لَایَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ إِلَّا اللّٰهُ" کی آیت اس کے عقیدے کو باطل بتارہی ہے۔

(۴) قال فی "البزازية": تزوج بلاشهود و قال رسول خدای دراو فرشتگاں را گواه كردم يكفر لأنه اعتقد أن الرسول والملک يعلمان الغيب بخلاف قوله فرشتگاں دست راست ودست چپ را گواه كردم لأنهما يعلمان.

(البزانیة على هامش الهندیه : ج٦ ص ۳۲۵)

(۵) صاحب محیط فرماتے ہیں:

قال فی المحیط البرهانی : تزوج امراة بشهادة اللّٰه ورسوله لایجوز ، لأن هذ النكاح لم یحضره الشهود وعن أبی القاسم الصفار رحمه اللّٰه تعالیٰ أنه قال : یكفر من فعل هذا: لأنه اعتقدأن رسول اللّٰه علیه السلام عالم الغیب

(کتاب النکاح، الفصل السابع : فی الشهادة فی النکاح : ج ۴ ص ۳۷ رقم: ۳۵۶۳، ط: ادارة القرآن)

(٦) صاحب بحر علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

قال فی الخانیة والخلاصة : لوتزوج بشهادة اللّٰه ورسوله لاینعقد ویكفر لاعتقاده أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یعلم الغیب.

(البحر الرائق: کتاب النکاح : ج ۳ ص ۸۸)

ترجمہ: جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کو گواہ بنا کر نکاح کریگا اس کا نکاح تو منعقد نہیں ہوگا (کیونکہ قرآن وحدیث نے بالغ مسلمان لوگوں میں سے دو گواہ کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم دیا ہے اور اس نے بدون دو گواہ کے نکاح کیا) پھر اس آدمی نے خدا کے ساتھ رسول کو گواہ بنایا اس کو غیب داں سمجھا اس لئے کافر بھی ہو جائیگا۔

پس مذکورہ بالا حوالہ جات سے صاف معلوم ہو گیا کہ بلاشبہ یہ عقیدہ رکھنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں ہیں یا یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا سارا علمِ غیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرما دیا ہے اب اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں کوئی فرق نہیں ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات کے جزئی اور کلی حالات سے واقف ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود ہمارے سارے اقوال واحوال کو خواہ کہیں بھی ہوں سب جانتے، سنتے اور دیکھتے ہیں ایسے عقائد خالص کفر وشرک کے سوا کچھ نہیں ہے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فقہائے احناف کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ حنفیوں نے صاف صاف فتویٰ دیا ہے کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیب دانی کا عقیدہ رکھے وہ کافر ہے۔

پس صورت مسئولہ میں خطیب صاحب کا عقیدہ قرآن وحدیث اور اہل سنت والجماعت کے عقیدہ کے خلاف ہے اور اس قسم کا عقیدہ رکھنے والا آدمی کافر ہے، (العیاذ باللّٰہ من ذلک) اس پر تجدید ایمان اور تجدید نکاح لازم ہے، جبتک وہ تجدید ایمان اور تجدید نکاح اور توبہ نہیں کرتا تو اس کی اقتداء میں نماز درست نہیں ہے اور اس کا ذبیحہ بھی حرام ہے، کمیٹی پر ضروری ہے کہ اس کو سبکدوش کر کے صحیح عقائد والے متقی عالمِ دین کو خطیب مقرر کریں ورنہ کمیٹی کو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے جواب دہی کرنی ہوگی

اور سب عنداللہ وعندالناس مجرم ثابت ہوں گے۔ ھذا طریق لأ ھل السنۃ والجماعۃ وسواہ طریق الخروج عن الدین وطریق البدعۃ والضلالۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۵/رجب المرجب ۱۴۲۶ھ	۵/رجب المرجب ۱۴۲۶ھ

آپ ﷺ کا ہر جگہ حاضر و ناضر ہونے کا عقیدہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

(۱۸) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک بدعتی عالم صاحب نے کہا کہ وہ لوگ جب محفل میلاد میں درود شریف پڑھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفل میلاد میں حاضر ہوتے ہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم سے وہ لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک عالم صاحب نے دریافت کیا مجلس میلاد میں آپ ﷺ کا آنا کیسے معلوم ہوتا ہے تو بدعتی عالم صاحب نے کہا اس کا ثبوت حدیث شریف میں ہے۔ اب چند سوالات پیدا ہوئے:

(۱) آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ وسلام سننے کے لئے محفل میلاد میں حاضر ہوتے ہیں یا نہیں؟

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر شریف سے نکل کر اور کہیں جاتے ہیں یا نہیں؟

(۳) معجزہ کے طور سے کبھی آپ کا ﷺ قبر شریف سے نکل کر کسی محفل میں شریک ہونا ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی محفل میلاد میں حاضر ہونے کا دعویٰ کرنا روایۃً ودرایۃً باطل و بے اصل ہے۔

روایۃً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم درود وصول کرنے کے لئے کہیں نہیں جاتے اگر کسی کا دعویٰ ہے تو دعویٰ بلا دلیل ہے اور یہ آپ کی توہین ہے بلکہ اس کے خلاف یہ ثابت ہے کہ مؤمن جب اللہ کے نبی پر درود پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بواسطۂ فرشتوں کے روضۂ اقدس میں پہنچاتا ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

(۱) عن ابن مسعود رضی اللّٰہ عنه قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم

إن لله ملائكة سياحين فی الأرض يبلغوننی من أمتی السلام رواه النسائی والدّارمی. (مشكوٰة :باب الصلوٰة علی النبی ﷺ وفضلها: ج ۱ ص ۸۶)

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے زمین پر گشت کرتے ہیں یہی فرشتے مجھ تک میری امت والوں کی طرف سے سلام پہنچاتے ہیں۔

(۲) عن أبی هريرة رضی الله عنه قال سمعت رسول الله صلی الله عليه وسلم يقول...... صلوا علیّ فإن صلاتكم تبلغنی حيث كنتم رواه النسائی.
(مشكوٰة ،باب الصلوٰة علی النبی ﷺ وفضلها: ج ۱ ص ۸۶)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: تم لوگ مجھ پر درود بھیجتے رہو، کیونکہ تم جہاں کہیں بھی ہوگے (اور وہاں درود بھیجوگے تو) تمہارا درود مجھ تک پہنچے گا۔

(۳) عن أبی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم من صلی علیّ عندقبری سمعته ومن صلی علیّ نائبا أبلغته رواه البيهقی فی شعب الإيمان. (مشكوٰة ،باب الصلوٰة علی النبی ﷺ وفضلها: ج ۱ ص ۸۷)

ترجمہ: حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود بھیجے، میں خود اس کو سنتا ہوں اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے وہ میرے پاس پہنچادیا جاتا ہے۔

(۴) عن أوس بن أوس قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم إن أفضل أيامكم يوم الجمعة...... فأكثروا علیّ من الصلوٰة فيه فإن صلاتكم معروضة علیّ .... رواه أبو داؤد والنسائی وابن ماجة والدارمی والبيهقی فی الدعوات الكبير. (مشكوٰة: باب الجمعة ج ۱ ص ۱۲۰)

ترجمہ: حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کا دن تمہارے افضل ترین دنوں میں سے ہے پس تم لوگ اس دن میں مجھ پر درود کثرت سے بھیجا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

(۵) عن عماربن ياسر رضی الله عنه قال؟ النبی صلی الله عليه وسلم إن الله

وَكَّلَ بقبري ملكاً أعطاه الله أسماع الخلائق فلايصلي عليّ أحدٌ إلى يوم القيامة إلا أبلغني باسمه وإسم أبيه فلان بن فلان قدصلى عليك (رواه البزار)

ترجمہ: حضرت عمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا فرشتہ مقرر فرما دیا ہے جس کو تمام مخلوق کی باتیں سننے کی طاقت عطا فرمائی وہ میری قبر پر رہے گا، پس جب کوئی شخص قیامت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہے تو وہ فرشہ کہتا ہے اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فلاں کے بیٹے فلاں نے آپ پر درود پڑھا ہے۔

مذکورہ روایتوں سے ثابت ہوگیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم درود وسلام کے لئے کہیں نہیں جاتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان واحترام کا لحاظ کرتے ہوئے درود شریف آپ تک پہنچانے کے لئے فرشتے مقرر کردیئے ہیں، لہٰذا بدعتی عالم صاحب کا کہنا کہ محفل میلاد میں آپ ﷺ آتے ہیں دعویٰ بلا دلیل ہے اور حدیث کا حوالہ دینا اٹکل سے بات کرنا ہے حضور ﷺ پر غلط بیانی اور افترا پردازی ہے۔

درایۃً: امت کا درود وسلام بھیجنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیواسطے بمنزلہ ہدیہ ہے اور ہدیہ کے آداب میں ہے کہ اگر ادنیٰ آدمی اپنے اعلیٰ حضرت کو ہدیہ دینا چاہے تو وہ خود اپنے اعلیٰ حضرت کے دربار میں حاضر ہوکر یا اور کسی کے ذریعہ عاجزی وانکساری سے ہدیہ پیش کرے جیسے بیٹا اپنے باپ کو، شاگرد اپنے استاد کو، مرید اپنے پیر کو، ہدیہ دیتے ہیں، اس کے برعکس خلاف ادب ہے یعنی بیٹا باپ کو یا شاگرد استاد کو یا مرید پیر کو یہ کہے کہ وہ ہدیہ کے واسطے ہمارے پاس آئیں، ایسا کہنا خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا خلاف عقل اور خلاف ادب اور خلاف تعظیم بھی ہے۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دورود بھیجنے کا مسئلہ بھی ایسا ہے کہ آپ کا درود وسلام کے لئے خود حاضر ہونے کا عقیدہ رکھنا بھی بے ادبی اور گستاخی ہے (نعوذ باللہ من ذالک) نیز آپ ﷺ کا محفل میلاد میں حاضر ہونے کا معنی تو یہی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے درود وسلام کے محتاج ہیں، حالانکہ جمیع امت بذریعۂ درود گناہ کی معافی اور مستحق رحمت کے محتاج ہیں۔

فلہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی محفل میلاد میں حاضر ہونے کا دعویٰ کرنا، عقیدہ رکھنا، روایۃً ودرایۃً باطل اور بے اصل ہے، اس قسم کے عقیدۂ فاسدہ سے پرہیز کرنا ہر مسلمان پر ضروری ولازم ہے۔

جواب (۲):- رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم روضۂ اطہر میں باحیات ہیں اور قیامت تک روضۂ اقدس میں باحیات رہیں گے، وہاں سے کہیں جانا نصًا ودرایۃً ثابت نہیں، اس لئے یہ عقیدہ باطل ہے۔ چنانچہ

حدیث شریف میں ہے:

(۱) عن أبی سعید قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولافخر وبیدی لواء الحمد ولافخر ومامن نبیّ یومئذ اٰدم فمن سواہ إلاتحت لوائی وأنا اوّل من تنشق عنہ الارض ولافخر رواہ الترمذی.

(مشکوٰۃ: باب فضائل سید مرسلین ﷺ: ج۲ ص ۵۱۳)

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن میں تمام نبیوں کا سردار بنوں گا اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا (قیامت کے دن مقام محمود میں) حمد کا جھنڈا میرے ہاتھ میں ہوگا اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا اس دن کوئی بھی نبی خواہ وہ آدم ہوں یا اور ہو ایسا نہیں ہوگا جو میرے جھنڈا کے نیچے نہیں آئے گا اور قیامت کے دن سب سے پہلے میں اٹھوں گا اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔

حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ جس روضۂ اقدس میں آپ ﷺ مدفون ہیں قیامت کے روز وہاں سے نکلیں گے اس سے پہلے نہیں۔

(۲) عن أبی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أنا سید ولد آدم یوم القیامۃ وأوّل من ینشق عنہ القبر وأوّل شافع و أوّل مشفع رواہ مسلم

(مشکوٰۃ: باب فضائل سید المرسلین ﷺ: ج۲ ص ۵۱۱)

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں تمام اولاد آدم کا سردار ہونگا، اور سب سے پہلے قبر سے میں ہی اٹھوں گا نیز سب سے پہلے شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول ہوگی۔

(۳) وفی روایۃ جامع الأصول عنہ (أبی ھریرۃ) أنااوّل من تنشق عنہ الأرض فأکسی.

(مشکوٰۃ: باب فضائل سید المرسلین ﷺ: ج۲ ص ۵۱۴)

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور میں باہر آؤں گا پھر مجھے ایک جنتی جوڑا پہنایا جائے گا۔

حدیث بالا سے واضح ہوا کہ سب سے پہلے آپ ﷺ قبر شریف سے قیامت کے روز نکلیں گے اور دوسرے لوگ بعد میں نکلیں گے۔

(۴) من نبیہ بن وھب أن کعبًا دخل علی عائشۃ فذکروا رسول اللّٰہ صلی

اللّٰہ علیه وسلم فقال كعب مامن فجر يطلع إلانزل سبعون الفًا من الملائكة حتى يحفون يضربون بأجنحتهم يصلون على النّبى صلّى اللّٰه عليه وسلم سبعون الفًابالليل وسبعون الفًا بالنهارحتى إذاانشقت عنه الأرض خرج فى سبعين الفامن الملائكة يزفون . (رواه ابن كثير فى تفسيره ج ۳ص ۵۱۷)

مذکورہ بالاروایتوں سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک روضۂ اطہر میں رہیں گے اور قیامت کے روز پہلی مرتبہ آپ قبر سے نکلیں گے پس درود وسلام کے لئے آپ کے قبر شریف سے نکلنے کا عقیدہ رکھنا آپ کے مقام نبوت ومقام استراحت کے ساتھ بڑی گستاخی کے سوااور کچھ نہیں بطور معجزہ نکلنے کا دعویٰ بلادلیل ہے، احادیث وروایات سے کہیں اس کا ذکر نہیں ملتا، پھر اگر کوئی ضد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حدیث میں ہے، تو یہ شخص جھوٹا اور مفتری ہے، حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنے والے کیلئے سخت وعید آئی ہے، چنانچہ:

من كذب علىّ متعمدًا فليتبوء مقعده من النار. متفق عليه

(یہ حدیث کتب ستہ میں موجود ہے) (بحوالہٗ مشکوۃ کتاب العلم ج ا ص ۳۲)

یعنی جو شخص میری طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرے اس کو چاہئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بناوے۔ فلہٰذا رسول اللہ صلی اللہ وسلم پر اس قسم کے معجزہ کا دعویٰ کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے جو کہ موجب کفر اور گمراہی ہے۔

واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب وهو الهادى إلى سواء السّبيل .

الجوب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۲۵ھ

* * *

فَصْلٌ فِی الْفِرَقِ الْبَاطِلَةِ

(۱۹) سوال:- جناب مفتی صاحب! میری بیٹی کے نکاح کے سلسلہ میں ایک لڑکے سے بات ہوئی، لڑکے نے خود اپنے والد صاحب کے ہمراہ بیٹی کو دیکھا، بیٹی اُسے پسند آئی، اس نے سونے کی ایک انگوٹھی بھی دیدی اور ہماری دعوت دی، میں اپنے دو بیٹے اور چند دوستوں کو لیکر ان کے ہاں گیا، اور ظہر کی نماز پڑھی پھر کھانا پینا کیا، بات یہ ہے کہ واپسی کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ قادیانی ہیں پھر ان کے معاملات واخلاق بظاہر ٹھیک ٹھاک ہیں، اب ہمیں سوال یہ ہے:

(۱) فرقۂ قادیانی سے شادی بیاہ جائز ہے یا نہیں؟ ایک دفعہ کسی عالم صاحب نے بتایا تھا وہ کافر ہے، کافر سے مسلمانوں کی شادی جائز نہیں، برائے مہربانی تحقیقی بات جاننا چاہتا ہوں کہ ان سے میری بیٹی کا نکاح درست ہوگا یا نہیں؟ اگر نکاح ناجائز ہو تو؟

(۲) ہم نے ان کے یہاں جو کھانا کھایا اس کا حکم کیا ہوگا؟ (۴) لڑکے نے میری بیٹی کو جو انگوٹھی دی اس کو کیا کرنا ہے؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

ہمارے آقا محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک اور کوئی نبی ورسول نہیں آئے گا، یہی عقیدہ رکھنا فرض ہے، اگر کسی کو اس میں شک وشبہ ہو تو وہ کافر ہو جائے گا، ختم نبوت کے متعلق قرآن، حدیث، اجماع امت کی روشنی میں علمائے کرام نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، مطالعہ کے بعد ذرا بھی تردد نہیں رہتا کہ اس عقیدہ کا منکر قطعاً کافر اور وہ ملت اسلام سے خارج ہے، پھر بھی بصیرت کے لئے کچھ دلائل ذکر کر دیتا ہوں، ختم نبوت کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ما كان محمدا ابا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين وكان الله بكل شئ عليمًا. (احزاب: آیۃ ۴۰)

ترجمہ: محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں سب نبیوں کے ختم ہیں اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ (بیان القرآن)

- آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ختم نبوت کے متعلق ایک مثال پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مثلى ومثل الأنبياء كمثل قصر أحسن بنيانه ترك منه موضع لبنة فطاف به النظار يتعجبون من حسن بنيانه إلاموضع تلك اللبنة فكنت أناسددت موضع اللبنة ختم بِىَ البنيان وختم بِىَ الرسل وفى رواية فأنا اللبنة وأناخاتم النبيين متفق عليه. (مشکوۃ: ج ۲ ص ۵۱۱)

ترجمہ: میری اور تمام انبیاء کی مثال اس محل کی سی ہے جس کے درودیوار نہایت شاندار اور عمدہ ہو لیکن اس دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی ہو، اور جب لوگ اس محل کے اردگرد پھر کر عمارت کو دیکھیں تو عمارت کی شان وشوکت اور درودیوار کی خوشنمائی انہیں حیرت میں ڈالدے مگر ایک اینٹ کے بقدر اس خالی جگہ کو دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہو، پس میں اس اینٹ کی خالی جگہ کو بھرنے والا ہوں اس عمارت کی تکمیل میری ذات سے ہے اور انبیاء ورسل کے سلسلہ کا اختتام مجھ پر ہوگیا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ پس میں ہی وہ اینٹ ہوں (جس کی جگہ خالی رکھی گئی تھی) اور میں ہی نبیوں کو پایۂ اختتام تک پہنچانے والا ہوں۔

- دوسری روایت میں ہے:

قال إنى عندالله مكتوب خاتم النبيين: (مشکوۃ: ج ۲ ص ۵۱۳)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی وقت سے خاتم النبیین لکھا ہوا ہوں۔

- اور ایک روایت میں ہے:

قال جابر رضى الله عنه إن النبى صلى الله عليه وسلم قال أنا قائد المرسلين ولا فخر وأنا خاتم النبيين ولا فخر وأنا أوّل شافع ومشفع ولا فخر رواه الدرمى. (مشکوۃ ۲/۵۱۴)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (قیامت کے دن میں تمام نبی اور رسولوں کا قائد ہوں گا) کہ تمام نبی ورسول میدان حشر میں آنے کے لئے میرے پیچھے آئیں گے) اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا، میں انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنے والا ہوں، یعنی نبوت مجھ پر ختم ہوگئی ہے، اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا شفاعت کرنے والا سب سے پہلا شخص میں ہوں گا اور سب سے پہلے میری ہی شفاعت قبول

ہوگی اور میں یہ بات فخر کے طور پر نہیں کہتا۔

✿ اور ایک حدیث میں ہے:

أنا العاقب والعاقب الذی لیس بعده نبی متفق علیه. (مشکوة: ۲۰/ ۵۱۴)

ترجمہ: رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عاقب ہوں اور عاقب کا معنی جس کے بعد نبی نہیں ہے یعنی کوئی نبی ورسول ان کے بعد نہیں آئے گا۔

پس ان احادیث اور آیات سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ورسول، اللہ تعالی کی طرف سے نہیں آئیگا، قادیانی فرقہ کے مقتداء غلام احمد قادیانی مدعی نبوت ہے اور مدعی نبوت کافر ومرتد اور واجب القتل ہے جب فرقۂ قادیانی ایک کافر مرتد کو نبی مانتے ہیں تو وہ بھی کافر ہوں گے۔

پس فرقۂ قادیانی چونکہ غلام احمد قادیانی جعلی نبی کے ماننے والے ہیں اور رسول ﷺ کو خاتم النبیین اور آخری نبی نہیں مانتے جو ان کے دعاوی اور کتابوں سے واضح ہے لہٰذا وہ کافر ومرتد ہیں، جس کو ان کے کفر میں شک ہوگا وہ بھی کافر ہے گذشتہ زمانہ میں حکومت پاکستان نے اسمبلی کے ممبران اور علماء کرام کی اتفاق رائے سے انکے کافر ہونے کا اعلان کیا تھا ریکارڈ سب موجود ہیں اور بہت سے اسلامی ممالک نے ان سے اتفاق کیا تھا جیسے سعودی عرب، اردن، مصر وغیرہ۔

لہٰذا ان لوگوں سے نکاح درست نہیں، انکا ذبیحہ حرام ہے، ان کے گھر میں آپ لوگوں نے جو کھانا کھالیا اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور ان کی انگوٹھی واپس دینی چاہیئے (اگرچہ کافر کا ہدیہ قبول کرنا درست ہے) فتنہ سے بچنے کے لئے نہ لیں۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۹؍صفر ۱۴۲۷ھ	۱۹؍صفر ۱۴۲۷ھ

فرقۂ ناجیہ اور بہتر فرقہ کی تفصیلات

(۲۰) سوال: — حدیث شریف میں جو بہتر فرقوں کا ذکر ہے، یہ سب امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوں گے یا بعض کافر ومشرک بھی ان میں شامل ہوں گے؟

- اگر سب مسلمانوں میں سے ہوں گے تو ان کو آخیر میں نجات ملے گی یا نہیں؟
- تہتر فرقوں کا نام کیا کیا ہیں؟ اور ان کے عقائد کیا ہیں، ہر ایک کی تفصیل چاہئے۔

الجواب وهو الموفّق للصّواب

تہتر فرقے امت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سے ہوں گے، چنانچہ حدیث شریف ہے:

عن عبدالله بن عمرقال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لياتينّ على أمتى كما أتى على بنى إسرائيل حذوالنعل بالنعل حتى ان كان منهم من أتى أمه علانية لكان فى أمتى من يصنع ذلك وإن بنى إسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة وتفترق أمتى على ثلاث وسبعين ملة، كلهم فى النار إلا ملة واحدة قالوا من هى يارسول الله قال ماأنا عليه وأصحابى. رؤاه الترمذى وفى رواية أحمد وأبى داود عن معاوية ثنتان وسبعون فى النار وواحدة فى الجنّة وهى الجماعة و انه سيخرج فى أمتى أقوام تتجار ى بهم تلك الأهواء كما يتجار ى الكلب بصاحبه لايبقى منه عرق ولامفصل إلادخله.

(مشكوٰة: باب الاعتصام للكتاب والسنة: ج ۱ ص ۳۰)

واضح رہے کہ حدیث میں ”امتی“ (میری امت) سے اہل قبلہ یعنی وہ سب لوگ مراد ہیں جو مسلمان شمار ہوتے ہیں اور جو اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہیں، اس صورت میں اس جملہ ”کلهم فى النّار“ کا مطلب یہ ہوگا کہ ان تمام گمراہ فرقوں کے لوگ اپنی بداعتقادیوں اور اپنے گناہوں کے سبب دوزخ میں ڈالیں جائیں گے، پھر جن کی بداعتقادی کفر کی حد تک نہیں پہنچی ہوگی بعد میں پروردگار کی رحمت کے تحت دوزخ سے ان کو نکال لیا جائے گا، اور جن کی بدعتیں کفر کی حد تک پہنچی ہوگی ان کو دوزخ میں رہنے دیا جائے گا۔

تہتر فرقوں میں بہتر فرقے گمراہ ہیں اور ایک فرقہ ناجیہ ہے، فرقۂ ناجیہ کو حدیث شریف میں ”جماعت“ کیا گیا ہے اور جماعت سے مراد وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور فقہ کے صحیح علم کے تحت عقائد واعمال کو مانتے ہیں، قرآن وحدیث اور فقہ کی اتباع کرتے ہیں اور صحابۂ کرام وتابعین کے ہم اعتقاد وہم مشرب ہیں اور صراط مستقیم پر گامزن ہیں اور جن کو اہل سنت والجماعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (کمافی المرقاة: ج۱ص۴۲۰)

بہتر گمراہ فرقوں کی تفصیل علماء اہل سنت والجماعت نے یوں بیان کی ہے

کہ اہل اسلام میں سے گمراہ فرقے دراصل چھ بڑے گروہوں میں منقسم ہیں:

(۱)حَرُورية (۲) قدرية (۳) جهميّة (۴)مرجئة (۵)رافضية (٦) جبرية.

پھر ہر ایک فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہوا ہے۔

حروریہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱) اَزْرَقِيّة (۲) أَبَا ضية (۳) ثعلبية (۴) خازمية (۵) خلفية (٦) كوزية(۷) كنزية (۸) شمراخية (۹) اخنسية (۱۰) حكمية (۱۱) معتزلة (۱۲) ميمونية

قدریہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱) احمرية (۲) ثنوية (۳) معتزلة(۴) كيسانية (۵) شيطانية (۵)شريكية (۷) وهمية (۸) زبرية (۹)مسعدية (۱۰) ناكثية (۱۱) قاسطية

جهميّہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱) معطلة (۲) ملتزقة (۳) واردية (۴)زنا دقة (۵) حرقية (٦) مخلوقية (۷) فانية (۸) عبدية (۹) واقفية (۱۰) قبرية (۱۱) لفظية (۱۲) مريسية .

مرجیہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱) تاركية (۲) سائبية (۳) راجية (۴) سالبية (۵) بهيشية (٦) عملية (۷) منقوصية (۸) مستثنية (۹)مشبهية (۱۰) حشوية (۱۱) ظاهرية(۱۲) بدعية.

رافضیہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱)علوية(۲)اَمِرية (۳) شيعة (۴) اسحاقية(۵)ناؤُوسية (٦)إمامية (۷)زيدية (۸) عباسية (۹) تناسخية (۱۰)رجعية (۱۱) لاعنية(۱۲) متربصية .

جبریہ کے بارہ گروہ کے اسماء:

(۱) مضطرية (۲۰)افعالية (۳) مفروغية (۴) نجارية (۵) منانية (٦) كسبية

(۷) سابقیة (۸) حَبِیّة (۹) خوفیة (۱۰) فکریة (۱۱) حشبیة (۱۲) منّیة .

ان تمام فرقوں کے اسماء اور ہر ایک فرقہ کے عقائد مع تفصیل سورۂ آل عمران کی آیت ''وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا '' کی تفسیر کے تحت تفسیر قرطبی میں موجود ہے اور فرقۂ قدریۃ کے ایک فرقہ کا نام وہاں مذکور نہیں، یہ تمام فرقے گمراہ ہیں، اہل سنت والجماعت کے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور جہنمی ہیں۔

نوٹ:- ہر ایک فرقہ کے عقائد لکھنے سے مضمون فتوی لمبا ہو جائیگا، اس لئے ان کے تفصیلی عقائد نہیں لکھے گئے، پھر بھی ضرورت ہو تو (تفسیر قرطبی: ج۴ ص۱۶۰ طبع بیروت) مطالعہ فرمائے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۴ / صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۲۴ / صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

❀❀❀

بَابُ النَّفْخِ فِیْ الصُّوْرِ

دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس کا وقفہ ہوگا

(۲۱) سوال:- جناب مفتی صاحب! بعد تسلیم مسنون یہ کہ بندہ نے مشکوۃ شریف بنگلہ میں صور پھونکے جانے والی حدیث پڑھی، اس میں دیکھا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہوگا اس بارے میں حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔

اب سوال یہ کہ: یہ وقفہ کتنے دن کا ہوگا اور حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نے کیوں انکار کیا اور اس کی وجہ کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن أبی هريرة رضی الله تعالیٰ عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: مابين النفختين أربعون قالوايا أباهريرة أربعون يوماً قال أبيت قالو ا أربعون شهرًا قال أبيت قالوا أربعون سنة قال أبيت ثم ينزل الله من السماء ماء فينبتون كما ينبت البقل قال وليس من الإنسان شیئ لايبلی إلاعظماً واحدًا وهوعجب الذنب ومنه يركب الخلق يوم القيامة متفق عليه وفی رواية لمسلم كل ابن آدم يأكله التراب إلاعجب الذنب منه خلق وفيه يركب

(مشکوٰۃ: باب النفخ فی الصور: ج۱ ص ۴۸۱)

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں نفخوں (یعنی ایک مرتبہ دنیا و مافی الدنیا سب کو ختم کرنے کے لئے دوسری مرتبہ سب کو دوبارہ زمین سے اٹھانے کے لئے صور پھونکا جائیگا اور دونوں صوروں کے درمیان وقفہ چالیس سال ہوگا لوگوں نے (یہ سن کر) پوچھا کہ ابوھریرۃ! کیا (چالیس سے مراد) چالیس دن ہیں؟ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا مجھے یہ معلوم نہیں پھر لوگوں نے پوچھا کیا چالیس مہینے مراد ہیں؟ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں، پھر

لوگوں نے پوچھا کہ کیا چالیس سال مراد ہیں؟ ابوھریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے یہ معلوم نہیں (اس کے بعد حضرت ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان حدیث کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا اور پانی سے لوگ (یعنی انسان اور تمام جاندار) اس طرح اٹھائیں گے جیسے زمین سے سبزہ اگتا ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”انسان کے جسم وبدن کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو پُرانی بوسیدہ نہ ہوجاتی ہو یعنی گل سڑ کر ختم نہ ہوجاتی ہو علاوہ ایک ہڈی کے، جس کو عجب الذنب کہتے ہیں اور قیامت کے دن ایسا ہے کہ ہر جاندار کی اسی ہڈی سے اس کے تمام جسم کو مرکب کیا جائیگا (بخاری ومسلم) اور مسلم کی ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد ابن آدم کے پورے بدن کو مٹی کھا جاتی ہے مگر عجب الذنب کو پورے طور پر نہیں کھا پاتی اور یہی وہ ہڈی ہے جس سے انسان کی پہلی مرتبہ تخلیق ہوتی ہے اور اسی کے ذریعہ دوبارہ اس کو بنایا جائیگا۔

حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ جواب دینا کہ مجھے نہیں معلوم اس بنا پر تھا کہ یا تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو اس طرح مجمل سنا تھا یا سنا مفصل، مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ”چالیس“ کے بعد کیا فرمایا تھا، چنانچہ انہوں نے اپنے مذکورہ جواب کے ذریعہ واضح کیا کہ میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، بہرحال اس حدیث میں چالیس کا لفظ مجمل نقل ہوا ہے جب کہ ایک دوسری حدیث میں یہ لفظ تفصیل کے ساتھ ہے اور وہ چالیس برس ہے اس دونوں نفخوں کے درمیان جو وقفہ ہوگا وہ چالیس سال کے برابر ہوگا۔ کمافی المرقاۃ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۱۵ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ — ۱۵ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں

(۲۲) سوال:- صور کیا ہے اور حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے کیلئے ہر وقت تیار ہیں، صرف حکم خداوندی کا منتظر ہے کیا یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

جی ہاں یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ:

عن أبی سعید الخدری رضی اللّٰه عنه قال قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم کیف أنعم وصاحب الصور قد التقمه وأصغی سمعه وحنٰی جبهته ینتظر متی یؤمر بالنفخ فقالوا یارسول اللّٰه وما تامرنا قال قولوا حسبنا اللّٰه ونعم الوکیل. رواه الترمذی.

(مشکوٰۃ ،باب النفخ فی الصور: ج۲ ص ۴۸۲)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں آرام وسکون سے کیسے بیٹھا رہوں، جب کہ صور پھونکنے والا (حضرت اسرافیل) صور کو (پھونکنے کیلئے) منہ میں دبائے ہوئے ہے، اپنا کان حق جل مجدہ کی طرف لگائے ہوئے ہے کہ جب ہی حکم صادر ہو فوراً پھونک دیں تاکہ آسمان سے زمین تک کی سب چیزیں ختم ہو جائیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ملے، یہ سن کر صحابہؓ کرام نے عرض کیا کہ پھر آپ ہمارے لئے کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا (جب بھی کوئی آفت ومصیبت آئے تو حق تعالی ہی کی طرف متوجہ ہو جائے اسی کی بارگاہ میں التجا کرو اسی کے فضل وکرم پر بھروسہ واعتماد رکھو، نیز یہ پڑھو "**حسبنا اللّٰه ونعم الوکیل**" (اور ہم کو اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے)۔

صور کیا چیز ہے؟

حدیث شریف میں ہے:

عن عبداللّٰه بن عمر عن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال الصور قرن ینفخ فیه رواه الترمذی وأبو داود والدارمی. (مشکوٰۃ ،باب النفخ فی الصور: ج۲ ص ۴۸۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صور ایک سینگ ہے جس کے ذریعہ پھونک ماری جائیگی۔

بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ اس سینگ یعنی صور کا سر جس کو حضرت اسرافیل علیہ السلام نے اپنے منہ سے لگائے پھونکنے کیلئے تیار بیٹھے ہیں وہ مدوّر اور گول ہے اور اس کی گولائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔

.کما فی" المرقاة" (الصور قرن)قیل دائرة رأسه کعرض السمٰوٰت والأرض
(ج۹ ص ۴۶۴)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی ودارالافتاء
۲۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ — ۲۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

نفخ صور کے وقت جبرائیلؑ ومیکائیلؑ، اسرافیلؑ کے دائیں بائیں ہوں گے۔

(۲۳) سوال: - صور پھونکنے کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ اور فرشتے بھی ہوں گے یا حضرت اسرافیل اکیلے ہوں گے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حدیث شریف میں ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ دائیں حضرت جبرائیل اور بائیں حضرت میکائیل علیہ السلام ہوں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن أبی سعید قال ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب الصور وقال عن یمینہ جبرئیل وعن یسارہ میکائیل: (مشکوة، باب النفخ فی الصور: ج۲ ص ۴۸۲)

ترجمہ: حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صور پھونکنے والے یعنی حضرت اسرافیلؑ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ صور پھونکنے کے وقت ان (اسرافیلؑ) کے دائیں جانب حضرت جبرائیل علیہ السلام اور بائیں جانب حضرت مکائیل علیہ السلام ہونگے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۲۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ — ۲۵/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

بَابُ الْحَشْرِ

بروز قیامت آپ ﷺ تین مقامات پر ملیں گے

(۲۴) سوال: - قیامت کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کن کن مقامات میں ملیں گے اور حضرت عائشہؓ اور انسؓ کی حدیثوں کے درمیان تعارض ہے پھر اس کا کیا جواب ہے؟

الجواب بعونہ تعالیٰ وھو الموفق للصواب

(۱) پل صراط کے پاس، (۲) میزان اعمال کے پاس، اور (۳) حوض کوثر کے پاس قیامت کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہی تین مقامات پر ملیں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن أنس قال سألت عن نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم أن یشفع لی یوم القیامة فقال أنا فاعل قلت یارسول اللّٰہ فأین أطلبک قال اطلبنی أوّل ماتطلبنی علی الصراط قلت فإن لم ألقک علی الصراط قال فاطلبنی عند المیزان قلت فإن لم ألقک عندالمیزان قال فاطلبنی عند الحوض فإنی لاأخطی ھذہ الثلاث المواطن رواہ الترمذی وقال ھذاحدیث غریب. (مشکوٰة، باب الحوض والشفاعة : ج ۲ ص ۴۹۳)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ: (ایک دن) میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ قیامت کے دن (عام شفاعت کے علاوہ خاص طور پر الگ سے بھی) میری شفاعت فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا میں شفاعت کردوں گا، میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کہاں تلاش کروں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے کہاں ملیں گے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے مجھے پلصراط پر تلاش کرنا پھر عرض کیا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پلصراط پر نہ مل پائیں؟ تو کہاں تلاش کروں، فرمایا! تو پھر میزان کے پاس تلاش کرنا، میں نے عرض کیا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) میزان کے پاس بھی نہ ملیں؟ پھر آپ نے فرمایا! (اگر ان دونوں جگہ پر نہ مل پاؤں) تو پھر حوض پر مجھے تلاش کرنا، میں ان تینوں جگھوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔

تعارض: - کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ تین موقع ایسے ہیں کہ جہاں پر کوئی شخص کسی کو یاد نہیں کرے گا۔

عن عائشة رضی اللّٰه عنها أنها ذكرت النار فبكت فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم مايبكيک قالت ذكرت النار فبكيت فهل تذكرون أهليكم يوم القيامة فقال رسول اللّٰه صل اللّٰه عليه وسلّم امّا فی ثلاثة مواطن فلايذكر أحدٌ أحدًا عند الميزان حتی يعلم أيخف ميزانه أم يثقل وعندالكتاب حتی يقال هاؤم اقرؤا كتٰبيه حتی يعلم أين يقع كتابه أفی يمينه أم فی شماله من وراء ظهره وعندالصراط إذا وضع بين ظهری جهنم رواه أبو داود . (مشكوة ،باب الحساب والقصاص والميزان: ۴۸۶/۲)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ (ایک دن) وہ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) دوزخ کی آگ کا خیال کر کے رونے لگیں (ان کو اسطرح اچانک روتے دیکھا تو) آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ تمہیں کیا ہوا کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے دوزخ کی آگ کا خیال آ گیا تھا (اس کی دہشت اور خوف سے رونے لگی ہوں) اور وہاں کیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت کے دن اپنے اہل وعیال کو بھی یاد رکھیں گے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) فرمایا کہ (ویسے تو اہل بیت ہی کیا، قیامت کے دن اپنی پوری امت کا خیال وفکر ہوگا لیکن) صورت حال یہ ہے کہ اس دن تین موقع ایسے ہوں گے کہ وہاں کسی کو کسی کا خیال نہیں ہوگا یعنی مخصوص طور پر کسی کا خیال نہیں ہوگا، البتہ شفاعت عظمیٰ عمومی طور پر تمام خلائق کے لئے ہوگی) ایک موقع تو وہ ہوگا جب (اعمال کو تولنے کے لئے میزان سامنے ہوگی آنکہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس کی میزان بھاری رہی یا ہلکی یعنی جب تک اعمال تل نہ لیں گے اور یہ پتہ نہ چل جائے گا کہ نیک اعمال کا پلاّ جھک گیا ہے یا اوپر کو اٹھ گیا ہے، تب تک ہر شخص اپنی اپنی فکر میں سرگرداں رہے گا، دوسرا موقع وہ ہوگا جب اعمال نامے (ہاتھوں میں) حوالے کئے جائیں گے، اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے، یا بائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے، چنانچہ جو شخص نجات یافتہ ہوگا اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں آئے گا اور جو شخص مستوجب عذاب گردانا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں ہوگا اور جس کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں آئے گا وہ مارے خوشی کے یہ کہے گا کہ آؤ! میرا اعمال نامہ پڑھ لو، تب تک ہر شخص فکر وتردد میں رہے گا اور کسی کو کسی کا ہوش وخیال نہیں رہے گا) اور تیسرا موقع وہ ہوگا جب پل صراط (پر سے گزرنے) کا وقت قریب ہوگا اور وہ پلصراط جہنم کی پشت پر یعنی اس کے دہانے پر) رکھا جائے گا (یہاں تک کہ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس پر سے عافیت کے ساتھ گزر کر نجات پائی ہے یا جہنم میں گر پڑا ہے۔

دفع تعارض:- درحقیقت دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث غائبین پر محمول ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان تینوں موقعوں پر جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نہیں ہوں گے اور آپ صلی اللہ علہ وسلم سے کوئی رابطہ قائم نہیں کریں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم از خود ان کو یاد نہیں کریں گے اور یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث حاضرین پر محمول ہے یعنی آپ کی امت میں سے جو لوگ ان موقعوں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت پر حاضر ہوں گے اور اپنی طرف سے متوجہ کریں گے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف توجہ دیں گے اور انکی خصوصی شفاعت فرمائیں گے۔ (کمافی المرقاۃ)

یا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کو مذکورہ جواب اس لئے دیا کہ وہ آپ کی زوجۂ مطہرہ تھیں اور یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ مخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور خصوصی توجہ پر اعتماد و بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں اور عمل و ریاضت کی طرف بے فکر نہ ہو جائیں، اس کے برخلاف حضرت انسؓ کو یہ جواب اس لئے دیا کہ وہ ناامید نہ ہو جائیں اور انہوں نے جس دلی تعلق واخلاص کی بنا پر یہ درخواست کی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ انھیں جواب بھی اس طرح کی محبت وتعلق کو ظاہر کرنے والا دیا جائے۔

بہر حال یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ وہ دن اپنی ہولناکی اور شدت کے اعتبار سے نہایت سخت ہوگا اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شفاعت کرنا برحق ہے، لیکن صرف اس پر اعتماد کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے کام ہوگا، اعمال کی فکر و کوشش ضروری نہیں آدمی بیٹھے رہے اس قسم کے لغو خیال نہ ہونا چاہئیے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور انس رضی اللہ عنہ کو جو الگ الگ جواب دیا وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح تھے اور ہر جواب میں مخاطب کے احوال کی رعایت ملحوظ تھی۔ (کما فی المرقاۃ) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۵ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۵ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

قیامت کے روز موت کو ذبح کر دیا جائے گا

(۲۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک عالم صاحب سے سنا کہ قیامت کے روز موت کو ذبح کر دیا جائیگا، اب سوال کہ یہ موت کو کس طرح ذبح کیا جائیگا اور یہ بات صحیح حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جی ہاں! حدیث سے ثابت ہے کہ جنت والے کا جنت میں اور دوزخ والے کا دوزخ میں جانے کے بعد موت کو ایک بکرے کی شکل میں لایا جائے گا اور اس کو ذبح کر دیا جائیگا۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم إذا صار أهل الجنة إلى الجنّة وأهل النار إلى النار جئى بالموت حتى يجعل بين الجنّة والنار ثم يذبح ثم ينادى منادٍ يا أهل الجنّة لا موت ويا أهل النار لا موت فيزداد أهل الجنّة فرحًا إلى فرحهم ويزداد أهل النار حزنًا إلى حزنهم متفق عليه.

(مشكوة، باب الحوض والشفاعة: ۴۹۲/۳)

ترجمہ: حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں اپنی اپنی جگہ جالیں گے، تو موت کو لایا جائے گا اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ موت کو دنبہ کی شکل میں لایا جائیگا اور اس کو جنت ودوزخ کے درمیان ڈال کر ذبح کر دیا جائے گا پھر اعلان کرنے والا اعلان کرے گا اے جنتیوں! سن لو اب موت کا کوئی وجود نہیں رہا، جو شخص جہاں اور جس حالت میں ہے اس پر کبھی موت کا سایہ نہیں پڑے گا، ہر ایک کو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی حاصل ہوگئی ہے اور اے دوزخیوں! تم بھی سن لو اب موت کا کوئی وجود نہیں رہا یہ اعلان سن کر اہل جنت کی فرحت ومسرت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا اور اہل دوزخ رنج وغم کے دریا میں اور زیادہ ڈوب جائیں گے۔ فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ — ۲۵ر صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

میدان حشر میں سب لوگ لباس کے بدون جمع ہوں گے

(۲۶) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک واعظ صاحب سے سنا کہ قیامت کے روز تمام لوگ ننگے آئیں گے کسی کا لباس نہ ہوگا، کیا یہ بات حدیث شریف سے ثابت ہے؟ کہ اس میں نیک اور بد کا ایک ہی حال ہوگا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جی ہاں! یہ بات حدیث سے منقول اور ثابت ہے، چنانچہ:

عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقول یحشر الناس یوم القیامة حفاةً عراةً غرلًا قلت یارسول اللّٰہ الرجال والنساء جمیعًا ینظر بعضھم إلی بعض فقال یاعائشة الأمر أشد من أن ینظر بعضھم إلی بعض متفق علیہ. (مشکوٰۃ، باب الحشر: ۴۸۳/۲)

ترجمہ: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن میدان حشر میں لوگوں کو ننگے پاؤں اور ننگے بدن جمع کیا جائیگا، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے یہ سن کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا مرد و عورت سب کا یہی حال ہوگا اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو عریاں دیکھیں گے (یعنی اس طرح تو مرد عورتوں کو اور عورتیں مردوں کو ننگا دیکھیں گے) آپ ﷺ نے فرمایا عائشہ! اس دن کا معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہولناک ہوگا کہ کوئی کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے۔

یعنی اس میں نیک اور بد سب ابتدائی حالت میں برابر ہوں گے مگر بعد میں نبیوں کو جنت کا لباس پہنایا جائیگا، اس میں حضرت ابراھیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائیگا۔

فقط واللّٰہ سبحانہ و تعالی اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

بروز قیامت آپ ﷺ عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑے ہوں گے۔

(۲۷) سوال:۔ بعض لوگ بیان کرتے ہیں کہ قیامت کا روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرش الٰہی کے دائیں جانب جلوہ افروز ہوں گے اور آپ کو جنت کے جوڑے پہنائے جائیں گے یہ باتیں کہاں تک درست ہیں اس کا حوالہ چاہئیے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جی ہاں! یہ باتیں حدیث شریف سے ثابت ہیں، چنانچہ:

عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النّبی صلی الله عليه وسلم قال فاكسی حلة من حُلَلِ الجنّة ثم أقوم عن يمين العرش ليس أحد من الخلائق يقوم ذلک المقام غيری. رواه الترمذی وفی رواية جامع الاصول عنه أنا أوّل من تنشق عنه الأرض فاكسی. (مشكوة، باب فضائل سيد المرسلين ﷺ: ج۲ ص۵۱۴)

ترجمہ: حضرت ابوھریرۃؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز قبر سے سب سے قبل میں نکلونگا اور سب سے پہلے قیامت کے دن مجھے جنت کے جوڑوں میں سے ایک جوڑا پہنایا جائے گا اور پھر میں عرش کے دائیں جانب کھڑا ہوں گا جہاں میرے سوا مخلوق میں سے اور کوئی کھڑا نہیں ہوگا۔

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی درالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۶ رصفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۲۶ رصفر المظفر ۱۴۲۷ھ

بروز قیامت امت محمدیہ ﷺ کافروں کے خلاف اور دوسرے نبیوں کے حق میں گواہ بنے گی

(۲۸) سوال:- قیامت کے دن امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت نوح علیہ السلام کی حمایت میں اور قوم نوح کے خلاف گواہ بنے گی، کیا یہ بات درست ہے یا نہیں؟ امت محمدیہ تو بعد میں آئی پچھلے والوں کے خلاف کیسے گواہی دے گی؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جی ہاں! یہ بات حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ:

عن أبی سعید رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم یجاء بنوح یوم القیامة فیقال له هل بلغت فیقول نعم یارب فتسأل أمته هل بلغکم فیقولون ماجاء نا من نذیر فیقال من شهودک فیقول محمّد وأمته فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فیجاء بکم فتشهدون أنه قد بلّغ ثم قرأ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم "وکذلک جعلنکم أمة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدًا" رواه البخاری.

(مشکوة، باب الحساب والقصاص والمیزان :(ج ۲ ص ۴۸۵)

ترجمہ: حضرت ابو سعیدؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میدان حشر میں حضرت نوحؑ کو لایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم نے اپنی امت تک اللہ تعالیٰ کے احکام دین وہدایت پہنچائے تھے وہ عرض کریں گے کہ بیشک اے میرے پروردگار میں نے تیرے احکام دین وہدایت اپنی قوم کے لوگوں تک پہنچائے تھے، پھر حضرت نوحؑ کی امت سے اللہ تعالیٰ سوال کریں گے (نوحؑ نے) تم تک ہمارے احکام پہنچائے تھے؟ وہ لوگ انکار کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارے پاس کوئی بھی ڈرانے والا (خواہ وہ نوح ہوں یا اور کوئی نبی) نہیں آیا تھا اور پھر حضرت نوحؑ سے پوچھا جائیگا کہ آپ نے جو میرا دین اور اس کے احکام ان تک پہنچائے تھے اس پر تمہارے گواہ کون ہیں؟ یعنی اللہ تعالیٰ خود اگرچہ جانتا ہے کہ نوحؑ نے جو کچھ کہا ہے بالکل درست کہا ہے، لیکن ان کی منکر امت کو قائل بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے ان کے اس دعوی پر گواہ طلب کرے گا، کہ انہوں نے منصب تبلیغ ورسالت کی ذمہ داریوں کو پورا کیا تھا چنانچہ حضرت نوح کہیں گے میرے گواہ حضرت محمدؐ اور ان کی امت کے لوگ ہیں، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے (صحابہؓ سے) فرمایا کہ تب تمہیں پیش کیا جائے گا اور تم یہ گواہی دوگے کہ حضرت نوحؑ نے امت کو احکام خداوندی پہنچائے تھے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس صورت حال کی تصدیق وتصویب کے لئے) یہ آیت پڑھی (جس میں حق تعالیٰ امت محمدیہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ "**وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا**" اور اس لئے ہم نے (اے مسلمانوں) تمہیں نیک ومعتدل اور افضل امت بنایا ہے تاکہ تم ان لوگوں کے بارے میں (کہ جو تم سے پہلے گزرے ہیں اور کفر وشرک پر قائم رہے ہیں) ان پر گواہی دو اور تمہارے گواہ پیغمبر صلی اللہ

علیہ وسلم ہوں گے۔

یعنی قیامت کے روز قوم نوحؑ جب انکار کرے گی کہ ہمارے پاس کوئی نبی یا رسول ڈرانے والا نہیں آیا تھا، ہم کو بے گناہ جہنم میں کیوں ڈالا جا رہا ہے، تو حضرت نوحؑ کو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تمہاری دعوت دین پہنچانے کے گواہ کون لوگ ہیں؟ حضرت نوحؑ کہیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہیں، ان کو بذریعہ قرآن معلوم ہو گیا تھا کہ نوحؑ نے اپنی قوم کو تعلیم و تبلیغ کی تھی، ان سے جب سوال کیا جائیگا، تو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت نوح علیہ السلام کے حق میں گواہی دے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سامنے تصدیق کریں گے اس سے یہ اشکال بھی دور ہو جاتا ہے کہ بعد میں آنے والا پہلے آنے والوں کے خلاف کیسے گواہی دیں گے۔

فقط واللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

میدان حشر میں ہر شخص ننگے جسم اور غیر مختون آئیگا

(۲۹) سوال: — میدان حشر میں ہر شخص ننگے بدن اور غیر مختون آئیگا، یہ بات حدیث شریف سے منقول ہے؟ سوال یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اولاد کو دنیا میں ختنہ کرالیا تھا، تو غیر مختون کیسے ہوں گے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جی ہاں! حدیث شریف سے اسطرح ثابت ہے، چنانچہ:

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلّم قال إنکم محشورون حفاةً عراةً غرلًا ثم قرأ ”کما بدأ نا أول خلق نعید ہ وعدًا علینا إنا کنا فاعلین“ وأوّل من یکسی یوم القیامة إبراھیم وإن ناساً من أصحابی یؤخذبھم ذات الشمال فأقول أُصَیْحَابی أصیحابی فیقول إنھم لن یزالوا مرتدین علی أعقابھم مذ فارقتھم فأقول کما قال العبد الصالح دو کنت علیھم شھیدا ما دمت

فیهم. إلی قوله. العزیز الحکیم" متفق علیه. (مشکوۃ، باب الحشر ج ۲ ص ۴۸۳)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں قیامت کے دن اس حال میں اٹھایا جائیگا کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، اور بے ختنہ ہوگے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ" یعنی جس طرح ہم نے ان کو ابتداء پیدائش میں (ننگے پاؤں، ننگے بدن اور بے ختنہ ماں کے پیٹ سے پیدا کیا تھا اسی طرح ان کو دوبارہ قیامت کے دن پیدا کریں گے یعنی قبروں سے اٹھائیں گے یہ وعدہ کہ ہم ان کو دوبارہ پیدا کریں گے) ہم پر لازم ہے اور یقیناً ہم نے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرنے والے ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ان لوگوں میں سب سے پہلے جس شخص کو لباس پہنایا جائے گا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں پھر مجھے فرمایا اور اس وقت جب کہ لوگوں کو میدان حشر سے جنت اور دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا، میں دیکھوں گا کہ میرے کچھ صحابہ کو پکڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف یعنی دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہے میں یہ دیکھ کر بطریق حیرت واستعجاب کے ان کو نجات دلانے کے لئے کہونگا کہ یہ میری امت اور ساتھی ہیں، ان کو کہاں لے جاتے ہو! خداوند تعالیٰ کی طرف سے جواب ملے گا بیشک یہ تمہارے ساتھی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تم ان سے جدا ہوئے یہ لوگ دین سے برگشتہ ہوگئے تھے (اس لئے ان کو دوزخ میں بھیجا جا رہا ہے، میں یہ سن کر کہوں گا جو بندہ صالح یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ "وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ" إلی قوله "الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" یعنی جب تک میں ان کے درمیان زندہ رہا، ان کے احوال سے واقف رہا (بعد میں انہوں نے کیا کیا مجھے علم نہیں جیسے وہ بے دین ہوگئے پھر کوئی بات نہیں) الخ۔ (بخاری ومسلم)

حدیث شریف میں: کہ "بے ختنہ ہوں گے" میں اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اپنی اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے جسم وبدن کے تمام اجزاء مل جائیں گے اور پورا جسم اسی طرح کا ہوجائیگا جیسا کہ اس دنیا میں اسکو بھیجا گیا تھا، اس کی دلیل یہ ہے کہ ختنہ کی وہ کھال جو کاٹ کر پھینک دی جاتی ہے دفن کر دیا جائے، جب قیامت کے دن بندہ اٹھے گا تو پیدائش کے دن جیسا تھا

ویسا اٹھے گا، تو دوسرے اجزاء جیسے بال اور ناخن وغیرہ بطریق اوّل سب چیزیں آجائیں گی۔
پس یہ حقیقت ہے کہ حق تعالیٰ اپنی مخلوق کے بارے میں کمال علم اور کمال قدرت رکھتا ہے سب کو جمع کرے گا ایسا ہی ہوگا خواہ کوئی تسلیم کرے یا انکار کرے۔

کمافی "المرقاۃ" قال العلماء قوله غرلاً إشارة إلى أن البعث یکون بعد رد تمام الأجزاء والأعضاء الزائلة فی الدنیا إلی البدن وفیه تأکید لذلک، فإن القلفة کانت واجبة الإزالة فی الدنیا فغیرها من الأشعار والأظفار والأسنان ونحوها أولیٰ وذلک لغایة تعلق علم اللہ تعالیٰ بالکلیات و الجزئیات ونهایة قدرته بالأشیاء الممکنات : ٧/٢٧٤) فقط واللہ تعالی أعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۲۶/صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

* * *

فَصۡلٌ فِی الشَّفَاعَةِ وَالۡحَوۡضِ

گناہ کبیرہ کی شفاعت صرف اسی امت کیلئے مخصوص ہوگی

(۳۰) سوال: - مرتکب کبائر کو شفاعت اور سفارش کی برکت سے نجات ملے گی یا نہیں یا ہر حال میں جہنم جانا پڑیگا، جہنم میں جانے سے پہلے شفاعت ہوگی یا بعد میں بھی ہوگی؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ایسا آدمی شفاعت سفارش کی برکت سے عذاب سے نجات پائیگا اگر پہلے شفاعت ہوگئی تو پہلے معافی ہوجائے گی ورنہ کچھ عذاب کے بعد پھر شفاعت ہوگی پھر معافی دیجائے گی اور مرتکب کبائر کے لئے شفاعت یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہوگی اور اسی امت کیلئے مخصوص ہوگی۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن أنس رضی اللّٰہ عنہ أن النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال شفاعتی لأھل الکبائر من أمتی رواہ الترمذی وأبو داوٗد وابن ماجة عن جابر.

(مشکوٰة، باب الحوض والشفاعة. ۲/۴۹۴)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہ کبیرہ کرنے والوں کے حق میں میری شفاعت صرف میری امت کے لوگوں کے لئے مخصوص ہوگی۔

شفاعت کی پانچ مراتب ہیں

(۱) پہلی قسم: - وہ شفاعت ہے جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے مخصوص ہے، اس شفاعت کا حق اور کسی کو حاصل نہیں ہوگا اور یہ شفاعت وہ ہوگی جس کا تعلق تمام امتوں سے ہوگا (یعنی میدان حشر میں کھڑے رہنے) کی پریشانیوں سے چھٹکارا دلا کر حساب وکتاب جلد شروع کرانے کیلئے آپ کی شفاعت ہوگی یہ شفاعت کبریٰ ہے۔

(۲) دوسری قسم: - وہ شفاعت ہے جو بعض لوگوں کو حساب کے بغیر جنت میں داخل کردینے کیلئے ہوگی اور اس شفاعت کا ثبوت بھی صرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے منقول ہے۔

(۳) تیسری قسم :- وہ شفاعت ہے جو ان لوگوں کے لئے ہوگی جن کا دوزخ میں جانے کا فیصلہ ہوگیا ہے چنانچہ ان میں سے جن لوگوں کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا ان کی شفاعت ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کریں گے۔

(۴) چوتھی قسم :- وہ شفاعت ہے جو ان لوگوں کیلئے ہوگی جو اپنے گناہوں کی پاداش میں دوزخ میں ڈالے جاچکے ہوں گے، پس ان لوگوں کی شفاعت کے سلسلے میں جو حدیثیں منقول ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش اور فرشتوں کی سفارش سے اور اپنے مسلمان بھائیوں کی جانب سے کی جانے والی شفاعت کے نتیجہ میں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچائے جائیں گے اور پھر آخر میں خود اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت کے تحت ان لوگوں میں بے شمار لوگوں کو عذاب دوزخ سے نجات عطا فرمائے گا، جنہوں نے "لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کہا ہوگا۔

(۵) پانچویں قسم :- وہ شفاعت ہے جس کا تعلق جنت میں اہل جنت کے درجات میں بلندی اور اعزازات واکرامات میں اضافہ سے ہے۔

قال فی "المرقاة شرح المشكوة". قال والشفاعة خمسة أقسام أولها مختصة بنبينا صلى اللّٰه عليه وسلم، وهی الإراحة من هول الموقف وتعجيل الحساب، الثانية. الشفاعة فی إدخال قوم الجنّة بغير حساب، وهذه أيضا وردت فی نبينا صلى اللّٰه عليه سلم. الثالثة. الشفاعة: لقوم استوجبوا النار فيشفع فيهم نبينا صلى اللّٰه عليه وسلم من شاء اللّٰه تعالىٰ. الرابعة: فيمن دخل النار من المذنبين، فقدجاءت الأحاديث بإخراجهم من النار بشفاعة نبينا صلى اللّٰه عليه وسلم والملائكة واخوانهم المؤمنين ثم يخرج اللّٰه تعالىٰ كل من قال "لااله الااللّٰه". الخامس: الشفاعة فی زيادة الدرجات فی الجنّة لأهلها هذه لاتنكرها أيضا. (باب الحوض والشفاعة : ج۹ ص ۵۶۴)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

کون کون لوگ شفاعت کریں گے

(۳۱) سوال: -(۱) قیامت کے روز کون کون لوگ شفاعت وسفارش کر سکیں گے؟

(۲) شفاعت کے منکرین کا کیا حکم ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱): - عن عثمان بن عفّان قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يشفع يوم القيامة ثلاثة الأنبياء ثم العلماء ثم الشهداء رواه بن ماجة.

(مشكوة، باب الحوض والشّفاعة ۴۹۵/۲)

ترجمہ: حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن تین طرح کے لوگ شفاعت کریں گے، اوّل انبیاء، پھر (باعمل) علماء اور پھر شہداء۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا حدیث میں شفاعت کرنے والے صرف تین طرح کے لوگوں کی تخصیص محض ان کی برتری فضیلت وبزرگی کی بنا پر ہے ورنہ دوسرے ایمانداروں کو بھی سفارش کا اختیار ہوگا۔

جواب (۲): -مطلق شفاعت کا منکر تو کافر ہوگا لیکن بعض شفاعت کا منکر گمراہ ہوگا، جیسا کہ خوارج، اور بعض معتزلہ نے اختیار کیا ہے، فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ	۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

ہر نبی کو ایک ایک حوض عطاء ہوگا

(۳۲) سوال: -حوض کوثر کا پانی صرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا یا ہر نبی کو بھی ملے گا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اپنی اپنی امت کو پانی پلانے کیواسطے ایک ایک حوض عطاء ہوگا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن سمرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن لكل نبي حوضًا وانهم ليتاهون أيهم أكثر واردةً واني لارجوأن أكون أكثرهم واردةً رواه الترمذی وقال هذا حديث غريب. (مشکوٰۃ، باب الحوض و الشفاعۃ: ج ۲ ص ۴۹۳)

ترجمہ: حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخرت میں ہر ایک نبی علیہ السلام کو حوض عطاء ہوگا، اور ہر امت اپنے اپنے نبی علیہ السلام کے حوض پر آ کر پانی پیئے گی تمام انبیاء علیہم السلام آپس میں اس پر فخر کریں گے کہ اس کے حوض پر زیادہ آدمی آتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ سب سے زیادہ آدمی میرے حوض پر آئیں گے۔

البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر پر پانی پینے والوں کی تعداد دوسری تمام امتوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ	۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

حوض کوثر پر سب سے پہلے آنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے

(۳۳) سوال:- حوض کوثر پر سب سے پہلے کون سے لوگ آنے والے ہوں گے اور ترتیب کیا ہوگی؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حوض کوثر پر سب سے پہلے آنے والے لوگ فقراء مہاجرین ہوں گے یعنی مہاجرین میں سے نادار طبقہ ہوگا۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن ثوبان عن النبي صلى الله عليه وسلم قال حوضي من عدن إلى عمان

البلقاء ماءه أشد بياضاً من اللبن وأحلى من العسل وأكوابه عدد نجوم السماء من شرب منه شربة لم يظمأ بعدها أبدًا أول الناس وَرُوُدًا فقراء المهاجرين الشَعثُ رؤسًا الدنس ثيابًا الذين لاينكحون المُتَنَعِّمَاتِ ولايفتح لهم السدد . رواه أحمد والترمذى وابن ماجة وقال الترمذى هذاحديث غريب.

(مشكوة :باب الحوض والشفاعة : ج۲ ص۴۹۳)

ترجمہ: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے حوض (کوثر) کی لمبائی عدن اور عمان بلقاء کے درمیانی فاصلہ کے بقدر ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیرین ہے اس کے آب خورے (پانی پینے کے برتن) آسمان کے ستاروں سے زیادہ ہیں جو شخص بھی ایک مرتبہ اس کا پانی پی لے گا پھر اس کو کبھی پیاس نہیں لگے گی، اس حوض پر پانی پینے کیلئے سب سے پہلے آنے والے لوگ مہاجرین ہوں گے، وہی فقراء مہاجرین جو (اس دنیا میں اپنے فقر وافلاس کی وجہ سے) پراگندہ بال اور پریشان حال تھے اور پھٹے پُرانے کپڑوں میں نظر آتے تھے، جو خوشحال گھرانوں کی لڑکیوں سے اگر اپنے نکاح کا پیغام بھیجیں تو ان سے نکاح کے قابل نہیں سمجھے جاتے تھے اور جن کے لئے (گھروں کے) دروازے نہیں کھولے جاتے تھے''

فقراء مہاجرین کو یہ شرف خصوصی اس لئے حاصل ہوگا کہ دنیا میں دین کی خاطر انہوں نے ہی سب سے زیادہ بھوک پیاس کی صعوبتیں برداشت کی تھیں سب سے زیادہ پریشانی اور تباہ حالی کا شکار یہی لوگ ہوئے تھے اس لئے آخرت میں سب سے پہلے انھی لوگوں کو حوض کوثر پر سیراب کیا جائیگا اور سب سے پہلے انھی کو وہاں خوش آمدید کہا جائے گا، اس مفہوم کو ایک دوسری حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

أجوعكم فى الدنيا أشبعكم فى الآخرة. (مرقاة ج ۹ ص ۵۵۷)

یعنی تم میں جو لوگ دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے رہتے ہیں وہی آخرت میں سب سے زیادہ شکم سیر ہوں گے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

اہل جنت کا پہلا کھانا روٹی اور مچھلی کے جگر کے ساتھ ہوگا

(۳۴) سوال:- اہل جنت کا پہلا کھانا مچھلی اور اس کے جگر کے ساتھ ہوگا اور قیامت کے دن زمین روٹی ہو جائے گی اور جنت میں جانے والوں کا کھانا بنے گی کہ وہ جنت میں جانے کے وقت پہلے اس کو کھائیں گے یہ باتیں حدیث سے ثابت ہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جی ہاں! قیامت کے روز زمین روٹی ہو جائے گی اور یہ جنت میں جانے والوں کا کھانا بنے گا کہ اہل جنت میں جانے کے وقت اس کو کھائیں گے اور اہل جنت کا پہلا کھانا مچھلی کا جگر ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن أبی سعید الخدری رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم تکون الأرض یوم القیامة خبزة واحدة یَتَکَفَّأُهَا الجبّارُ بیده کمایَتَکَفَّأُ أحدُکم خبزتَه فی السفر نُزُلاً لأهل الجنّة وفأتی رجلٌ من الیهود فقال بارک الرحمن علیک یا أباالقاسم ألاأخبرک بنزل أهل الجنّة یوم القیامة قال بلیٰ قال تکون الأرض خبزةً واحدةً کما قال النبیّ صلی الله علیه وسلم فنظر النبیّ صلی الله علیه وسلم إلینا ثم ضحک حتی بدت نواجذه ثم قال ألاأخبرک بإدامهم بالام والنون قالوا وماهذا قال ثورٌ ونونٌ یأکل من زائدة کبدهما سبعون الفًا متفق علیه. (مشکوة باب الحشر ج۲ ص ۴۸۲)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن ساری زمین ایک روٹی ہوگی، جس کو خداوند جبّار اپنے ہاتھوں سے اسطرح الٹے پلٹے گا جس طرح تم میں کوئی شخص سفر کے دوران آٹے کے گوند کی ہلا ہلا کر روٹی پکاتا ہے اور یہ روٹی جنتیوں کی مہمانی ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فرمانے کے بعد ایک یہودی آیا اور کہنے لگا کہ اے ابوالقاسم! خدائے پاک مہربان آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر برکت

نازل کرے، کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتاؤں کہ قیامت کے دن جنتیوں کی مہمانی کے طور پر پہلا کھانا کیا ہوگا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں بتاؤ! اس یہودی نے کہا کہ ساری زمین ایک روٹی ہوگی، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا (یہ سن کر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعجب کا اظہار کیا اور ہمیں یہ بتانے کے لئے کہ یہودی ٹھیک کہہ رہا ہے) چاروں طرف دیکھا اور ہنسنے لگے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواجذ دانت نظر آنے لگے ہیں، اس کے بعد اس یہودی نے کہا میں آپ کو بتاؤں کہ جنتیوں کا سالن کیا ہوگا (جس سے وہ روٹی لگا کر کھائیں گے) اس نے بتایا سالن وہ بالام اور نون ہے، صحابہ (رضی اللہ عنہم) بالام کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے (کیونکہ وہ عبرانی لفظ تھا اس لئے) انہوں نے کہا کہ یہ بالام کیا چیز ہوتی ہے کہا کہ بالام کا مطلب بیل ہے اور نون مچھلی اور اس کا گوشت وجگر جس کا تمہیں بھی علم ہے اور صرف مچھلی کے جگر کا متصل حصہ اتنا بڑا ہے کہ اس کے زائد ٹکڑے سے ستر ہزار آدمی کھاسکیں گے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۱ر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ	۲۱ر ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

❁ ❁ ❁

فَصلٌ فِی رُؤیَةِ اللّٰہِ تعَالیٰ

(۳۵) سوال: - روایت باری تعالیٰ حالت بیداری میں کسی کیلئے ممکن یا ثابت ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کیا کہتی ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

تمام علماء امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حق تعالیٰ کی رویت تمام اہل ایمان کو آخرت میں نصیب ہوگی، اس کے ثبوت پر وہ قرآنی آیات، احادیثِ صحیحہ، اجماعِ صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ ہیں، جو کتب حدیث وفقہ اور عقائد میں مذکور ومنقول ہیں، تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حق تعالیٰ کے اس دیدار کے منکر ہیں، انہوں نے دیدار الٰہی سے متعلق قرآنی آیات وآحادیث اور منقول دلیل کی جس طرح تاویل کی ہے اس کی تفصیل اور علماء حق کی طرف سے انکی تاویلات کے مضبوط جوابات مختلف کتابوں میں مذکور ہیں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ کیا اس دنیا میں بحالت بیداری کھلی آنکھوں سے خدا کی رویت ممکن ہے یا نہیں؟ اس بارے میں ارباب تحقیق نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ حق تعالیٰ کا دیدار دنیا میں ممکن ہے لیکن بالاتفاق غیر واقع ہے، رہی یہ بات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں خدا کا دیدار ہوا ہے اور امر واقعی ہے، تو یہ استثنائی صورت ہے اگرچہ بعض حضرات نے اس سے اختلاف کیا ہے، بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں بچشم سر خدا کا دیدار ہوا تھا؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔

محدثین، فقہاء متکلمین اور مشائخ طریقت سب اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ نہ آج تک اس دنیا میں کسی کو بھی خواہ وہ کوئی بڑے سے بڑے ولی ہی کیوں نہ ہو خدا کا دیدار حاصل ہوسکتا ہے، نہ اولیاء اللہ اور مشائخ میں سے کسی نے اسکا دعوی کیا ہے اور نہ آئندہ کسی کو حاصل ہوسکتا ہے، بلکہ تمام مشائخ نے متفقہ طور پر یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ اس نے خدا کو بیداری کی حالت میں دیکھا ہے تو اسکا ماننا ضروری اور لازم نہیں بلکہ ایسے لوگوں کو ماؤف العقل یا گمراہ قرار دیا جائیگا، فقہ شافعی کی مستند کتاب

''مشارق انوار'' میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ میں نے دنیا میں بچشم سر عیناً خدا کو دیکھا ہے اور خدا مجھ سے بالمشافہ گفتگو کرتا ہے تو وہ کافر ہو جائے گا، بہرحال مسئلہ پیچیدہ ہے اس میں پڑ کر ایمان کو خراب نہیں کرنا چاہئے، اس سلسلہ میں بحث کرنا بھی تضییع اوقات ہوگا۔

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ	۱۲؍ رجب المرجب ۱۴۲۷ھ

◆ ◆ ◆

كِتَابُ السُّنَّةِ وَالْبِدْعَةِ

بدعت کے متعلق بعض باتوں کی تحقیق

(۳۶)سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے یہاں ایک محفل وعظ ہوئی تھی کافی علماء کرام تشریف لائے تھے، ان میں سے ایک مولانا صاحب نے رد بدعت کے سلسلہ میں تقریر فرمائی ماشاء اللہ تقریر بہت عمدہ تھی مگر ان میں سے بعض باتیں مقام کے لحاظ سے قابل لحاظ اور مصلحت امیز تھیں جس کا اہتمام مولانا صاحب نے نہیں کیا بس صاف الفاظ میں یوں کہدیا کہ (۱) بدعتی کو توبہ نصیب نہیں ہوگی۔ (۲) بدعتی کی مجلس شرابی کی مجلس سے بدتر ہے (۳) بدعتی کو جنت نصیب نہیں ہوگی۔ (۴) بدعتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے محروم رہے گا (۵) بدعتی کی فرض، نفل کوئی عبادت دربار الٰہی میں قبول نہیں ہوگی۔ (۶) بدعتی کو سلام کرنا درست نہیں ہے۔ (۷) بدعتی پر تمام خلائق کی لعنت ہے۔ (۸) کارِ بدعت شیطان کے نزدیک گناہوں سے زیادہ محبوب ہے انتہی کلامہ۔

جس سے مجلس کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں، لوگوں نے کہا جب تک صحیح فتوی نہ آوے تب تک مولانا صاحب کو دوبارہ دعوت دیں گے۔

اب سوال یہ کہ مذکورہ بالا باتیں حدیث اور شرعی دلائل سے ثابت ومنقول ہیں یا نہیں؟ جبکہ بعض مذکورہ باتوں میں بہت زیادہ شدت معلوم ہوتی ہے۔

الجواب وھوالموفّق للصّواب

جواب (۱):- صاحب بدعت جبکہ بدعت کو کار ثواب سمجھ کر کرتا ہے اسلئے اس کو نہیں چھوڑتا تو اُسے توبہ کیسے نصیب ہوگی، لہذا یہ بات واعظ صاحب کی درست ہے۔

(۱) حدیث شریف میں ہے:

عن أنس بن مالك رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن الله حجب التوبة عن كل صاحب بدعة حتى يدع بدعته. رواه الطبرانى فى الأوسط وإسناده حسن رواه ابن ماجة الخ.

(الترغيب والترهيب من ترك السنة وارتكاب البدع والأهواء)

ترجمہ: حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کا دروازہ بند کر دیا۔

(۲) حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم أبىٰ اللّٰه أن يقبل عمل صاحب بدعة حتى يدع بدعته (رواه ابن ماجة)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو ترک نہ کر دے۔

(۳) عن عمر بن الخطاب رضى اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قال لعائشة رضى اللّٰه عنها إن الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعًا أنهم إنما هم أصحاب البدع وأصحاب الأهواء وأصحاب الضلالة من هذه الأمة ياعائشة إن لكل صاحب ذنب توبة غير أصحاب البدع وأصحاب الأهواء ليس لهم توبة وأنا برى منهم وهم منابرآء. (تفسير قرطبى تحت قوله تعالىٰ ان الذين فرقوا دينهم الخ). (سورة الانعام: اية ۱۵۹، ج ۷ ص ۹۷. طبع دارالكتب العلمية بيروت).

پس مذکورہ بالا حدیثوں سے ثابت ہوگیا کہ صاحب بدعت کو توبہ نصیب نہیں ہوگی جبکہ اسکے عقائد کفر تک پہنچ چکے ہوں، البتہ بدعتی اگر اپنی گمراہی کو سمجھ کر خالص دل سے توبہ کرے اور جملۂ بدعات کو چھوڑ دے اور گذشتہ کیئے ہوئے پر نادم اور شرمندہ ہوگا تو اس کی توبہ قبول ہوگی۔

جواب (۲): - بدعتی کی مجلس شرابی کی مجلس سے بدتر ہے یہ بھی درست ہے، اس کی وجہ یہ کہ شرابی شراب کو برُا اور شراب پینے کو کار بد جانتا ہے مگر نفس کے دھوکے میں پیتا ہے پھر جب اس کو احساس ہو جائے گا تو وہ اس سے باز آجائے گا، بخلاف بدعتی کے اس لئے کہ بدعتی امرِ بدعت کو کار ثواب بلکہ نیکی سمجھ کر اس کو بجالاتا ہے اس سے باز نہیں آتا ہاں اللہ تعالیٰ نے اگر سمجھ دیدی پھر توبہ کریگا تو توبہ قبول ہوگی۔

قال فى "تفسير القرطبى" أحمد بن حنبل والأوزعى وابن المبارك فإنهم قالوا فى رجل شأنه مجالسة أهل البدع قالوا ينهى عن مجالستهم فإن انتهى وإلا ألحق بهم يعنون فى الحكم وقد حمل عمربن عبدالعزيز الحد على مجالس شربة الخمر وتلا "أنكم إذا مثلهم" قيل له: فإنه يقول إنى أجالسهم

لأبانيهم وأردعليهم قال ينهى عن مجالستهم فإن لم انته ألحق بهم.

(سورة الانعام: اية ۱۵۹، ج ۷ ص ۹۴. طبع دار الكتب العلمية بيروت).

جواب (۳): — حدیث شریف میں ہے کہ تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ کی بڑی دشمنی ہے۔

عن ابن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أبغض الناس إلى الله ثلاث ملحد في الحرم ومبتغٍ في الإسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق ليهريق دمه متفق عليه.

(مشكوة: باب الاعتصام بالكتاب والسنة: ج ۱ ص ۲۷)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تین افراد ہیں (ایک تو) حدود حرم میں الحاد یعنی کجروی کرنے والا، کفر کرنے والا معصیت کو پھیلانے والا اور (دوسرے) اسلام میں زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج کو تلاش کرنے والا اور (تیسرا) کسی مسلمان کے خون ناحق کا طلبگار تا کہ اس کے خون کو بہائے (بخاری)

تشریح: "ملحد في الحرم" الحاد کے معنی ہیں: راہ سنت سے ہٹ جانا تو ملحد فی الحرم سے وہ شخص مراد ہے جو حرم شریف کی حدود میں وہ کام کرے جس کا اس جگہ کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، مثلاً لڑنا جھگڑنا اور شکار کرنا وغیرہ، یا مطلق گناہ ومعصیت کا مرتکب ہونا اور یہاں پر مراد اہلسنت والجماعت کے خلاف عقائد کا اظہار کرنا ہے پس یوں تو الحاد کا ارتکاب مطلقاً قبیح اور برا فعل ہے مگر جب اس کا ارتکاب حرم شریف کی حدود میں ظاہر ہو تو پھر اس کی قباحت اور برائی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

"ومبتغٍ في الإسلام سنة الجاهلية" یعنی کسی مسلمان کا ان رسوم ورواج کو زندہ کرنا، اور ان کو اختیار کرنا جو زمانہ جاہلیت سے مختص ہیں جیسے نوحہ وماتم کرنا، کسی آفت ومصیبت کے وقت دامن وگریبان چاک کرنا، بدشگونی لینا، نوروز کا تہوار منانا، اور اسی طرح کفر کے زمانہ کی بدعات ورسموں کی پیروی کرنا مطلب یہ کہ یوں تو دین وشریعت کے خلاف مطلق کوئی نئی بات نکالنا اور اس کو رواج دینا بدعت اور برائی ہے، لیکن حرم کی حدود میں برائیوں کو زندہ کرنا اور ان کو اختیار کرنا بہت ہی برا اور اللہ کے نزدیک نہایت سخت ناپسندیدہ کام ہے، جو اسلام کی (روشنی پھیلنے سے پہلے زمانۂ جاہلیت کی تاریکی کا حصہ تھا اور جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے پیروں تلے روند ڈالا تھا اس کو پھر سے شروع کرنا۔

"ومطلب دم امرئ مسلم بغير حق" یعنی محض خونریزی کے قصد سے کسی مسلمان کے قتل کی خواہش وطلب رکھنا مطلب یہ کہ یوں تو مطلق انسان کے قتل کے لئے کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے، لیکن

جب قتل کی خواہش وطلب کسی مسلمان کے خون سے ہو اور وہ بھی محض خونریزی کے مقصد سے پھر حرم شریف کی حدود میں ہو تو اس کا گناہ کہیں زیادہ بڑھ کر ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب معصیت کی خواہش وطلب پر یہ وعید ہے، تو اس معصیت کے مرتکب کا کیا حال ہوگا۔

جواب (۴):- بدعتی جنت میں داخل نہیں ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بدعتی کا عقیدہ کفر تک ہوگا، وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، البتہ جس بدعتی کا عقیدہ کفر تک نہیں پہنچا بلکہ اس سے کم ہے یعنی گناہ کبیرہ کے درجہ میں ہے تو وہ اپنے ارتکاب کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا، نیک اور دیندار ہونے کے باوجود بدعات کی وجہ سے جہنم میں جائیگا اگر اللہ نے معاف نہ کیا پھر سزا بھگتنے کے بعد ایمان اور نیکیوں کی وجہ سے جنت میں جائیگا۔

کما فی "القرطبی "قال سهل لاأعلم حديثًا جاء فی المبتدعة أشد من هذا الحديث حجب الله الجنة عن صاحب البدعة. (تفسير قرطبی تحت قوله تعالىٰ :"وإن هذا صراطی مستقيمًا" الخ

(سورة الأنعام:ایت ۱۵۳، ج۷ص ۹۱ طبع دارالكتب العلمية بيروت)

جواب (۵):- بدعتی اگر بدعت میں مرگیا اور بدعت سے توبہ نہ کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محروم رہے گا۔ حدیث شریف میں ہے:

عن سهل بن سعد قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إنی فرطكم علی الحوض من مر علی شرب ومن شرب لم يظماء ابدًا ليردن علی أقوام أعرفهم ويعرفوننی ثم يحال بينی وبينهم فأقول إنهم منی فيقال إنک لاتدری ماأحدثوا بعدک فأقول سحقًا سحقًا لمن غير بعدی متفق عليه .

(مشكوة : باب الحوض ز الشفاعة ج۲ ص۴۸۷)

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں حوض کوثر پر تمہارا امیر سامان ہوں گا یعنی وہاں سب سے پہلے میں پہنچ کر تمہارا استقبال کروں گا جو شخص بھی میرے پاس سے گذریگا وہ اس حوض کوثر کا پانی پئے گا اور جو شخص بھی اس کا پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہیں رہے گا، وہاں میرے پاس (میری امت کے) کچھ ایسے لوگ بھی آئیں گے جنہیں میں پہچان لوں گا اور وہ مجھے پہچان لیں گے لیکن پھر میرے اور ان کے درمیان کوئی چیز حائل کردیجائیگی تاکہ وہ مجھ سے اور حوض کوثر سے دور رہیں میں (یہ دیکھ کر) کہوں گا کہ یہ لوگ تو میرے اپنے معلوم ہوتے ہیں (یعنی یہ لوگ میری امت کے افراد ہیں،

پھران کو میرے پاس آنے سے کیوں روکا جارہا ہے؟ (اس کے جواب میں مجھے بتایا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم، انہوں نے آپکے بعد دین کے اندر کیا کیا، نئی باتیں پیدا کیں ہیں یہ سنکر میں کہوں گا کہ وہ لوگ دور ہوں مجھ سے دور ہوں خدا کی رحمت سے دور ہوں جنہوں نے میری وفات کے بعد سنت میں تبدیلی کی۔

تشریح:- ایک احتمال یہ ہوسکتا ہے کہ اس حدیث میں مذکورہ لوگوں سے مراد ایسے اہل بدعت ہوں جو دین میں نئی نئی باتیں نکالنے والے ہوں لیکن یہ بات چونکہ ثابت ہے کہ اس امت کا کوئی بھی گناہ گار خواہ کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، حوض کوثر پر آنے اور اس کا پانی پینے سے روکا نہیں جائے گا، اس لئے یہ احتمال سرے سے رد ہو جاتا ہے، ہاں اگر بدعت کا تعلق دین وملت میں کوئی ایسی نئی بات پیدا کرنے سے ہو، جس سے اصول دین کی نفی ہوتی ہو اور نبوت وشریعت پر براہ راست اس طرح کی زد پڑتی ہو کہ اس پر کفر آسکتا ہے، تو اس درجہ کا اہل بدعت یقیناً مرتد ہی کہلائیں اور ان لوگوں کو اس حدیث کا محمول قرار دیا جاسکتا ہے۔ (مظاہر حق ج ۱ ص ۴۵۲)

جواب (۵):- بدعتی کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔

عن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايقبل الله لصاحب بدعة صومًا ولاصلاةً ولاصدقةً ولاحجًا ولاعمرةً ولاجهادًا ولاصرفًا ولاعدلاً يخرج عن الإسلام كماتخرج الشعرة من العجين . (ابن ماجة: باب اجتناب البدع)

ترجمہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے اور نہ نماز اور نہ صدقہ اور نہ حج اور نہ عمرہ اور نہ جہاد اور نہ کوئی فرض عبادت قبول کرتا ہے اور نہ نفلی عبادت، بدعتی اسلام سے ایسے خارج ہو جاتا ہے جیسے گوندھے ہوئے آٹے سے بال نکل جاتا ہے۔

بدعتی کی فرض اور نفلی عبادات کچھ قبول نہ ہونے کی دو وجہ ہیں:

اول:- جس کی بدعت کا عقیدہ کفر کی حد تک پہنچ گیا ہو، اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی جبکہ عبادت قبول ہونے کیلئے ایمان شرط ہے۔

دوم:- بدعت اگر اعمال میں ہے عقیدہ کی حد تک نہیں، تو ایسے شخص کو بدعات پر مشتمل عبادت کا ثواب کم ملے گا، مکمل ثواب نہیں ملے گا، تعبیر میں مطلق ثواب نہ ملنے کا بیان تشدیداً ہے۔

جواب (۶):- بدعتی عالم کو سلام کرنا اور تعظیم کرنا درست نہیں ہے۔

عن إبراهيم بن ميسرة قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من وقّر صاحب بدعة فقد أعان على هدم الإسلام رواه البيهقى فى شعب الإيمان مرسلاً. (مشکوۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ج ۱ ص ۳۱)

ترجمہ: حضرت ابراہیم بن میسرۃ رحمہ اللہ (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے بدعت (ایجاد کرنے اور بدعت پر عمل کرنے) والے کی عزت وتوقیر کی اس نے درحقیقت اسلام کی عمارت کو ڈھانے میں مدد کی۔

تشریح: اہل بدعت چونکہ عقائد وخیالات اور اپنے قول وعمل کے ذریعہ دراصل سنت کی مخالفت کرتے ہیں اس لئے بدعتی کی تعظیم وتوقیر اور عزت کرنے کا مطلب سنت کی تحقیر کرنا ہے، جبکہ سنت کی تحقیر کرنا دین کی بنیاد کو کمزور کرنا اور اسلام کی عمارت کو ویران کرنے کے مترادف ہے، اس پر قیاس کر کے سمجھا جاسکتا ہے کہ اہل سنت کی تعظیم وتوقیر کرنا اور اہل بدعت کی تحقیر کرنے کا مطلب دین کی بنیاد کو مستحکم کرنا اور اسلام کو آباد کرنا ہے جو کہ اللہ کے رسول ﷺ کو مطلوب ومحبوب ہے۔

جواب (۷): ۔ بدعتی پر تمام خلائق کی لعنت ہیں۔ بخاری شریف میں ہے:

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم المدينة حرام ما بين عير إلى ثور فمن أحدث فيها حدثًا أو اٰوٰى محدثًا فعليه لعنة اللّٰه والملائكة والناس أجمعين لايقبل منه صرف ولاعدل. (بخاری: ج ۲ ص ۱۰۸۴، مسلم: ج ۱ ص ۱۴۴)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ مدینہ منوّرہ کے مقام عیر سے لیکر مقام ثور تک حرم ہے، سو جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو نہ تو اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔

(۲) عن أنس بن مالك عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال المدينة حرم من كذا إلى كذا لايقطع شجرها ولايحدث فيها حدث من أحدث فيها حدثًا فعليه لعنة اللّٰه والملائكة والناس أجمعين. (بخاری: کتاب الحج، فضائل المدینۃ: ج ۱ ص ۲۰۱)

قال فى "عمدة القارى" قوله "حدثاً" هو الأمور الحادث المنكر الذى ليس بمعتاد ولامعروف فى السنة والمحدث يروى بكسر الدال وفتحها على الفاعل والمفعول بمعنى الكسر من نصر جانيا و آواه اجاره من خصمه وحال بينه وبين أن يقتص منه والفتح هو الأمرا المبتدع. (ج ۱۰ ص ۲۲۹)

جواب (۸):- بدعت شیطان کے نزدیک گناہوں سے زیادہ محبوب ہے اور بدعت کے ذریعہ جس قدر شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے، اسقدر عام گناہوں کے ذریعہ گمراہ نہیں کرسکتا، کیونکہ دوسرے گناہوں کو آدمی شیطانی کام سمجھتا ہے مگر نفس کے دھوکے میں پڑکر اس کو کرتا ہے تو گناہ سمجھتے ہوئے کرتا ہے لہذا جب اس کو خدا کا خوف آتا ہے تو وہ معافی مانگتا ہے، توبہ کرتا ہے، جبکہ بدعت ایسی نہیں۔

سفیان ثوری کا قول ہے:

البدعة أحب إلى إبليس من المعصية يتاب منها و البدعة لايتاب منها. (تفسير قرطبي تحت قوله تعالىٰ: وأنّ هذاصراطي مستقيما الخ
(سورة الأنعام ايت: ۱۵۳. ج۷ص ۹۲)

غرض یہ کہ بدعت کو آدمی دین سمجھ کر کرتا ہے، ثواب سمجھ کر کرتا ہے لہذا اس سے کم لوگ ہی توبہ کرتے ہیں پھر اسی میں مرجاتے ہیں اللہ کے یہاں مواخذہ ہوتا ہے الا یہ کہ اللہ تعالی نے اگر کسی کو ہدایت دیدی تو اس نے توبہ کرلی۔

فقط و اللّٰہ علم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۲۹ر صفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۹ر صفر ۱۴۲۷ھ

ایصال ثواب کیلئے سوم، چہارم، دسواں، چالیسواں دن جمع ہونا

(۳۷) سوال:- میت کے گھر میں سوم، چہارم، دسواں، چالیسواں کرنا جس میں خویش واقاریب جمع ہوتے ہیں اور اہل میت ایصال ثواب کے لئے ضیافت کا انتظام کرتے ہیں، یہ رواج کہاں تک درست ہے؟ خود میت کے مرنے کے دن اہل میت کی ضیافت کا انتظام کرنا کیسا ہے؟

الجواب وھوالموفّق للصّواب

بصورت مسئولہ میت کے مرنے کے دن اور تیسرے اور چوتھے اور دسواں، گیارھواں، چالیسواں وغیرہ دنوں کو زیادہ باعث ثواب سمجھنا غلط اور بدعت ہیں خاص کر کے میت کے گھر میں مرنے کے دن ضیافت کا انتظام کرنا خلاف سنت ہے اور قساوت قلبی کی نشانی ہے بلکہ سنت تو یہ ہے کہ پڑوس کے لوگ

اہل میت کو دعوت کریں، ایصال ثواب تو سال کے کسی دن بھی جائز ہے اور غم کے دن کھانا پکانا، خوشی کرنا عند الشرع منع ہے، چنانچہ:

(۱) امام احمد بن حنبل اپنی مسند اور امام ابن ماجہ سنن میں بسند صحیح حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

کنا نعد الاجتماع إلى أهل الميت وصنعهم الطعام من النياحة

ترجمہ: ہم (گروہ صحابہ) اہل میت کے یہاں جمع ہونے اور ان کے لئے کھانا تیار کرنے کو نیاحت میں سے شمار کرتے تھے (جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فریا ہے)۔

(۲) محقق ابن ہمام رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یکره اتخاذ الضیافة من الطعام من أهل المیت لأنه شرع فی السرور لا فی الشرور وهی بدعة مستقبحة.

ترجمہ: یعنی اہل میت کی طرف سے کھانے کی ضیافت تیار کرنا منع ہے کیونکہ شرع نے ضیافت خوشی میں رکھی ہے نہ کہ غمی میں اور یہ بدعت شنیع ہے، واللہ اعلم

کتبہ: محمد کمال حسین موشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ	۱۲ ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

ہر نماز کے بعد مصافحہ کا التزام بدعت ہے

(۳۸) سوال:- جناب مفتی صاحب! چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) کسی نماز کے بعد مصافحہ کا التزام کرنا کیسا ہے؟

(۲) عیدین یا جمعہ کے خطبہ ثانی میں مقتدیوں کا ہاتھ اٹھا کر آمین کہنا کیسا ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱):- نمازوں کے بعد مصافحہ کا التزام کرنا بدعت ہے، یہ روافض کا طریقہ ہے، البتہ دور سے آنے والے کے ساتھ سلام، مصافحہ، معانقہ سنت ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ فتاوی شامی میں فرماتے ہیں:

نقل فی تبیین المحارم عن الملتقط أنه تکره المصافحة بعد أداء الصلوٰة لکل حال لأن الصحابة رضی اللّٰه عنهم ماصافحوا بعدأداء الصلاة ولأنهامن سنن الروافض ثم نقل عن ابن حجر من الشافعیة أنها بدعة مکروهة لاأصل لهافی الشرع وأنه ینبه فاعله أولاً ویعزر ثانیًا ثم قال ابن الحاج من المالکیة فی المدخل أنها من البدع وموضع المصافحة فی الشرع إنماهو عندلقاء المسلم لأخیه لافی إدبار الصلوٰة فحیث وضعها الشرع یضعها فینهی عن ذلک ویزجر فاعله لما أتی به من خلاف السنة ۔ (ج۵ص۲۷۰)

عبارت بالا سے ثابت ہوا کہ مصافحہ مسلمانوں کی باہم ملاقات کے وقت مسنون ہے، جن غائبین سے قبل الصلوٰۃ ملاقات نہ ہوئی ہوں بعداز نماز ان سے ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون اور مشروع ہے اور جن سے قبل الصلوۃ ملاقات ہو چکی ہے پھر نماز کے بعد ملاقات کرنا، مصافحہ کرنا اور اس کو کار ثواب سمجھنا بدعت ہے۔

جواب (۲): - خطبۂ ثانی کے وقت بھی خطبہ کا سننا اور کان لگا کر اس کی طرف متوجہ اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فلہٰذا زور سے آمین کہنا یا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا وغیرہ امور ناجائز اور بدعت ہیں، لیکن خاموشی کے ساتھ دل دل میں آمین آمین کہنا جائز ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ علم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
یکم ربیع الاول ۱۴۲۷ھ	یکم ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

کھانے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بدعت ہے

(۳۹) سوال: - جناب مفتی صاحب! دعوت میں کھانا کھانے کے بعد اہل طعام کیلئے اجتماعی طور پر رفع یدین کے ساتھ دعا کرنا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعوت میں کھانا کھانے کے بعد اہل طعام کے لئے دعا کرتے تھے، اور یہ دعا عام طور پر بدون ہاتھ اٹھائے ہوتی تھی، چنانچہ حدیث میں ہے:

عن عبد اللّٰه بن بسر عن أبیه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نزل علیه

فأتوه بطعام فكان يأكل التمر ويضع النوى على ظهر إصبعه ثم يرمى به قال ثم قام يركب بغلةله بيضاء فقمت لآخذبركابه فقلت يارسول الله ادع الله لنا قال: "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَارَزَقْتَهُمْ فَاغْفِرْلَهُمْ فَارْحَمْهُمْ"

(عمل اليوم والليلة مايقول إذا أكل عنده قوم)

ترجمہ: حضرت بسر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لائے تو وہ آپ کے لئے کھانا لائے آپ کھجوریں کھاتے اور گٹھلیاں اپنی انگلی کی پشت پر رکھ کر پھینک دیتے، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے سفید رنگ کے خچر پر سوار ہونے لگے تو میں بھی کھڑا ہو گیا، تا کہ آپ کی رکاب کو تھاموں، پھر میں نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر! ہمارے لئے دعاء کریں، آپ نے درج ذیل الفاظ سے دعاء فرمائی:

"اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ فَاغْفِرْ لَهُمْ وَارْحَمْهُمْ"

ترجمہ: اے اللہ! تو نے انہیں جو روزی عطا فرمائی ہے اس میں برکت دے ان کے گناہ معاف فرما اور ان پر رحم فرما۔

تو حدیث مذکورہ میں دعاء کا ذکر ہے مگر رفع یدین کا ذکر نہیں ہے اور حضرت محدث شاہ اسحاق دہلویؒ فرماتے ہیں "عدم نقل از حضور اکرم صلی اللہ وسلم وصحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین دلالت بر بدعت و کراہت فعل دارد و اصرار بر بدعت مکروہ و گناہ کبیرہ است"۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا طریقہ خلاف سنت اور بدعت ہے، اس سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ لوگ اسکو سنت اور ضروری سمجھنے لگیں گے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۵/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بدعت ہے

(۴۰) سوال:- جناب مفتی صاحب! مجھے بعض سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) اذان کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

(۲) اہل بدعت کہتے ہیں کہ ماہ صفر کے آخری بدھ کو آپ ﷺ کو مرض سے شفا ہوئی تھی، اسلئے اسی خوشی پر اسی دن عمدہ کھانا پکانا چاہئے اور لوگ اس دن ائمہ مساجد سے پانی پر دم کرواتے ہیں اور اس کو پیتے ہیں، اس سے غسل کرتے ہیں اب سوال یہ کہ مذکورہ امور شرعاً ثابت ہیں یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق الصواب

جواب (۱): - مطلق دعا کے لئے رفع یدین مستحب ہے اور جن مواقع میں شریعت نے صرف خاص الفاظ کے ساتھ دعا کی تعلیم دی، رفع یدین کی تعلیم نہیں دی مثلاً مسجد میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت اور بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت اور بوقت جماع وغیرہ، ان مواقع میں رفع یدین کے ساتھ دعا کرنا بدعت ہے، کیونکہ ان مواقع میں رفع یدین کے ساتھ دعا کرنا ازروئے شرع ثابت نہیں ہے اور حضرت محدث شاہ اسحاق دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عدم نقل از حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابۂ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ دلالت بر بدعت وکراہت فعل دارد واصرار بر بدعت مکروہ (تحریمی) وگناہ کبیرہ است۔ (مأۃ مسائل: ص۸۳)

فلہٰذا اذان کے بعد رفع یدین کے ساتھ دعا کرنا جب سنت سے ثابت نہیں تو بدعت ہے۔

جواب (۲): - مذکورہ بالا امور اگر سنت یا مستحب ہوتے تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ضرور کرتے چونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین وسلف صالحین سے ان امور کا کارِ ثواب ہونا ثابت نہیں ہے اسلئے یہ امور بدعت ہیں اور واجب الترک ہیں۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۵؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ	۵؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

دفن کے وقت قبر پر اذان دینا بدعت ہے

(۴۱) سوال: - جناب مفتی صاحب! مجھے بعض سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) میت کو دفن کرتے وقت قبر پر اذان کہنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

(۲) فاتحہ خوانی کا مسنون وصحیح طریقہ کیا ہے؟

(۳) ایصال ثواب کے لئے ستر ۷۰ ہزار مرتبہ کلمۂ طیبہ کا پڑھنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

جواب (۱):- میّت کو قبر میں اُتارتے وقت اذان دینا بدعت ہے کتاب وسنت سے ثابت نہیں چنانچہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اپنے فتاوی میں لکھا ہے:

قد شرح ابن حجر فی فتاواہ بأنہ بدعۃ الخ. (شامیۃ: باب الأذان، تحت مطلب فی المواضع التی یندب لھا الاذان فی غیر الصلوٰۃ : ۳/ ۳۸۵)

یعنی میت کو قبر میں اتارتے وقت قبر پر اذان دینا بدعت ہے پس اس سے اجتناب ضروری ہے۔

جواب (۲):- فاتحہ خوانی وایصال ثواب کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مالی عبادت یا بدنی عبادت محض خوشنودیٔ باری تعالیٰ کی نیت سے ادا کرکے اس کا ثواب میّت کے لئے بخش دے اور اس میں خاص چیز یا خاص تاریخ یا خاص ہیئت کی تخصیص نہ کرے اور ایصال ثواب کے لئے قبرستان میں جانا بھی ضروری نہیں، البتہ اگر جائے تو مسنون دعا پڑھکر کچھ سورتیں پڑھ کر استغفار کردینے سے بھی فاتحہ خوانی ہوجائے گی، یہی اس کا مسنون وصحیح طریقہ ہے۔

جواب (۳):- عبادت بدنی جیسی نفلی نماز، تلاوتِ قرآن، روزہ، نفل حج اور عبادت مالی جیسے صدقہ وخیرات وغیرہ کرکے ایصال ثواب کرنا کتابوں سے ثابت ہے۔

لہٰذا کلمۂ طیبہ پڑھ کر ایصال ثواب بھی جائز ہے، البتہ خاص عدد اور خاص ترتیب کا اہتمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ثابت نہیں ہے، اس لئے اس کو ضروری سمجھنا بدعت ہے، ہاں اگر اس کو ضروری نہ جانے اور تداعی اور اعلان واشتہار سے نہ ہو اور اجرت کے عوض میں نہ ہو تو جائز ہے، بلکہ ثواب عظیم ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۰ر محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

میّت کے سینہ پر کلمۂ شہادت لکھنا

(۴۲) سوال:- جناب مفتی صاحب! مجھے بعض سوالات معروض ہیں کہ کتب فقہ وفتاویٰ کے حوالہ سے امید ہے جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) میّت کے سینہ پر کلمۂ شہادت لکھنا کیسا ہے؟

(۲) ایصال ثواب کے کھانے پر فاتحہ خوانی کرنا یعنی کھانا سامنے رکھے جاتے ہیں پھر ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھکر میّت کو بخشتے ہیں اس کے بعد کھانا کھایا جاتا ہے، یہ طریقہ شرعاً کیسا ہے؟

(۳) جنازے کے ساتھ بلند آواز سے کلمۂ طیبہ اور اللّٰہ ربنا و محمد نبینا وغیرہ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱): -میت کے سینہ یا پیشانی یا کفن پر سیاہی کے ذریعہ کلمۂ شہادت وغیرہ لکھنا درست نہیں، چونکہ میت کے پھٹنے کی وجہ سے لکھائی کی بے حرمتی ہوگی لہذا مکروہ تحریمی ہے۔

کمافی " الشامية" : وقد أفتى ابن الصلاح بأنه لايجوز أن يكتب على الكفن يٰس والكهف ونحوهما خوفًا من صديدالميت ...... نقل بعض المحشين عن فوائد الشرجی أن مما يكتب على جبهة الميت بغير مداد بالإصبع المسبّحة بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم وعلى الصدر لاإله إلااللّٰه محمد رسول اللّٰه وذلک بعد الغسل قبل التكفين. (باب صلوة الجنائز مطلب ... فيما يكتب على كفن الميت: ج ا ص ۲۴۶)

شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر روشنائی کے صرف انگلی سے میت کے سینہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا کلمۂ طیبہ لکھنا درست ہے، مگر موجودہ زمانہ میں اس سے باز رہنا ضروری ہے ورنہ کچھ دن بعد لوگ اس کو ضروری اور سنت سمجھنے لگیں گے۔

جواب (۲): -صورت مسئولہ میں ایصال ثواب کیلئے اگر کسی قاری صاحب کو بلایا گیا ہے اور اس کو قرآن شریف کی تلاوت کے لئے کہا گیا ہے بعد تلاوتِ قرآن اس کو کھانا کھلایا گیا ہے تو ایصال ثواب اور فاتحہ خوانی کا یہ طریقہ بدعت ہے۔

چنانچہ "فتاوی سمرقندیؒ" میں ہے:

قرأة الفاتحة والإخلاص والكافرون على الطعام بدعة.

اور اس کے ثبوت میں بریلوی حضرات جو حدیث پیش کرتے ہیں وہ موضوع ہے، ہاں اگر ایصال ثواب کے لئے قاری صاحب نے ازخود تلاوت کردی اور صاحب دعوت نے برائے ایصال ثواب کے دعوت کا کھانا کھلادیا تو یہ جائز ہے۔

جواب (۳): - جنازے کے ساتھ استغفار اور ذکر خفی کی اجازت ہے، ذکر بالجہر وغیرہ کی اجازت نہیں فقہائے کرام نے اس کو مکروہ لکھا ہے۔ چنانچہ:

(۱) علامہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

عن قیاس بن عبادة قال کان أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یکرهون الصوت عند ثلاث الجنائز والقتال والذکر. (کتاب السیر، بحر: ج۵ ص۷۶)

(۲) فتاوی سراجیہ میں ہے:

وفی منزل المیت رفع الصوت بالذکر وقرأة القرآن وقولهم کل حیئ لایموت ونحوذلک خلف الجنازة بدعة.

(کتاب الجنائز باب حمل الجنازة : ص ۲۳ طبع کراچی)

مذکورہ حوالا جات سے صراحۃً یہ بات معلوم ہوگئی کہ جنازے کے ساتھ دل دل میں ذکر واستغفار وغیرہ کرنے کی اجازت ہے جہراً ذکر کرنا مکروہ ہے، لہٰذا صورت مسئولہ کا طریقہ خلاف سنت اور بدعت ہے، واجب الترک ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ	۲۲؍ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ

نماز جنازے کے بعد جنازے کو روک کر دعا کرنا کیسا ہے؟

۴۳) سوال: - جناب مفتی صاحب! ہمارے یہاں رواج ہے کہ لوگ نماز جنازہ کے بعد فوراً سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں اور ہاتھ اٹھا کر سب ملکر دعا کرتے ہیں پھر دفن کے بعد میت کے گھر جا کر سورۂ فاتحہ پڑھتے ہیں، اب سوال یہ کہ مذکورہ طریقہ شرعاً ثابت ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نمازِ جنازہ سے فارغ ہونے کے بعد جنازہ کو اسی جگہ چھوڑ کر سورۂ فاتحہ پڑھنے کا اعلان یہ رواج خلاف سنت اور بدعت ہے، ویسا ہی اعلان اور تداعی کے ساتھ گھر میں آکر سورہ فاتحہ پڑھنا بھی بدعت ہے، البتہ جنازہ لیکر جاتے وقت دل دل میں سورتیں یا آیات قرآنیہ تلاوت کر سکتے ہیں، میت کے لئے استغفار کر سکتے ہیں، یہ جائز ہے۔ چنانچہ:

(۱) قال فی "الخلاصة": لایقوم بالدعاء فی قراۃ القرآن لأجل المیت بعد صلوٰۃ الجنازۃ وقبلها. (ج ۱ ص ۲۲۵)

(۲) وفی "الشامیة": بل إذا فرغ ورجع الناس من الدفن فلیتفرقوا یشتغل الناس بأمورهم وصاحب البیت بأمره.

(نوٹ) واضح رہے کہ دفن سے فارغ ہوکر میت کے لئے مغفرت کی دعا کرنا اور قرآن وغیرہ پڑھ کر بخشنا مسنون اور مستحب ہے، یہ عمل حدیث سے ثابت ومنقول ہے۔ چنانچہ فتاوی شامیہ میں ہے:

(قوله وجلوس الخ) لما فی سنن أبی داود کان النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم إذا فرغ من دفن المیت وقف علی قبره وقال استغفروا لأخیکم واسألوا اللّٰہ له التثبیت فأنه الآن یسأل وکان ابن عمر یستحب أن یقرأ علی القبر بعد الدفن أول سورة البقرة وخاتمتها الخ. (کتاب الصلاۃ: باب صلوٰۃ الجنازۃ: ج ۲ ص ۲۳۷).

فقط واللّٰہ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
یکم ربیع الاول ۱۴۲۴ھ	یکم ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

وعظ کے شروع یا دوران میں اجتماعی طور پر درود پڑھنا

(۴۴) سوال:- جناب مفتی صاحب! بعض واعظین حضرات وعظ کے شروع یا دوران میں اجتماعی طور پر درود شریف پڑھتے ہیں، یہ طریقہ کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

درود شریف پڑھنا ایک بہت بڑی عبادت ہے اسکا مسنون طریقہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر آہستہ آہستہ جتنا چاہے درود شریف پڑھے، سوالِ مذکورہ کے دو طریقوں میں سے پہلا طریقہ یعنی ابتداءِ وعظ میں درود ماثورہ پڑھنا جائز ہے بلکہ سنت ہے اور باعث برکت وثواب ہے اور درمیان وعظ میں اگر آپ کا اسم گرامی آگیا تو بھی درود ماثورہ "صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" پڑھنا مستحب ہے لیکن مروّجہ درود جیسا

کہ اہل بدعت ابتداء میں پڑھتے ہیں، آپ کے نام آئے بغیر مروّجہ ''صلوٰۃ یا رسول اللہ'' وغیرہ کے الفاظ سے پڑھتے ہیں ایسا درود احادیث سے ثابت نہیں بلکہ یہ بدعت ہیں اس کو ترک کرنا ضروری ہے ہاں حدیث میں ماثور اور منقول درود پڑھ سکتے ہیں۔

(۱) في "البزازية": وقد صح عن ابن مسعود أنه سمع قومًا اجتمعوا في مسجد يهللون ويصلون عليه الصلاة والسلام جهرًا افراح إليهم فقال ماعهدنا ذلك على عهده عليه السلام وماأراكم إلا مبتدعين فمازال يذكر ذلك حتى أخرجهم من المسجد. (بزازية على هامش العالمگيرية: ج۶ ص۳۷۸)

(۲) قال في "الشامية": تحت (قول وتمامه قبيل جنايات البزازية) ونصه صح عن ابن مسعود أنه أخرج جماعة من المسجد يهللون و يصلون على النبي صلى الله عليه وسلم جهرًا قال لهم ماأراكم إلا مبتدعين. (ردالمحتار)

مذکورہ بالا عبارات سے واضح ہوگیا کہ مروّجہ صلوٰۃ وسلام یعنی بہیئت اجتماعیہ بلند آواز سے صلاۃ وسلام پڑھنے کا طریقہ خیر القرون سے اس کا کہیں بھی ثبوت ومنقول نہیں ہے پس یہ طریقہ بدعت ہے واجب الترک ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۳؍ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

بارھویں ربیع الاوّل کو باجماعت دو رکعت نفلی نماز پڑھنا کیسا ہے

(۴۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے یہاں بارھویں ربیع الاوّل کو شہر کے لوگ کسی ایک جگہ پر جمع ہوتے ہیں اور وہاں ایک بزرگ آتے ہیں پھر وہ بزرگ جماعت کے ساتھ دو رکعت عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے نفلی نماز پڑھاتے ہیں اور قیام ومیلاد شریف و سلاماً علیک یا رسول اللہ وغیرہ پڑھکر مناجات کرتے ہیں، اب سوال یہ کہ مذکورہ امور از روئے شرع کیسے ہیں؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وھو الموفق للصواب

بارہ ربیع الاوّل کو اسطرح نفلی نماز اور میلاد پڑھنے کا رواج خیر القرون میں نہ تھا، اگر اسکا ثواب

ہونا ثابت ہوتا تو خیر القرون سے اس کی نقل ہوتی اس لئے صورت مسئولہ کے تمام امور نا جائز و بدعت ہیں واجب الترک ہیں، ہاں انفرادی طور پر جس قدر چاہیں پڑھ لیوے تو عام نفلوں میں جیسے ثواب ہوگا اس میں بھی ثواب ہوگا۔

(۱) کما قال فی "المدخل لابن الحاج": ومن جملة ماأحدثوه من البدع مع اعتقادهم أن ذلک من أکبر العبادات وإظهار الشعائروما یفعلونه فی شهر ربیع الأوّل من المولد. (فصل فی مولد النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ومافیه من البدع والمنکرات الیوم: ج۲ ص۳)

(۲) علامہ حسن بن علی رحمہ اللہ " طریقة السنة "میں لکھتے:

ومأاحدثته الصوفیة الجهلة من مجلس المولد فی شهر الربیع الاوّل لاأصل له فی الشرع بل هوبدعة مذمومة . (الجنة لأهل السنة :ص۱۷۸)

(۳) حافظ ابوبکر بغدادی الشہیر ابن نقطہ رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

إن عمل المولد لم ینقل عن السلف ولاخیر فی مالم یعمل السلف (الجنة لأهل السنة :ص۱۷۸)

(۴) قاضی شہاب الدین رحمہ اللہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

سئل القاضی من مجلس المولد الشریف لاینعقد لأنه محدث وکل محدث ضلالة وکل ضلالة فی النار ومایفعلون من الجهال علی رأس کل حول فی شهرالربیع الأوّل لیس بشیٔ الخ (الجنة لأهل السنة :ص۱۷۷)

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ	یکم ربیع الاول ۱۴۲۵ھ

بلا ضرورت نوافل کے لئے مسجد کو افضل سمجھنا بدعت ہے

(۴۶) سوال:- بلا وجہ چاشت و دیگر نوافل کیلئے مسجد کو لازم پکڑنا اور اس کو افضل سمجھنا کیسا ہے؟

الجواب ومنه التوفيق والتصويب

سنن ونوافل کا گھر میں پڑھنا افضل ومستحب ہے، بلاعذر گھر میں پڑھنے کی جگہ مسجد میں پڑھنے کو افضل سمجھنا غلط ہے، ہاں جگہ نہ ہونے یا انتشار سے بچنے کے لئے اگر مسجد میں پڑھی جاوے تو افضل اور بہتر ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن كعب بن عجرة قال إن النّبي صلى اللّٰه عليه وسلم أتى مسجد بني عبد الاشهل فصلى فيه المغرب فلما قضوا صلاتهم راهم يسبحون بعد ها فقال هذه صلوة البيوت رواه ابوداود وفي رواية الترمذي والنسائي قام ناس يتنفلون فقال النبي صلى اللّٰه عليه وسلم عليكم بهذه الصلوٰة في البيوت.

(مشكوٰة : كتاب الصلوٰة ،باب السنن وفضائلها ج ا ص ۱۰۵).

ترجمہ: حضرت کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (انصار مدینہ میں ایک قبیلہ) بنو عبد الاشہل کی مسجد میں تشریف لائے اور مغرب کی نماز پڑھی، جب قبیلہ کے بعض لوگ (فرض) نماز پڑھ چکے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا کہ فرض کے بعد نفل (یعنی مغرب کی سنتیں بھی مسجد میں) پڑھ رہے ہیں تو فرمایا: یہ نماز (یعنی مغرب کی سنت یا مطلق کوئی بھی سنت ونفل نماز) گھر میں پڑھنے کی ہے، ابوداود اور ترمذی، نیز نسائی کی روایت میں یوں ہے کہ جب لوگ کھڑے ہو کر نفل نماز پڑھنے لگے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگوں پر لازم ہے کہ یہ (سنت ونفل) نماز گھر میں پڑھو، نوافل سے گھروں کو آباد رکھو۔

فلہٰذا بلاعذر نوافل کے لئے مسجد کو لازم پکڑنا خلاف سنت اور بدعت ہے، پس چاشت کی نماز کیلئے بلاعذر مسجد کا اہتمام کرنا بدعت ہے، دوسری اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں اور عروۃ بن زبیر دونوں مسجد میں داخل ہوئے کچھ لوگ مسجد میں نماز چاشت یا اشراق پڑھ رہے تھے میں نے ابن عمر سے پوچھا کہ اسطرح مسجد میں چاشت یا اشراق کی نماز پڑھنا کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا بدعت ہے یعنی نوافل کے لئے مسجد کا التزام بدعت ہے، گھر پہ پڑھنے چاہئیں اگر عذر ہو تو مسجد میں جائز ہے۔

فإذا عبداللّٰه بن عمر رضى اللّٰه عنهما جالس إلى حجرة عائشة رضى اللّٰه عنها والناس يصلون الضحى فى المسجد فسألناه عن صلاتهم فقال بدعة.

(بخاری : كتاب المناسک ، أبواب العمرة تحت باب من اعتمر قبل الحج : ج ا ص ۲۲۸) وكذا في مسلم: ج ا ص ۴۰۹)

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
یکم ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — یکم ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا بدعت ہے

(۴۷) سوال:- ہمارے علاقے میں نماز جنازہ کے بعد فوراً ہاتھ اٹھا کر دعا کی جاتی ہے اور اسکے جواز پر بریلوی علماء کرام امام فضلی رحمہ اللہ کے قول "وَلَا بَاسَ بِهٖ" سے استدلال کرتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ یہ دعا کا رواج ودستور آپ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور خیر القرون کے زمانہ میں تھا یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں تفصیلی جواب مطلوب ہے، نیز امام فضلیؒ کا قول "وَلَا بَأسَ بِهٖ" کا کیا جواب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

درحقیقت نماز جنازہ میت کیلئے ایک خاص دعا ہے، چنانچہ ملک العلماء علامہ کاسانیؒ "بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع" میں لکھتے ہیں:

لأن صلوة الجنازة دعاء للميت والسنةفى الدعاء أن يقدم الحمد ثم الصلوٰة على النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ثم الدعاء بعد ذلک ليكون أرجى أن يستجاب (ج ۱ ص ۳۱۴)

یعنی نماز جنازہ میت کیلئے ایک خاص دعا ہے، اس میں دعا پڑھنے کے آداب یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھے اور دوسری تکبیر کے بعد درود شریف پڑھے اور تیسری تکبیر کے بعد میت کے لئے دعا کرے اور دعا میں مندرجہ ذیل دعا پڑھنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، ائمہ احناف نے اس کو اختیار کیا ہے اور الفاظ دعا یہ ہیں:

اللّٰهم اغفرلحينا وميتناوشاهدنا وغائبنا وصغيرنا وكبيرناوذكر نا وأنثانا اللّٰهم من أحييته منا فأحيه على الإسلام ومن توفيته منا فتوفه على الإيمان.

(مشکوٰۃ: کتاب الجنائز، باب المشی بالجنازۃ والصلاۃ علیہا. ج ۱ ص ۱۴۶)

ترجمہ: اے اللہ! مغفرت فرما ہمارے زندوں کی اور ہمارے مردوں کی اور ہمارے ان کی جو حاضر ہیں اور ہمارے ان کی جو غائب (غیر موجود) ہیں اور ہمارے چھوٹوں کی اور ہمارے

بڑوں کی اور ہمارے مردوں کی اور ہماری عورتوں کی اے اللہ! تو ہم میں سے جس کو زندہ رکھے اسے اسلام پر زندہ رکھیو اور جس کو موت دے اُسے ایمان پر موت دیجیو۔

تو آپ صلی اللہ وسلم نے تیسری تکبیر کے بعد ایسی جامع و مانع دعا کی تعلیم دی جس میں زندہ مردہ سب کے ایمان و اسلام اور خاتمہ بالخیر کا ذکر ہے، اس دعا کے سوا احادیث میں دوسری ادعیہ کا ذکر ہے، وہ بھی پڑھ سکتے ہیں، غرض تیسری تکبیر کے بعد دعائے ماثورہ پڑھنے کے بعد دائیں اور بائیں سلام پھیر دینا سنت ہے بعد سلام دفنانے سے قبل تک مزید کوئی دعائے ماثورہ اور دعا برفع الیدین حدیث وفقہ سے ثابت نہیں۔ چنانچہ فقہی حوالے ملاحظہ فرمائے:

(۱) امام ابوبکر بن حامد الحنفی المتوفی ٢٦٣ھ فرماتے ہیں:

إن الدعاء بعدصلوة الجنازة مكروه. (محيط: باب الجنائز)

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد دعا کرنا مکروہ ہے۔

(۲) امام شمس الائمہ حلوائی الحنفیؒ المتوفی ۴۵٦ھ اور بخارا کے مفتی قاضی شیخ الاسلام علامہ سغدی الحنفیؒ المتوفی ۴٦١ھ فرماتے ہیں:

لايقوم الرجل بالدعاء بعدصلوة الجنازة (قُنية)

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد دعا کیلئے آدمی نہ ٹھہرے۔

(۳) امام طاہر بن احمد البخاری الحنفیؒ المتوفی ۵۴۲ھ فرماتے ہیں:

لايقوم بالدعاء فى قرأة القرآن لأجل الميت بعد صلوة الجنازه وقبلها.

(خلاصة الفتاوى: ج ١ ص٢٢٥)

ترجمہ: نماز سے قبل میت کیلئے قرآن پڑھ کر دعا کے واسطے نہ ٹھہرے نہ نماز کے بعد دعا کے لئے کھڑے ہو۔

(۴) علامہ سراج الدین الحنفیؒ المتوفی ۷۰۰ھ لکھتے ہیں:

اذا فرغ من الصلوة لايقوم من الدعاء (فتاوى سراجية: ص٢٣)

ترجمہ: جب نماز جنازہ سے فارغ ہو جائے تو دعا کیلئے نہ ٹھہرے۔

(۵) امام حافظ الدین محمد بن شہاب کردری الحنفیؒ المتوفی ۸۲۷ھ فرماتے ہیں:

لايقوم بالدعاء بعدصلوة الجنازة لانه دعاء مرةً.

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد دعا کیلئے نہ ٹھہرے کیونکہ نماز کے اندر ایک دفعہ دعا ہو چکی ہے۔

(٦) امام شمس الدین محمد خراسانی الحنفیؒ المتوفی ٩٢٦ھ لکھتے ہیں:

ولایقوم داعیًا له. (جامع الرموز: ج ۱ ص ۱۲۵)

ترجمہ: (نماز جنازہ کے بعد) اور میت کے حق میں دعا کے لئے نہ ٹھہرے۔

(۷) ابوحنیفہ ثانی ابن نجیم الحنفیؒ صاحب "بحر الرائق" المتوفی ۹۷۰ھ فرماتے ہیں:

ولایدعو بعد التسلیم (بحر الرائق: ج ۲ ص ۱۸۳)

ترجمہ: سلام پھیر لینے کے بعد مزید دعا نہ کریں۔

(۸) ملاعلی قاری الحنفیؒ صاحب "مرقاۃ" المتوفی ۱۰۱۴ھ فرماتے ہیں:

ولایدعوللمیت بعد صلوۃ الجنازۃ لأنه یشبه الزیادۃ فی صلوۃ الجنازۃ. (مرقاۃ)

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا نہ کرے کیونکہ یہ نماز جنازہ میں زیاتی کے مشابہ ہے۔

(۹) مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

بعد نماز جنازہ کے دعا کرنا مکروہ ہے۔ (نفع المفتی والسائل ۶۱)

(۱۰) شارح "شرح وقایہ" برجندیؒ فرماتے میں ہے:

لایقوم بالدعاء بعد صلوٰۃ الجنازۃ لانه یشبه الزیادۃ فیها .

ترجمہ: نماز جنازہ کے بعد دعا کے لئے نہ ٹھہرے کیونکہ یہ نمازِ جنازہ میں زیادتی اور اضافہ کرنے کے مشابہ ہے۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے فقہائے کرام نے نماز جنازہ کے بعد دعاء مانگنے کو مکروہ کہا ہے اور مکرو لکھا ہے، فلہٰذا سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا خلاف سنت ہے، ثواب اور سنت سمجھ کر رفع یدین کے ساتھ پھر سے دعا کرنا بدعت ہے اور واجب الترک ہے۔

امام فضلیؒ کا قول وَلَا بَأسَ بِهٖ

امام فضلیؒ کے قول "وَ لَابَاسَ بِهٖ" سے استدلال کرنا درست نہیں اس کی وجوہ :

وجہ اوّل:- احادیث اور متقدمین ومتاخرین احناف کے مقابلہ میں امام فضلی کا قول کچھ حیثیت نہیں رکھتا، لہٰذا ان کے مقابلہ میں اسکے قول " وَلَابَاسَ بِهٖ" کا اعتبار نہیں ہوگا۔

وجہ دوم:- علامہ شامیؒ نے یوں تصریح کی ہے کہ "وَ لَابَاسَ بِهٖ" میں کراہت تنزیہی پائی جاتی ہے اور "وَ لَابَاسَ بِهٖ" غیر مستحب پر بھی اطلاق ہوتا ہے:

قال فی "الشامیة": فإن کلمة لأباس تدل علی أن خلافه أولیٰ ولیس کل ماهو خلاف الأولی مکروها تنزیهًا الخ. (در مختار مع شامیة: مبحث صلوة التراویح: ج۲ ص۴۴)

فقط و اللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
یکم صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

* * *

شب معراج، لیلۃ البرأۃ اور لیلۃ القدر کی نفلی نمازوں کی شرعی حیثیت

(۴۸) سوال: - جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہونگے دیگر یہ کہ چند مسائل درپیش ہیں، چونکہ اس سلسلہ میں بعض کتابوں میں مختلف حدیثیں ملتی ہیں اس لئے صحیح تحقیق کی ضرورت پڑی۔

جناب مفتی صاحب! میں ایک مسجد کا خطیب ہوں، مسجد کے سکریٹری جنرل اور بعض اراکین کمیٹی بریلوی مسلک کے ہیں اور کچھ احباب دیوبندی مسلک کے ہیں الحمدللہ میں اور مسجد کے دوسرے رفقاء حتی الامکان بدعات ورسومات سے پرہیز کرنے کی کوشش کرتے ہیں، قیام ومیلاد کے مسئلہ پر ایک دفعہ مجھے عدالت میں بھی جانا پڑا پھر بھی بدعات سے دور رہنے کی سعی کرتا ہوں، کبھی کبھی نماز جمعہ کی تقریر میں رد بدعات پر بیان کرتا ہوں، بات یہ کہ گذشتہ نماز جمعہ کی تقریر کے دوران میں نے کہا کہ شب معراج کا روزہ اور شب معراج اور شب برأت اور شب قدر کی نیت سے جو نفلی نمازیں پڑھی جاتیں ہیں یہ سب امور بدعات ہیں، قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں ثابت نہیں، البتہ ان راتوں کے فضائل حدیثوں سے ثابت ہیں، اس لئے ان راتوں میں جس قدر ممکن ہو انفرادی اعمالِ نفل تلاوتِ تسبیح وتہلیل وغیرہ میں مشغول رہنا چاہئے البتہ متعین نمازیں، متعین رکعتیں متعین سورتوں سے پڑھنے کا ثبوت نہیں ملتا، مگر سکریڑی جنرل کو یہ بات اچھی نہیں لگی، اس نے بریلوی علماء سے رابطہ کیا اور انہوں نے ''غنیۃ الطالبین'' اور ''احیاء علوم الدین'' کے حوالہ سے کہا کہ مذکورہ بالا امور سنت سے ثابت ہیں، پھر سکریڑی جنرل صاحب ان کتابوں کا بنگلہ نسخہ لیکر آیا اور سخت لہجہ میں کہنے لگے کہ آپ نے بدون علم کے کیوں اسطرح فتویٰ دیا ہے، کیا فساد کرنا چاہتے ہو؟ دیکھو یہ کتاب اس میں اِن مسئلوں پر کتنے دلائل ہیں پھر آپکو اطلاع دیجاتی ہے کہ آئندہ جمعہ کے اندر اسکا فیصلہ کرو یعنی اپنی غلطی کا اقرار کرکے کمیٹی سے معافی مانگو، ورنہ استعفاء نامہ تیار کرلو، مگر صدر کمیٹی اور بعض دوست جو دیوبندی مسلک کے ہیں، انہوں نے مجھے کہا کہ آپ مستند دینی اداروں سے اس موضوع پر ایک فتویٰ اور مذکورہ کتابوں کی روایتوں کا صحیح جواب تیار کرلو پھر دیکھا جائے گا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں، اب اس بارے میں قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں مندرجہ ذیل مسائل کے تحقیقی فتاوی مطلوب ہیں:

(۱) سنت سمجھ کر ۲۷/ رجب کا روزہ رکھنا شرعاً کیسا ہے؟

(۲) شب معراج، شب برأت اور شب قدر کی مروجہ نفلی نمازیں جو متعین رکعات اور متعین سورتوں کے ساتھ پڑھی جاتی ہے قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں ثابت ہیں یا نہیں؟

(۳) غنیۃ الطالبین اور احیاء علوم الدین کی روایتیں صحیح اور قابل استدلال ہیں یا نہیں؟

(۴) اگر مذکورہ امور مستند کتب حدیث اور فقہ وفتاویٰ سے ثابت نہیں تو ان نمازوں کی ابتداء کب سے ہوئی اور کس نے اختراع کیا ہے؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنِ امابعد:

جواب سے قبل چند باتوں کا لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا اور وہ یہ ہیں:

(الف) اللہ جل جلالہ نے جن اور انسان کو اپنی عبادت کے واسطے پیدا کیا، چنانچہ ارشاد ہے: وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْن.

ترجمہ: اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی کو اپنی بندگی کو۔ (بیان القرآن)

یعنی ان کے پیدا کرنے سے شرعاً بندگی مطلوب ہے، اس لئے ان میں خلقۃً ایسی استعداد رکھی ہے کہ چاہیں تو اپنے اختیار سے بندگی کی راہ پر چل سکیں یوں ارادۂ کونیہ کے اعتبار سے تو ہر چیز اس کے حکم تکوینی کے سامنے عاجز اور بے بس ہے، لیکن ایک وقت آئیگا جب سب بندے اپنے ارادہ سے تخلیق عالم کی غرض شرعی کو پورا کرینگے، بہر حال آپ سمجھاتے رہئے کہ سمجھانے ہی سے یہ مطلوب شرعی حاصل ہوسکتا ہے، سمجھنے کے بعد شاید یہ لوگ صحیح عبادت کے نہج پر آجائیں گے۔

(تفسیر عثمانی: ۶۹۴)

ب) پھر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا کہ عبادات کی تعلیم وتلقین کے لئے اپنے رسول سید الانبیاء والمرسلین کو مبعوث فرمایا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لقد مَنَّ اللّٰه على المؤمنين إذبعث فيهم رسولاً من أنفسهم يتلوا عليهم ايته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة وإن كانوا من قبل لفى ضلال مبين"

(سورۃ ال عمران: آیت ۔ ۱۶۴)

ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ہی کی جنس سے ایک

ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں اور لوگوں کی صفائی کرتے ہیں، ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے ہیں، اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔ (بیان القرآن)

(ج) نیز طرز زندگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا ومحبت حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع وپیروی کو ضروری قرار دیا اور اپنی کتاب قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم والله غفور الرحيم. (ال عمران: آیت ۳۰)

ترجمہ: آپ فرما دیجیے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دینگے اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنیوالے بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔ (بیان القرآن)

(د) پھر دین کے اندر خدائی تعلیم اور تعلیمات کے سوا کسی نئی بات نکالنے سے منع کر دیا ہے۔

چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أم لهم شركاء شرعوا لهم من الدين مالم ياذن به الله . (سورہ شوریٰ: آیت ۲۱)

ترجمہ: کیا ان کے کچھ شریک (خدائی) ہیں جنہوں نے ان کیلئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔ (بیان القرآن)

یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی زبانی آخرت کا اور دین حق کا راستہ بتلا دیا، کیا اس کے سوا کوئی اور ہستی ایسی ہے؟ جسے کوئی دوسرا راستہ مقرر کرنے کا حق اور اختیار حاصل ہو کہ وہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہرا دے، پھر آخر ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی وہ راہ چھوڑ کر جو انبیاء علیہم السلام نے بتلائی تھی دوسری راہیں کہاں سے نکال کر لائے ہیں۔ (تفسیر عثمانی)

✷ حدیث شریف میں ہے:

وإيّاكم والبدعة فإن كل بدعة ضلالة وكل ضلالة فى النار.

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بدعات سے پرہیز کرنا تمہارے اوپر لازم ہے کیونکہ تمام بدعات گمراہی ہیں اور ہر گمراہی جہنم میں جائیگی۔

✷ امام شاطبیؒ بدعت کی تعریف میں ابن الیمان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

كل عبادة لم يتعبدها أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم

فلاتعبدوها فإن الأوّل لم يدع للأخر مقالاً فاتقوا اللّٰه يامعشر المسلمين وخذوا الطريق من كان قبلكم (الاعتصام ج ۲ ص ۱)

ترجمہ: ہر وہ عبادت جس کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نہیں کیا (یعنی ہر وہ کام جس کو انہوں نے عبادت سمجھ کر نہیں کیا اور عبادت نہیں سمجھا) اُسے عبادت سمجھ کر مت کرو کیونکہ خیر القرون بعد والوں کے واسطے ایسی کوئی عبادت چھوڑ کر نہیں گئے، پس اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور خیر القرون کے راستہ کو مضبوطی سے پکڑو۔

✸ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

من ابتدع في الإسلام بدعة ويراها حسنة فقد زعم أن محمّدًا صلى اللّٰه عليه وسلم خان الرسالة. (الاعتصام ج ۱ ص ۲۸)

ترجمہ: جس نے دین اسلام میں عبادت کے نام سے کوئی نئی چیز ایجاد کی اور اُسے اچھی بھی جانتا ہے تو بیشک اس نے گمان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ ورسالت میں خیانت کی ہے۔ (نعوذ باللّٰہ من ذلک)

(ہ) بلا دلیلِ شرعی کسی ایک دن اور ایک وقت کو نفلی عبادات اور طاعات کے لئے مخصوص کر لینا کہ اس میں نفل یا عبادت کرنے کا ثواب زیادہ ہے درست نہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لاتختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالي ولاتختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الأيام إلا أن يكون في صوم يصوم أحدكم. (مسلم ج ۱ ص ۳۶۱)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کی رات کو دوسری راتوں سے نماز اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے روزہ کیلئے خاص نہ کرو، ہاں اگر کوئی شخص روزہ رکھتا ہے اور جمعہ کا دن اس میں آجائے تو الگ بات ہے۔

متذکرہ نصوص کا خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جن امور کا حکم دیا ہے اور خیر القرون نے جن امور کو عبادت سمجھ کر کیا ہے، صرف وہی چیزیں عبادات ہوں گی اور اس کے برخلاف عبادت کی صورت میں بعض نے جو نئی چیزوں کو اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے، تو یہ سب چیزیں بدعات اور مذموم ہوں گی، نیز بلا نصوص شرعیہ کے نفلی طاعات کے لئے دن وتاریخ کی تخصیص کرنا درست نہیں ہے اور موضوع حدیثوں پر بحیثیت حدیث عمل کرنا اور ان سے استدلال کرنا بھی درست نہیں ہے،

اب ہر ایک سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

جواب (١): - ماہ رجب المرجب کے فضائل حدیث سے ثابت اور منقول ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے "اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ" مگر اس مہینہ میں مخصوص کوئی عبادت ہے؟ اس کا ذکر نہ حدیث شریف میں ہے، نہ کتب فقہ وفتاویٰ میں، نیز ٢٧/ رجب کے روزہ کا ذکر بھی کتب حدیث اور فقہ وفتاویٰ میں نہیں ہے، اس لئے اس روزہ رکھنے کو سنت سمجھ کر روزہ رکھنا بدعت ہے نیز بعض حدیثوں میں مطلق رجب کے روزہ کی نہی بھی وارد ہے۔ چنانچہ:

(١) عن ابن عباس رضی اللّٰه عنهما أن النّبی صلی اللّٰه علیه وسلم نهی عن صیام رجب. (ابن ماجة).

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجب کے روزہ سے منع فرمایا۔

(٢) عن خرشة بن الحرّ رأیت عمر بن الخطاب یضرب أکف الرجال فی صوم رجب حتی یضعوها فی الطعام و یقول ومارجب إنما رجب شهر کان یعظمه أهل الجاهلیة فلماجاء الإسلام ترک.

(مجمع الزوائد: کتاب الصیام باب صیام رجب: ج٣ص ٤٣٩)

ترجمہ: حضرت خرشہ بن حرؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رجب کے روزہ داروں کی گردنوں پر مارتے تا کہ وہ لوگ روزہ چھوڑ دیں اور فرماتے ماہ رجب کا کیا روزہ ہے یعنی شریعت نے اس میں مخصوص کوئی روزہ مشروع نہیں کیا بیشک اس مہینہ کی اہل جاہلیت تعظیم کرتے تھے اور اسلام نے اس کو باطل قرار دیا ہے۔

(٣) کان ابن عباس ینهی عن صیام رجب کلّه لان لایتخذ عیدًا. مصنف عبدالرزاق. (کتاب الصیام باب صیام اشهر الحرم: ج٤ص ٢٩٢)

ترجمہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رجب کے روزہ سے روکتے تا کہ لوگ اس مہینہ کے کسی دن کو عید کیطرح عبادت کے واسطے خاص نہ کریں۔

مذکورہ بالا روایتوں سے معلوم ہوا کہ ماہ رجب کی تعظیم سے روزہ رکھنا مکروہ ہے اور ٢٧/ رجب کے روزہ کا التزام بدعت ہے، البتہ بعض حدیثوں میں ماہ رجب میں خصوصیت کے ساتھ نفلی روزہ رکھنے کی فضیلت آئی ہے، لیکن وہ سب حدیثیں انتہائی ضعیف ہیں بلکہ بعض حفاظِ حدیث نے ان میں سے اکثر کو موضوع (گھڑی ہوئی حدیث) قرار دیا ہے۔ چنانچہ شروح حدیث کی عبارات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وأما أحاديث صوم رجب فقال بعض الحفاظ إنها موضوعة

(المرقاة: كتاب الصوم باب صيام التطوع ۴/۵۳۴)

(۲) ابن سبکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وحكى ابن السبكي عن محمّد بن منصور السمعاني أنه قال لم يرد في استحباب صوم رجب على الخصوص سنة ثابتة والأحاديث التي تروى فيه واهية لا يفرح بها عالم.

(نيل الاوطار : كتاب الصيام باب ما جاء في صوم شعبان والأشهر الحرم ۴/۲۱۷)

(۳) مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وكذا يستحب أن يصوم صباح تلك الليلة وقد وردت فيه أحاديث لا تخلو عن طعن وسقوط كما بسطه ابن حجر في تبيين العجب مما ورد في فضل رجب وما اشتهر في بلاد الهند وغيره: أن صوم صباح تلك الليلة يعدل ألف صوم فلا أصل له. (الأثارة المرفوعة في الاخبار الموضوعة: ج ۵ ص ۲۳)

پس مذکورہ بالاحوالا جات سے واضح ہوگیا کہ ۲۷/رجب کے روزہ کے متعلق کوئی صحیح السند حدیث موجود نہیں، اس لئے اس کو سنت اور کار ثواب سمجھ کر رکھنا بدعت ہے، جہاں اس کا رواج و دستور ہوگیا وہاں کے علماء دین پر ضروری ہے کہ عوام الناس کو اس پر تنبیہ کریں۔

شب معراج، لیلۃ البرأت، لیلۃ القدر کی متعین نمازیں بدعات ہیں

جواب (۲) مذکورہ بالا راتوں کے فضائل حدیثوں سے ثابت ہیں ان راتوں میں حسب طاقت مسنون طریقہ پر عبادت کرنا چاہیئے (یعنی فرداً فرداً ذکر، تلاوتِ قرآن نفلی نماز جیسے تہجد، صلوۃ التسبیح وغیرہ وغیرہ عبادات کر کے شب گذاری کرنا مستحب ہے) مگر ان راتوں کی مخصوص کوئی عبادات مثلاً بارہ رکعات مخصوص کر کے نفلی نماز پڑھنا کہنا یا کرنا از روئے شرع منقول نہیں ہے، فلہٰذا صورت مسئولہ کی نفلی نمازیں مخصوص رکعات کے تعین کے ساتھ بدعات ہیں، چنانچہ:

(۱) امام جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وكذا صلوٰة عاشوراء وصلاة الرغائب موضوعة بالاتفاق وكذا بقية صلوات

ليالى رجب وليلة النصف من شعبان مأة ركعة فى كل ركعة عشرمرات بالاخلاص ولاتغتربذ كرها فى قوت القلوب والاحياء والعلوم . الخ
(من موضوعات كبير ۲۷٦)

(۲) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ٦٧٦ھ فرماتے ہیں:

وفى هذا الحديث النهى الصريح من تخصيص ليلة الجمعة من بين الليالى ويومها بصوم وهذا متفق على كراهية واحتج به العلماء على الكراهية هذه الصلوٰة المبتدعة التى لتسمّٰى الرغائب قاتل اللّٰه واضعها مخترعها فإنه بدعة منكرة من البدع التى هى ضلالة وجهالة فيهامنكرات ظاهرة وقد صنف جماعة من الائمة مصنفات نفيسة فى تقبيحهاوتضليلها. (حاشية مسلم ج ا ص ٣٦١)

(۳) مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ومن البدعات صلوٰة ليلة السابع والعشرين من رجب ومنها صلوٰة ليلة النصف من شعبان
(الاثارة المرفوعة فى الأخبار الموضوعة: ج۵ص۶۳، وكذافى البحر: ج ۲ ص۵۳ وكذا فى الشامية: ج ۲ ص۲٦)

امید ہے کہ قارئین کرام بصیرت کے ساتھ ان مسائل میں غور وفکر کریں گے کہ مذکورہ بالا نمازیں تخصیص اور تعیین کے ساتھ کہ اتنی رکعات سنت ہیں از روئے قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی غیر ثابت ہیں، اور بے اصل ہیں، خیر القرون میں ان کا رواج نہیں تھا، اگر یہ عبادات ہوتیں تو خیر القرون میں ان کا وجود ہوتا، پس مذکورہ بالا نمازیں بدعات ہیں، واجب الترک ہیں اب ملاحظہ فرمائے ان نمازوں کی ابتداء کب سے ہوئی اور کس نے اختراع کیا اور کیوں کیا؟۔

ان نمازوں کی تاریخ

جواب (۳):- اس بارے میں علامہ ابراھیم حلبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

قال أبومحمّد عزالدين بن عبدالسلام المقدسى لم يكن بيت المقدس قط صلوٰة الرغائب فى رجب ولاصلوٰة نصف شعبان فحدث فى سنة ثمان وأربعين وأربعمائة أن قدم علينا رجل من نابلس يعرف بابن الحى وكان حسن التلاوة فقام فصلى فى المسجدالأقصى ليلة النصف من شعبان فأحرم خلفه رجل ثم انضاف ثالث ورابع ماختم إلاوهم جماعة كثيرة ثم جاء فى

العام القابل فصلى معه خلق كثير وانتشرت فى المسجد الأقصى وبيوت الناس ومنازلهم ثم استقرت كأنها سنة إلى يومنا هذا.

(حلبی: کتاب الصلاۃ تتمات من النوافل)

خلاصہ یہ کہ بیت المقدس میں شب معراج اور شب برأت کی مروّجہ نمازوں کا رواج نہیں تھا بلکہ ۴۴۸ھ میں انکا اختراع ہوا اور وہاں سے ان کی ابتداء ہوئی واقعہ یوں پیش آیا کہ نابلس کے ابن الحی نامی ایک قاری صاحب مسجد اقصیٰ میں آئے جسکی تلاوت بہت اچھی تھی وہ ایک مرتبہ شب برأت کو مسجد اقصیٰ میں نفلی نماز پڑھ رہے تھے اور اس کے پیچھے لوگوں نے اقتداء کی اقتداء کرنے والوں میں ایک جماعت ہوگئی حتی کہ ایک جم غفیر ہوگیا، پھر دوسرے سال بھی ایسا ہوا آہستہ آہستہ اس کا رواج چل پڑا اور اس درجہ تک پہنچ گیا کہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں اس کا اہتمام کرنے لگا اور بعد میں لوگ ان نمازوں کو شب معراج اور شب برأت کی سنت نمازیں سمجھ کر پڑھنے لگے۔

ان نمازوں کے اختراع کا اصل مقصد ومطلب

✷ اس بارے میں علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وقد جعلها جهلة ائمة المساجد مع صلوة الرغائب ونحوها من الصلوة شبكة لجمع العوام وطلبًا لرياسة التقدم ملأ بذكرها القصص فى مجالسهم وكل ذلك عن الحق بمعزول. (بحوالہ موضوعات کبیر ۱۲۹)

ترجمہ: بعض ائمہ مساجد نے ان نمازوں کا اختراع کیا تا کہ ان کے ذریعہ عام لوگوں کو جمع کریں اور ان سے مال ودولت حاصل کریں، اور وہ لوگ ان جلسوں میں بے اصل قصّہ اور تاریخی باتیں کرتے ہیں، حالانکہ ان کی یہ مجالس راہ حق سے ہٹی ہوئی ہیں۔

امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کے قول سے دور حاضر کے بریلوی حضرات کا راز بھی فاش ہوگیا کہ ان حضرات کا مقصد بھی یہی ہے یعنی ارباب اموال سے مال ودولت وصول کرنے کی غرض سے طرح طرح کے جلسے کرتے ہیں، کبھی جشن جلوس عید میلاد النبی ﷺ اور کبھی بڑے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر گیارھویں شریف اور کبھی ایصال ثواب کی محفل اور عرس وقیام ومیلاد وغیرہ وغیرہ کی تقاریب کرتے ہیں۔

پس اسی تفصیلی تحریر سے دینی سمجھ رکھنے والے لوگوں پر واضح ہو جائیگا کہ یہ لوگ دنیا کمانے کے لئے دین کے نام سے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں، یہ لوگ مکار ہیں، فساق ہیں، اسلاف نے

صاف اور واضح الفاظ میں کہد یا کہ ”وکل ذلک عن الحق بمعزول“ یعنی یہ محافل باطل اور گناہوں کی محافل ہیں، یہ لوگ حق سے ہٹے ہوئے ہیں، ان تقریبوں میں جانا اور چندہ دینا ہر قسم کا تعاون کرنا نہ درست ہے اور نہ جائز ہے اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو صحیح راستہ کی ہدایت فرماوے اور حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی توفیق بخشے آمین۔

اب غنیۃ الطالبین اور احیاء العلوم کی حدیثوں کا جواب ملاحظہ ہو

جواب (۴):- مذکورہ نمازوں کے سلسلہ میں جتنی حدیثیں مروی ہیں سب کی سب موضوع ہیں اور حدیث موضوع پر عمل کرنا اور اس سے استدلال کرنا درست نہیں، چنانچہ محدثین کرام فرماتے ہیں:

(۱) امام جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

هذا حديث لانشك أنه موضوع جمهور رواته مجاهيل وفيهم ضعفاء بمرة والحديث محال قطعا الخ. (بحوالۂ موضوعات کبیر ۱۲۹)

(۲) ملاعلی قاریؒ ”ابن قیم جوزیؒ متوفی ۷۵۱ھ“ کی عبارت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وكذا أحاديث صلوة الرغائب أوّل جمعة من رجب كلها كذب وفي موضع آخر وكذاصلوة عاشوراء وصلوة الرغائب موضوع بالاتفاق وكذابقية صلوات ليالي رجب وليلة النصف من شعبان مائة ركعة في كل ركعة عشر مرات بالاخلاص ولاتغتربذكرها في قوت القلوب والاحياء الخ

(بحواله موضوعات كبير ص.۲۷۶)

(۳) علامہ ابراہیم حلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وهذالأن حديث صلوة الرغائب والبرأة قدحكم الأئمة بالوضع ...... قال الشيخ محي الدين النووي وهاتان الصلاتان بدعتان مذمومتان منكرتان قبيحتان...... وليس لأحد أن يستدل على شرعيتهماالخ.

(بحواله حلبی کبیر: ص ۴۳۳- ۴۴۳)

ہر ذی شعور آدمی کو محدثین کے حوالا جات سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ”غنیۃ“ اور ”احیاء العلوم“ کی حدیثیں موضوع ہیں، پس ان حدیثوں سے استدال کرنا درست نہیں، اب رہ گیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسی ہستیوں نے کس طرح اپنی کتابوں میں موضوع روایتیں ذکر کی۔

درحقیقت یہ حضرات سادہ لوح لوگ تھے، ان کے سامنے روایتیں گذرتیں اور لوگ ذکر کرتے مگر ان کو تخریج حدیث کا موقع نہیں ملتا ورنہ ان کے نزدیک بھی موضوع حدیث پر عمل کرنا اور اس سے استدلال کرنا ناجائز ہے، یہ باتیں بھی انکی کتابوں میں مذکور ہیں، اور ان کے بعد محدثین کرام نے تخریج کر کے حکم مرتب کیا ہے ہم تو بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات کو اگر مذکورہ روایتیں موضوع ہونے کا علم ہوتا، تو ضرور ان روایتوں کو ذکر نہیں کرتے اور ان نمازوں کو بدعت اور ناجائز کہتے، فلہٰذا ان روایتوں سے نہ جواز کا ثبوت ملتا، نہ ان حضرات کی شان مجروح ہوتی ہے۔

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم.

وأخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سیدالمرسلین وآلہ وأصحابہ أجمعین :

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
رئیس دارالافتاء خادم القرآن والسنۃ
۱۴/ شعبان ۱۴۲۳ھ

کتبہ
محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۴/ شعبان ۱۴۲۳ھ۔

الجواب صحیح
بندہ نور احمد عفی عنہ
مفتی دارالعلوم ہاٹہزاری
۱۴/ ۸/ ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح
جسیم الدین عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم ہاٹہزاری
۱۴/ ۸/ ۱۴۲۳ھ

الجواب صحیح
کفایت اللہ عفی عنہ
مفتی دارالعلوم ہاٹہزاری
۱۴/ ۸/ ۱۴۲۳ھ

* * *

آپ ﷺ کی تاریخ وفات کے بارے
میں
دیوان باغی صاحب ڈھاکہ
کے
باطل استدلالات اور ان کے جوابات

✱ قرآن کی روشنی میں آپکے سفر آخرت کی تیاری اور وفات کی طرف اشارہ۔

✱ حدیث کی روشنی میں آپکی تاریخ وفات۔

✱ تاریخ اسلامی کی روشنی میں آپ کی تاریخ وفات۔

✱ جمہور مشایخ اور مشہور قول کے مطابق آپکی تاریخ وفات۔

✱ آپ ﷺ کی ہجرت اور اقامت مدینہ منوّرہ کے اعتبار سے آپکی تاریخ وفات۔

✱ دیوان باغی صاحب کے نقلی استدلال کا جواب۔

✱ دیوان باغی صاحب کی عقلی دلیل کا جواب۔

✱ ائمۂ دین پر دیوان باغی صاحب کا ناجائز حملہ اور ثابت شدہ امر کا انکار۔

✱ دیوان باغی صاحب کے کچھ عقائد فاسدہ۔

✱ جشن جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شرعی حیثیت۔

آپ ﷺ کی تاریخ وفات کے بارے میں

دیوان باغی صاحب کے باطل استدلالات اور ان کے جوابات

(۴۹) سوال:- بخدمت جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہم مدت مدید سے جانتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات ایک ہی روز متعین ہے یعنی ۱۲/ ربیع الاوّل ہے، مگر کچھ دن قبل سے جناب دیوان باغی صاحب نے اس کا انکار کیا اور آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل کہا اور اسی موضوع پر ایک اخباری اجلاس کیا اور ایک اشتہار چھپوایا اشتہار کا خلاصہ سوال کے ساتھ منسلک ہے۔

اب سوال یہ ہے انکی یہ تحقیق کہاں تک درست ہے، دلائل کی روشنی میں محقق ومدلل جواب مطلوب ہے، نیز جناب دیوان باغی صاحب نے کہا جشن جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کرنا مسلمانوں پر واجب ہے، اب دیوان باغی صاحب کا یہ کہنا کیا حکم ہے؟ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ محقق ومدلل جواب مطلوب ہے۔

دیوان باغی صاحب کے اشتہار کا خلاصہ

”دیوان باغی دربار شریف میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایک اہم اجلاس ہوا اس میں دیوان باغی کی طرف سے ممبران حضرات کو خطاب کیا گیا۔

اور فرمایا: ۱۲/ ربیع الاوّل کی عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تاریخ میں ایک سچی بات پوشیدہ رہنے کی وجہ سے تمام امت مسلمہ اس تقریب کی رحمت وبرکت سے محروم رہتے ہیں“۔

پھر جناب دیوان باغی صاحب فرماتے ہیں: مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مدت سے ایک غلط بات رائج ہوگئی کہ آپکی تاریخ ولادت اور وفات ایک ہی تاریخ یعنی ۱۲/ ربیع الاوّل بتائی جاتی ہے، اس لئے بعض لوگ اس روز کی عید سے دور رہتے ہیں چونکہ یہ روز غم کا بھی ہے لہٰذا عید کیسے منائی جاوے پھر آگے فرماتے ہیں:

”کہ آج کے اخباری اجلاس کا اصلی مقصد ایک سچی بات بتانی ہے یعنی آپ کی تاریخ وفات

۱۲؍ربیع الاوّل نہیں، بلکہ یکم ربیع الاوّل ہے” واضح رہے کہ آپ کی وفات صحابہ کرام کے زمانہ ہوئی تھی پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپکی تاریخ وفات کو محفوظ نہیں رکھا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے، دیوان باغی صاحب پھر فرماتے ہیں اب دلائل کی روشنی میں آپ کی تاریخ وفات ملاحظہ فرمائیے:

قرآن پاک میں ارشاد ہے: **اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينًا.**

(۱) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ۱۰ھ کی نویں ذی الحج میں نازل ہوئی اور وہ روز جمعہ کا دن تھا، ایت نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اکیاسی روز حیات رہے۔ (معارف القرآن: ج۳ص۳۲)

(۲) “تفسیر طبری” میں امام حجاج نے ابن جریج سے نقل کی ہے کہ یہ ایت نازل ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی روز زندہ تھے۔ (ج۴ص۸۰، وکذا فی تفسیر در منثور: ج۳ص۲۰)

مذکورہ بالا حوالاجات سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپس آنے کے بعد اکیاسی روز زندہ تھے، اس حساب سے آپکی تاریخ وفات یہ ہے کہ ذی الحج کے ۲۱ روز + محرم کے ۳۰ روز + صفر کے ۲۹ روز + ربیع الاوّل کے ایک روز، ٹوٹل = ۸۱ روز ہوتے ہیں، پس آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ثابت ہوئی۔

دوسری دلیل: یہ کہ آپ ﷺ ماہ صفر کے اخیری بدھ کو بیماری سے افاقہ ہوا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی یہ روز آپ کی وفات کے پانچ دن قبل بدھ کا دن تھا، جو چہار شنبہ سے معروف ومشہور ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، اس پانچ دن کے بعد آپکی وفات ہوئی تو اس حساب سے بھی آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپکی تاریخ وفات ۱۲؍ربیع الاوّل ہے، اس کا رواج کیسے ہوا، اس کے جواب میں دیوان باغی صاحب فرماتے ہیں:

“درحقیقت آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ہی تھی، مگر یزیدی حکومت اور ان کے متبعین نے سازش کر کے ۱۲؍ربیع الاوّل لکھ دیا ہے تاکہ مسلمان عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ایک اہم وضروری عبادت سے غافل ومحروم رہیں اور بعد میں آنے والے مورخین بھی اسی سازش کے شکار ہو کر آپکی تاریخ وفات غلط لکھنی شروع کر دی پھر ۱۲؍ربیع الاوّل کی اشاعت ہوگئی”

دراصل ۱۲؍ربیع الاوّل آپ کی تاریخ ولادت ہے اور یہ خوشی کا دن ہے اس روز میں عید میلاد النبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کرنا مسلمانوں پر واجب اور ضروری ہے، پھر دیوان باغی صاحب تمام جہاں کے مسلمانوں سے گذارش کرتے ہیں کہ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کماحقہ ادا کی جائے، اس غرض پر حکومت سے بھی بعض چیزوں کی گذارش کرتے ہیں۔

(۱) میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عید سب سے بڑی عید ہے اس کا اعلان کرنا چاہئیے۔

(۲) یکم ربیع الاوّل تا ۱۲؍ ربیع الاوّل تک ریڈیو، ٹی وی میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب کی اشاعت کرنی چاہیئے۔

(۳) عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تین دن کی سرکاری رخصتیں منظور کرنا چاہیئے۔

(۴) سرکاری غیر سرکاری سب ملازموں کو عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اضافی وظیفہ کا انتظام کرنا چاہیئے۔ محمد سعید الرحمٰن المحبوبی

صدر، دیوان باغ دربار شریف باب رحمت
۱۴۷، آرام باغ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش۔

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وھوالموفق للحق والصواب

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ وَاٰلِہٖ وَصَحۡبِہٖ أَجۡمَعِیۡنَ. أَمَّابَعۡدُ!

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا جان گداز اور روح فرسا واقعہ جس نے دنیا کو نبوت ورسالت کے فیوض و برکات اور ربانی انوارات وتجلیات سے محروم کردیا ہے، وہ بروز دوشنبہ دوپہر کے وقت ۱۲؍ ربیع الاوّل کو پیش آیا ہے اور یہ آخری قول ہے، اب ترتیب وار قرآن وحدیث اور تاریخ اسلامی کی روشنی میں دلائل ملاحظہ فرمائیں:

قرآن کی روشنی میں آپ کے سفر آخرت کی تیاری اور وفات کی طرف اشارۂ خفیّہ

حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر آخرت کی تیاری شروع فرمادی اور تسبیح وتحمید اور توبہ اور استغفار میں مشغول ہوگئے۔

سب سے پہلے جس واقعہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی وفات کا قریب آجانا منکشف ہوا وہ حق جل شانہ کی طرف سے سورۃ النصر کا نزول ہے:

"إذا جاء نصر الله والفتح ورأیت الناس یدخلون فی دین الله أفواجًا فسبح بحمد ربک واستغفره۔ إنه کان توابًا"

یعنی جب فتح ونصرت آچکی جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا اور کفر اور شرک، کا سر کچل دیا گیا اور توحید کا علم سربلند ہوا اور حق کو باطل کے مقابلہ میں فتح مبین حاصل ہوئی اور لوگ فوج کی فوج دین مبین میں داخل ہونے لگے اور دنیا کو اللہ کا پیغام پہنچ گیا اور دین کی تکمیل ہوگئی، تو آپ کے دنیا میں بھیجنے سے جو مقصد تھا وہ پورا ہوگیا اور آپ کا جو کام تھا وہ کر چکے، اب ہمارے پاس آنے کی تیاری کیجئے، بیت اللہ کا حج (زیارت) کر چکے، اب رب البیت کے حج (زیارت) کی تیاری کیجئے خدا تعالیٰ نے آپ کو جس کام کے لئے دنیا میں بھیجا تھا وہ کام تمام مکمل ہوگیا، جس نے آپ کو دنیا میں بھیجا تھا، اب اس کے پاس واپس ہو جائیے اور اس کے پاس جانے کی تیاری کیجئے یہ عالم فانی آپ کے رہنے کی جگہ نہیں آپ جیسی ارواح مقدسہ کیلئے ملاء اعلیٰ اور رفیق اعلیٰ کا الحاق اور اتصال مناسب ہے، چنانچہ نزول سورت کے بعد آپ ﷺ اٹھتے اور بیٹھتے اور آتے جاتے یہ پڑھتے تھے۔

سبحانک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی وتب علیّ إنک أنت التواب الرحیم اور کبھی سبحان اللّٰه وبحمده استغفر الله واتوب الیه پڑھتے اور کبھی یہ پڑھتے سبحانک اللّٰھم وبحمدک استغفرک وأتوب الیک.

(تفسیر درمنثور سورۃ النصر)

حجۃ الوداع میں جب آیت " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ " نازل ہوئی تو آپ اشارۂ خداوندی کو سمجھ گئے اس لئے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اعلان فرمایا کہ شاید اب اس کے بعد تم سے ملنا نہ ہو اور شاید پھر تمہارے ساتھ حج نہ کرسکوں اور پھر غدیر خم کے خطبہ میں فرمایا: میں بشر ہوں اور بشر کے لئے دنیا میں خلود و دوام نہیں "وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدَ" شاید عنقریب میرے رب کا قاصد مجھے بلانے اور لینے کیلئے آجائے گا اسی بناء پر حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد ایک دن آپ جنت البقیع میں تشریف لے گئے اور آٹھ سال کے بعد شہداء اُحد پر نماز جنازہ پڑھا اور ان کے لئے ایسی دعا خیر فرمائی جیسا کہ کوئی کسی سے رخصت ہوتا ہے، بقیع سے واپس آکر مسجد کے منبر پر جلوہ افروز ہوئے اور خطبہ دیا کہ میں تم سے پہلے جا رہا ہوں تا کہ تمہارے لئے حوض وغیرہ کا انتظام کروں اور میرا تم سے حوض کوثر پر ملنے کا وعدہ ہے اور میں اپنے اسی مقام پر حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں اور تحقیق کہ مجھ کو زمین کے خزانوں کی

کنجیاں دے دی گئی ہیں اور مجھ کو اپنے بعد اس کا اندیشہ نہیں کہ تم مجموعی طور پر سب کے سب شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، البتہ خوف یہ ہے کہ تم دنیا کی حرص اور طمع اور باہمی تنافس میں مبتلا ہو جاؤ گے اور آپس میں لڑو گے اور ہلاک ہو جاؤ گے۔ (زرقانی: ۸/۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۵، از سیرۃ المصطفیٰ: ۳/۱۵۷)

تو قرآن مجید میں آپ ﷺ کی تاریخ وفات کی معین تاریخ کا ذکر نہیں، البتہ بعض ایتوں سے آپ کو سفر آخرت کی تیاری کا اشارہ کیا گیا مگر حدیثوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔

حدیث کی روشنی میں آپ کی تاریخ وفات

بکثرت روایتوں میں مذکور ہے کہ ہجرت کے گیارھویں سال ماہِ صفر کے آخری بدھ میں آپ کے مرض الموت کی ابتداء ہوئی اور آپ کا وصال پیر کے دن ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوا۔ چنانچہ روایت میں اسکی تصریح ہے:

(۱) أخبرنا محمّد بن عمر حدثنی عبدالله بن محمّد بن عمر بن علی ابن أبی طالب عن أبيه عن جده قال اشتكى رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الأربعاء لليلة بقيت من صفر سنة إحدى عشرة وتوفىٰ يوم الاثنين لاثنتی عشرة مضت من ربيع الاوّل. (الطبقات الكبرىٰ: ج۲ ص۳۸۵. طبع بيروت)

(۲) أخبرنا محمّد بن عمر حدثنی إبراهيم بن يزيد عن طاووس عن أبيه عن ابن عباس قال حدثنی محمّد بن عبد الله عن الزهری عن عروة عن عائشة قالت توفىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الاثنين لاثنتی عشرة مضت من ربيع الاوّل. (الطبقات الكبرىٰ: ج ۲ ص ۳۸۵ طبع بيروت)

(۳) روى سيف بن عمر بإسنا دعن ابن عباس قال لما قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم حجة الوداع ارتحل فأتى المدينة وأقام بها ذاالحجة ومحرم وصفر ومات يوم الاثنين لثانی عشر خلون من ربيع الأوّل من سنة احدى عشرة. (عمدة القاری شرح البخاری: ج۱۸ ص ۶۰ طبع باكستانی).

ان حدیثوں کی سند اور رُواۃ کے احوال ملاحظہ فرمائے

قال فی "ميزان الاعتدال": ۴۵۴۰ [۳۶۱۷ ت] عبدالله بن محمّد بن عمر بن علی بن أبی طالب [و.س] أبوعيسىٰ العلوی المدنی عن أبيه عنه أبواسامة وابن أبی فديک قال ابن المدينی هووسط وقال غيره صالح

الحدیث: (ج ۴ ص ۱۷۵. طبع بیروت)

✸ ۸۰۰۷ [٤٦٩٣ ت] محمد بن عمر (عو) بن علی بن أبی طالب أبوعبداللّٰہ الهاشمی أحد الأشراف بالمدینة روی عن أبیه وعن عبیداللّٰہ بن أبی رافع وعمّه ابن الحنفیة وعن العباس بن عبیداللّٰہ وعنه ابن جریح وهشام بن سعد ومحمد بن سعد ومحمد بن موسیٰ الفطری وعاش إلی دولة السفاح وهو ابن عم زین العابدین علی بن الحسین وكان یشبه بجده الإمام علی بن أبی طالب رضی اللّٰہ عنه ماعلمت به بأساً ولارأیت لهم فیه كلامًا وقدروی له أصحاب السنن الأربعة فما استنكر له حدیث. (میزان الاعتدال: ج۶ ص۲۸۷ طبع بیروت)

تاریخ اسلامی کی روشنی میں آپکی تاریخ وفات

اکثر بیشتر مؤرخین حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہجرت کے گیارھویں سال ماہ صفر کے آخری بدھا میں آپکے مرض الموت کی ابتداء ہوئی اور آپ کا وصال پیر کے دن ربیع الاوّل کی بارہ تاریخ کو ہوا۔ چنانچہ:

(۱) مشہور محدث وثقہ ترین مُورّخ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۷۷۴ھ واقدی کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال الواقدی: قالوا بدئ برسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یوم الأربعاء للیلتین بقیتا من صفر وتوفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یوم الاثنین لثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الأوّل و هذا جزم به محمد بن سعد. (بدایة ونهایة: ج۵ ص۲۷۶)

(۲) علامہ عبدالرحمٰن بن علیؒ متوفی ۵۹۷ھ اپنی کتاب ”المنتظم“ میں فرماتے ہیں:

قال فی ”المنتظم فی تاریخ الملوک والامم“: توفی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یوم الاثنین نصف النهار وربما قیل عند اشتدادالضحی لاثنتی عشرة خلت من ربیع الأوّل سنة احدی عشرة. (ج۴ ص۴۰ طبع بیروت)

(۳) علامہ ابن اثیرؒ متوفی ۶۳۰ھ اپنی تصنیف ”الکامل“ میں فرماتے ہیں:

قال فی ”الکامل فی التاریخ“: وكان موته یوم الإثنین لثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الأوّل. (ج۲ ص۱۸۷ طبع بیروت)

(۴) علامہ بدرالدین عینیؒ ابن اسحٰق کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال فی "عمدة القاری شرح البخاری" . وقال ابن إسحاق توفی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلم لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الأوّل فی الیوم الذی قدم فیه المدینة مهاجرًا. (اج۱۸ ص۶۰)

(۵) علامہ نورالدینؒ متوفی ۹۱۱ھ اپنی تصنیف "وفاء الوفاء" میں فرماتے ہیں:

قالي فی" وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفی". ثم أذن رسول اللّٰہ صلی علیه وسلّم للنّاس الحجّة فی حجة الوداع ورجع ثم مرض فی صفر لعشر بقین منه توفّی صلی اللّٰہ علیه وسلم لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الأوّل یوم الاثنین.

(وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفی: ج۱ ص۳۱۷)

پس حدیث اور تاریخ اسلامی کی روشنی میں روزِ روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات ۱۲/ربیع الاوّل کو ہے، البتہ بعض مؤرخین سے اس کے خلاف بھی منقول ہے، چنانچہ موسیٰ ابن عقبہ اور لیث ابن سعد اور خوارزمی نے یکم ربیع الاوّل کو تاریخ وفات بتلایا ہے اور کلبی اور ابومخنف اور سہیلی نے دوم ربیع الاوّل کو تاریخ وصال قرار دیا ہے یعنی ان حضرات نے بھی کسی ایک حساب کو سامنے رکھ کر ایسا کہا تھا، جس کا دندان شکن جواب علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے "البدایہ والنہایہ" میں دیا ہے۔ چنانچہ:

وقد استشکل ذلک السهیلی ومن تبعه أعنی کونه مات یوم الاثنین ثانی عشر شهر ربیع الأوّل وذلک أنهم اتفقوا علی أنّ اذاالحجّة کان أوله یوم الخمیس فمهمافرضت الشهور الثلاثة توام أونو اقص أوبعضهالم یصح هو ظاهر لمن تأمله وأجاب البارزی ثم ابن کثیر باحتمال وقوع الأشهر الثلاثة کوامل وکان أهل مکة والمدینة اختلفوا فی رؤیة هلال ذی الحجة فرآه أهل المکة لیلة الخمیس ولم یره أهل المدینة الا لیلة الجمعة فحصلت الوقفة برؤیة أهل مکة، ثم رجعوا إلی المدینة فأرخوا برؤیة أهلهافکان أوّل ذی الحجة الجمعة وأخره السبت وأوّل المحرم الأحد وآخر ه الاثنین وأوّل صفر الثلاثاء وآخر ه الأربعاء وأوّل ربیع الأوّل الخمیس فیکون ثانی عشرة الاثنین.

(فتح الباری کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته ﷺ: ج ۸ ص ۱۲۹ و کذا فی عمدة القاری: ج ۱۸ ص ۶۰)

پس باوثوق روایت کے مقابلہ میں ان بعض مؤرخین کے اقوال قابل حجت نہیں اسلئے ان کے اقوال کو باطل قرار دیا جائیگا، اب جمہور مشائخ کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

جمہور مشائخ اور قول مشہور کے مطابق آپ کی تاریخ وفات

(۱) مشہور اور معتمد تاریخ کی کتاب ''البدایہ والنہایہ'' میں علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ:

والمشهو رقول ابن إسحاق والواقدى (اى أنها فى الثانى عشر منه

(البداية والنهاية: ج ۵ ص ۲۷۶)

(۲) ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ ''روضہ'' میں لکھتے ہیں:

قال فى " الروضة الانف فى تفسير السيرة النبوية ". قال أكثرهم فى الثانى عشر من ربيع الأوّل . (ج۴ ص ۴۳۹ طبع بيروت)

(۳) علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں.

قال فى "التوشيح على الجامع الصحيح ":ومات يو م الاثنين من ربيع الأوّل بالإجماع فى الثانى عشر منه عند الجمهور. (التوشيح على الجامع الصحيح: ج ۴ ص ۱۴۳)

(۴) امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ " العبر" میں فرماتے ہیں:

قال فى "العبر فى الخبر من غبر" :توفىٰ سيد البشر أبو القاسم صلّى اللّٰه عليه وسلم فى وسط النهار(يوم) الاثنين ثانى عشر من ربيع الأوّل.

(العبر فى الخبر من غبر : ج ۱ ص ۱۱)

(۵) ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال فى " مرقاة المفاتيح شرح مشكوٰةالمصابيح " ومات يوم الاثنين ...... لاثنتى عشرة خلت منه وهو الأكثر. (ج ۱۰ ص ۳۰۱)

(۶) شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال فى " لامع الدرارى شرح البخارى" . فجزم ابن إسحاق وابن حبان وابن عبدالبر بأنه كان لاثنتى عشرة ليلة خلت منه وبه جزم ابن الصلاح والنووى فى شرح مسلم وغيره والذهبى فى العبر وصححه ابن الجوزى الخ .

(ج ۲ ص ۱۶۹)

پس مذکورہ بالا محدثین کرام اور ثقہ مؤرخین کی عبارتوں سے معلوم ہوا کہ جمہور مؤرخین اور محدثین کے

نزدیک آپکی تاریخ وفات ۱۲ ؍ربیع الاوّل کو ہے، یہی قول صحیح اور راجح ہے۔

آپکی ہجرت اور اقامت مدینہ کے اعتبار سے آپکی تاریخ وفات

جس روز آپ (ﷺ) ہجرت فرما کر مدینہ رونق افروز ہوئے وہ دوشنبہ کا روز تھا اور ۱۲ ؍ربیع الاوّل ۱۳؁ نبوی تھی اور آپ (ﷺ) مدینہ منورہ میں مکمل دس سال حیات تھے، پھر اسی تاریخ میں آپ کی وفات ہوئی۔ چنانچہ:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

عن ابن عباس قال أقام رسول الله صلى الله عليه وسلم بمكة خمس عشرة سنة يسمع الصوت ويرى الضوء سبع سنين ولايرى شيئاو ثمان سنين يوحى إليه وأقام بالمدينة عشرًا. (مسلم :باب قدر عمره (ﷺ) وإقامته بمكة والمدينة. ج۲ ص ۲۶۱)

(۲) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ "دلائل النبوۃ" میں حدیث نقل کرتے ہیں:

عن أبى البداح ابن عاصم بن عدى عن أبيه قال قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة يوم الاثنين عشرة ليلة خلت من شهر ربيع الأوّل فأقام بالمدينة عشرسنين (دلائل النبوية: ج۲ ص ۵۱۱ طبع دارالكتب العلمية بيروت)

(۳) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور حدیث نقل کرتے ہیں:

أخبرنا أبوالحسين بن الفضل قال: أخبرنا عبدالله بن جعفر قال حدثنا يعقوب بن سفيان قال : حدثنا عمار بن الحسن قال: حدثنا سلمة بن الفضل عن محمد بن إسحاق قال توفى رسول الله صلى الله عليه وسلم لاثنتى عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الأوّل اليوم الذى قدم فيه المدينةمهاجرًا فاستكمل رسول الله صلى الله عليه وسلم فى هجرته عشرسنين كوامل

(دلائل النبوية: ج۲ ص ۲۷۶ .طبع دارالكتب بيروت)

(۴) حافظ، مفسر، مؤرخ ابن کثیر فرماتے ہیں:

قال فى "البدايه والنهاية": قال إسحاق توفى رسول الله صلى الله عليه سلم لاثنتى عشرة ليلة خلت من شهر ربيع الأوّل فى اليوم الذى قدم فيه المدينة مهاجرًا واستكمل رسول الله صلى الله عليه وسلم فى هجرته عشرسنين كوامل

(ج۵ ص ۲۷۶ وكذا فى الكامل فى التاريخ : ج ۲ ص ۷ و كذا فى المنتظم فى تاريخ الملوك والأمم : ج۳ ص ۶۳)

مذکورہ بالا حدیثوں میں دو چیزوں کی تصریح موجود ہے:

(۱) آپ ﷺ ۱۲؍ ربیع الاوّل ۳ھ نبوی کو ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تھے پھر اسی تاریخ میں آپکی وفات ہوئی۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں کامل دس سال زندہ تھے، صحیح مسلم کی روایت "اَقَامَ بِالْمَدِيْنَةِ عَشْرًا" اور بیہقی کی روایت میں "فَاسْتَكْمَلَ فِیْ هِجْرَتِهٖ عَشْرَ سِنِیْنَ كَوَامِلَ" اگر یکم ربیع الاول کو آپکی تاریخ وفات قرار دیا جائے تو "عَشْرَ سِنِیْنَ كَوَامِلَ" یعنی کامل دس سال نہیں ہوتے بلکہ گیارہ روز باقی رہتے ہیں جو صحیح حدیث کے خلاف ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال مدینہ میں اقامت فرمائی، اس میں کسی کا اختلاف نہیں، فلہٰذا صحیح حدیث اور معتبر تاریخ اسلامی کی روشنی میں ثابت ہوگیا کہ آپ ﷺ کی تاریخ وفات بروز پیر بارہ ربیع الاول کو ہے یہی قول راجح اور صحیح ہے، جمہور مؤرخین اور محدثین اس پر متفق ہیں۔

پس دیوان باغی صاحب نے اگر سوال میں درج شدہ باتیں کہی ہیں تو ان کی ساری تحقیقات اور اپنی کوشش محدثین ومؤرخین ثقات کے نزدیک "هباءً منثورا" ہوجاتی ہیں۔

دیوان باغی صاحب کے استدلال کا جواب

دیوان باغی صاحب نے اپنے دعوے (یعنی آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ہے) پر دلیل نقلی اور عقلی سے استدلال کیا ہے؟

دلیل نقلی: حجاج بن روح کی حدیث جو کہ تفسیر طبری، درمنثور، ابن کثیر، مظہری وغیرہ میں مذکور ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

حدثنا القاسم قال حدثنا الحسين قال حدثني حجاج عن ابن جريج قال مكث النّبي صلى الله عليه وسلم بعد مانزلت هذه الاية احدى وثمانين ليلة (قوله تعالیٰ: اليوم أكملت لكم دينكم الخ)

(جامع القرآن عن تاويل القرآن: ج۴ ص ۱۰۶)

یعنی آیت بالا نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں صرف اکیاسی روز بقید حیات رہے۔

جواب:- حدیث بالا کے جواب سے قبل قارئین کرام کو ایک بات یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ اصول حدیث میں یہ قاعدہ مشہور ومعروف ہے کہ حدیث صحیح کے مقابل حدیث منکر اور متروک قابل

استدلال نہیں ہو سکتی ویسے ہی متروک الحدیث راوی کی روایت بھی ثقہ راوی کی صحیح روایت کے مقابل حجت نہیں ہوتی۔

حدیث بالا اور اسکے رُواۃ کے احوال ملاحظہ فرمائیں

(۱) یہ روایت پوری سند سے مروی نہیں جسقدر راویوں کا ذکر ہے ان میں حجاج ایک روای ہے، محدثین کے نزدیک اس کی روایت مقبول نہیں۔

چنانچہ حجاج کے بارے میں محدثین کے اقوال ملاحظہ فرمائیں:

✵ قال فی میزان الاعتدال : قال الدار قطنی : متروک وقال یحي: لیس بشیئ . (۲۳۷ [۲۳۳۲]. (ج ۲ ص ۲۰۱ طبع بیروت)

✵ قال فی "کتاب الضعفاء والمتروکین": حجاج بن روح الواسطی : یروی عن ابن جریج قال یحي : لیس بشیئ وقال الدار قطنی :متروک :(۷٦۸).
(ج ۱ ص ۱۹۲ طبع بیروت)

✵قال فی لسان المیزان :

حجاج بن روح عن ابن جریج قال الدار قطنی : متروک وقال یحیی لیس بشئ ۲۳۳۴. (ج ۲ ص ۳۲٦ دارالاحیاء بیروت)

یعنی حجاج بن روح واسطی جو کہ ابن جریج سے روایت کرتے ہیں اسکے بارے میں امام دار قطنی نے کہا: کہ وہ متروک ہے، امام یحیٰی نے کہا: کہ وہ قابل اعتبار آدمی نہیں یعنی اس کی روایت محدثین کے نزدیک مقبول نہیں، ان عبارتوں سے واضح ہو گیا ہے کہ اکیاسی روز والی روایت صحیح نہیں اور بارھویں تاریخ کے بارے میں جو حدیث اور تاریخی روایتیں ہیں وہ سب کی سب صحیح الاسناد ہیں جو جواب کے شروع میں واضح کردی گئی ہیں۔

فلہٰذا ان صحیح روایتوں کے مقابلہ میں حجاج بن روح کی روایت قابل حجت واستدلال نہیں۔

نیز اس اکیاسی روز کی تعداد پر تمام محدثین ومفسرین اور اہل تاریخ کا اتفاق نہیں

(۱) خود امام طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حکی الطبری: أن النبیّ صلی اللّٰہ علیه وسلم لم یعش بعد نزول هذه الایة

إلاحدى وثمانين ليلة والظاهر انه عاش أكثر بأيام يسير. (تفسير ثعالبى: ج۲ ص۳۴۳)

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی ایت نازل ہونے کے بعد اکیاسی دن سے کچھ زیادہ روز اسی دنیا میں جلوہ افروز تھے۔

(۲) علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال فی "البداية والنهاية" ولم يكن بين حجة الوداع ووفاة رسول الله صلى الله عليه وسلم احد وثمانون يومًا.

(كتاب الوفود والواردين الى رسول الله ﷺ ج۵ ص ۱۵۹ طبع دار الاحياء بيروت).

ترجمہ: حجۃ الوداع اور آپکی وفات کے درمیان اکیاسی دن کا فاصلہ نہیں تھا۔

(۳) ابن حجر عسقلانیؒ مختلف اقوال نقل کرتے ہیں:

قال فی "فتح البارى": مانقله الرافعي أنه عاش بعد حجته ثمانين يومًا وقيل احدى وثمانين واماعلى ما جزم به فى الروضة فيكون عاش بعد حجته تسعين يومًا أوْ احدى وتسعين. (كتاب المغازى، باب مرض النبى ﷺ ج ۸ ص ۱۶۳)

ترجمہ: رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ آپ ﷺ اسی ایت نازل ہونے کے بعد ۸۰ (اسی) روز زندہ تھے اور بعض نے کہا کہ اکیاسی دن زندہ تھے اور روضہ میں یقینی بیان یہ ہے کہ آپ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نوے یا اکیانوے روز اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

روضہ کا قول ۹۱ (اکیانوے) زیادہ صحیح اور راجح ہے اس صورت میں بارھویں تاریخ والی روایتوں اور ہجرت والی حدیثوں کے ساتھ کوئی تعارض وتضاد نہیں رہتا یعنی حجۃ الوداع اور آپکی وفات کے درمیان فاصلہ اگر اکیانوے روز کا ہو تو آپکی تاریخ وفات ۱۲ر ربیع الاوّل ہوگی اور ہجرت بھی کامل دس سال ہوگی، اب اس کا حساب ملاحظہ فرمائیں۔

۱۰ھ کی نویں ذی الحج میں یہ ایت نازل ہوئی تو ذی الحج کے مابقیہ دن ۲۰ روز + محرم الحرام کے ۳۰ روز + صفر المظفر کے ۲۹ روز پھر ۱۲ ربیع الاوّل کو آپ کی وفات ہوئی، تو ایت نازل ہونے کے بعد آپ ﷺ اس دنیا میں ٹوٹل = ۹۱ (اکیانوے) روز جلوہ افروز رہے۔

انکی نقلی دلیل کا دوسرا جزء

دیوان باغی صاحب نے معارف القرآن کے حوالہ سے اکیاسی دن کے متعلق حضرت ابن عباس

رضی اللہ عنہما کی ایک اور روایت نقل کی ہے وہ بھی قابل حجت نہیں چونکہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے خلاف حدیث روایت کی ہے۔ چنانچہ:

روی سیف بن عمر بإسناد عن بن عباس قال لما قضی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ سلم حجة الوداع ارتحل فأتی المدینة وأقام بها ذاالحجة ومحرم وصفر ومات یوم الاثنین لثانی عشر خلون من ربیع الأوّل من سنة احدی عشرة.

(عمدة القاری شرح البخاری. ج۱۸ ص ۶۰)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد مدینہ منورہ میں ذی الحج کے مابقیہ بیس دن اور محرم وصفر مکمل دو مہینے اور ربیع الاوّل کی گیارہ تاریخ تک زندہ تھے ۱۲؍ربیع الاوّل کو آپکی وفات ہوئی۔

اسی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حساب کر کے کہا کہ آپ کی تاریخ وفات ۱۲؍ربیع الاوّل ہے، پس آپ کی دونوں روایتوں میں جب تعارض ہوا اور ۱۲؍تاریخ کے متعلق صحیح حدیث موجود ہے، تو دوسری روایت غلط ہے، اور اصولاً ۱۲؍تاریخ کی روایتِ صحیحہ کو ترجیح ہوگی، ترجیح کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ دوسری روایت ابن عباس کی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خلاف ہے حالانکہ آپ کی تاریخ وفات کے بارے میں سب سے زیادہ واقف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں وہ خود فرماتی ہیں:

إن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم توفیٰ فی بیتی وفی یومی وبین سحری ونحری وأن اللّٰہ جمع بین ریقی وریقه عند موته الخ .

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں اور میری باری کے دن وفات پائی آپ نے میرے سینہ اور ہنسلی کے درمیان اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی وفات کے وقت میرے اور آپ ﷺ کے لعاب دہن کو جمع کر دیا تھا۔

✸ تحریری سوال نامہ کے مطابق دیوان باغی صاحب نے ”معارف القرآن“ کی عبارت نقل کرنے میں خیانت کی یعنی پوری عبارت نقل نہیں کی چونکہ خود حضرت مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں......

کیونکہ ۱۰ھ نویں ذی الحجۃ میں یہ ایت نازل ہوئی اور ۱۱ھ ...... کی بارھویں ربیع الاوّل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ (معارف القرآن جلد سوم، صفحہ ۳۳)

معلوم ہوا صاحب تفسیر نے ۱۲؍ربیع الاوّل کی روایت سے اتفاق کیا یکم ربیع الاوّل سے اتفاق نہیں کیا، پس معارف القرآن کی عبارت سے جناب کا استدلال درست نہیں ہوا۔

دیوان باغی صاحب کی عقلی دلیل کا جواب

تحریری سوال نامہ کے مطابق دیوان باغی صاحب نے کہا کہ ماہِ صفر کے آخری بدھ کو آپ ﷺ تندرست ہوئے، پھر آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کے ساتھ باجماعت نماز پڑھی یہ روز آپکی وفات سے پانچ دن قبل بدھ کا دن تھا، جو چہار شنبہ سے معروف و مشہور ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں اس پانچ دن کے بعد آپکی وفات ہوئی تو اس حساب سے آپکی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ہے، اب اگر بارھویں تاریخ کو آپ کی تاریخ وفات کہا جائے تو آخری چہار شنبہ کیسے رہے گا؟ بلکہ درمیان میں اور ایک بدھ آجائے گا۔

جواب:- واضح رہے کہ دینی مسئلہ میں ادلۂ شرعیہ کے تتبع و تلاش کے بغیر اٹکل سے بات کرنا ضلالت اور گمراہی ہے اور اسی طرح ذاتی اجتہاد سے کسی غیر مشروع امر کو مشروع کرنے کی کوشش کرنا تحریفِ دین کے مترادف ہے۔

دیوان باغی صاحب کے سوا آج تک کسی محدث اور مؤرخ نے آخری چہار شنبہ کے حساب سے آپ ﷺ کی تاریخ وفات نہیں نکالی، دیوان باغی صاحب ہی نے پہلی مرتبہ کیا ہے اور اس نے کہا کہ ”آپ ﷺ ۲۵؍صفر کو تندرست ہوئے جس کو چہار شنبہ کہا جاتا ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں“

حالانکہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ اس بارے میں محدثین اور مؤرخین کے مابین کافی اختلاف ہے۔ چنانچہ کتب تواریخ میں ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت کی ابتداء کس دن ہوئی اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، ایک قول یہ ہے کہ ہجرت کے گیارھویں سال ماہِ صفر کے اخر میں ۲۷؍ یا ۲۸ تاریخ کو درد سر کے شدید حملہ سے آپ کے مرض الموت کا آغاز ہوا اور ایک روایت کے مطابق محرم کے مہینے ہی میں آپ پر بخار کا حملہ ہوگیا تھا، ۲۶؍صفر کو بیماری سے کسی قدر افاقہ ہوا تھا اور ۲۸؍صفر ہی کو پھر بیماری میں اشتداد پیدا ہوگیا، ایک روایت یہ ہے کہ مرض الموت کا آغاز ماہ ربیع الاوّل کے شروع میں ہوا ابن جوزی نے ”کتاب الوفات“ میں یہ لکھا ہے کہ آپ کے مرض وفات کا آغاز ماہِ صفر کی اس تاریخ کو ہوا جبکہ مہینہ ختم ہونے میں دس راتیں باقی تھیں اور آپکا وصال ۱۲؍ربیع الاوّل کو ہوا۔ (بحوالہ مظاہر حق ج۷ ص ۱۹۰)

✹ بدر الدین عینیؒ نقل فرماتے ہیں:

قال فی ”عمدۃ القاری“ وقال الواقدی قالوا بدی برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الأربعاء للیلتین بقیتا من صفر وتوفی فی یوم الاثنین لاثنتی عشرۃ لیلۃ

من ربيع الأوّل وبه جزم محمد ابن سعد . (ج١٨ص٦٠)

غرض یہ کہ صحیح روایتوں اور تواریخ سے ثابت ہوگیا کہ آپکی تاریخِ وفات ۱۲؍ربیع الاول ہے اور اس کی تفصیلی بحث پہلے گذر چکی ہے، پس دیوان باغی صاحب نے جو عقلی دلیل وحساب پیش کیا وہ صحیح نہیں بلکہ غلط ہے۔

ائمہ دین پر دیوان باغی کا ناجائز حملہ اور ثابت شدہ امر کا انکار

دیوان باغی صاحب نے اپنی تحریر میں لکھا ہے:

درحقیقت آپ کی تاریخ وفات یکم ربیع الاوّل ہی تھی مگر یزیدی حکومت اور انکے متبعین نے سازش کر کے ۱۲؍ربیع الاوّل کہا، تاکہ ”عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ جیسی اہم اور ضروری عبادت سے مسلمان غافل اور اس کی رحمت وبرکت سے محروم رہیں پھر بعد میں آنے والے مؤرخین نے بھی اس سازش کے شکار ہوگئے اور آپکی تاریخ وفات ۱۲؍ربیع الاوّل کو کہدیا، پس ۱۲؍ربیع الاوّل صرف آپکی تاریخ ولادت ہے، یہ روز سوگ کا دن نہیں اس لئے مسلمانوں پر اس روز میں ”عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کی تقریب کرنا واجب اور ضروری ہے۔

علم ودانش والے مسلمانوں کو سوچنا چاہئے کہ دیوان باغی صاحب کیا فرماتے ہیں؟ اس نے جو کچھ کہا کہ تمام محدثین اور مؤرخین اور مفسرین نے یزیدی حکومت کی سازش کا شکار ہوکر اپنی اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کی تاریخ وفات کو غلط لکھدیا، پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جلیل القدر محدثین، ومفسرین و مؤرخین کرام اور ائمہ دین جیسے امام بیہقی ابن کثیر، امام نووی، امام ذہبی، ابن جوزی، واقدی، ابن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ، ابن سعد، بن حبان، ابن عبدالبر، ابن الصلاح وغیرہم کی کتابیں معتبر نہیں ہیں، ان میں اغلاط ہیں، ان کی کتابوں سے استدلال درست نہیں، حالانکہ امت نے ان ائمہ دین اور محدثین عظام پر اعتماد کیا ہے، ان کو حجت مانا ہے، اور جمہور امت نے اس کو راجح قرار دیا ہے لہٰذا اسی کو اختیار کرنا لازم ہے، دیوان باغی صاحب نہ محدث ہے، نہ مفسر، نہ محقق ان پر لوگ کیوں اعتبار کریں گے جبکہ انکے عقائد بھی فاسد ہیں اہل سنت والجماعت کے مخالف ہیں اہل سنت والجماعت کی اکثریت نے ۱۲؍ربیع الاول کی تاریخ وفات کو قبول کیا اور تسلیم کیا ہے پوری دنیا میں اسکی اشاعت ہوئی ہے آئندہ بھی اسی کی اشاعت ہوگی اور ہوتی رہے گی اِنشاءاللہ۔ ”وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ (الصف۔۸) وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ

”(اللہ تعالیٰ نور اسلام کو چمکائیگا باطل کو مٹائیگا)۔

دیوان باغی صاحب کی دوسری اغلاط بھی بے شمار ہیں جنکے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تا کہ لوگ انکی گمراہی سے بچ سکیں۔

مولانا مفتی شمس الحق صاحب ترید پوری ”باطل پیر کا تعارف“ میں لکھتے ہیں:

(۱) وہ حشر ونشر کا منکر ہے اور تناسخ کا قائل ہے دیکھئے (باطل پیر کا تعارف بنگلہ ص ۲۳)

(۲) وہ عذاب جہنم کا منکر ہے۔ ،، ،، ،، ،، ،، ،، صفحہ ۲۸

(۳) وہ میزان کا منکر ہے ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۳۱

(۴) وہ کراما کاتبین کا منکر ہے ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۳۵

(۵) پل صراط کا منکر ہے ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۳۸

(۶) مہدی علیہ السلام کا منکر ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، ۳۸

اس قسم کے بے شمار عقائد فاسدہ اسی کتاب میں موجود ہیں، نام کتاب: ”باطل پیر کا تعارف“ بنگلہ (تصنیف از مولانا مفتی شمس الحق صاحب رئیس دار الافتاء المرکز الاسلامی، بابر روڈ محمد پور ڈھاکہ: (فون: ۹۱۲۷۸۶۷، ۸۱۱۴۹۸۰)

نوٹ: جشن جلوس عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں (یعنی بدعت وناجائز ہونے پر) دار الافتاء والعلوم الاسلامیہ، چاندگاؤں، چاٹگام کی طرف سے ایک رسالہ شائع ہوا اس میں اس کی تفصیلی تحقیق موجود ہے، لہٰذا عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات چاہئیے تو ”دار الافتاء والعلوم الاسلامیہ“ چانگاؤں یا ”دار الافتاء خادم القرآن والسنۃ“ غفور بیو، راجاخالی، چکتائی، چاٹگام، سے رجوع کرلیں۔ **هذا ما ظهر لي ولشيوخنا. فقط والله تعالىٰ أعلم وعلمه أحكم وأتم صلى الله عليه وسلم واله وأصحابه أجمعين. يارب العالمين.**

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۳۰؍ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۳۰؍ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

اجتماعی طور پر سورۂ حشر کی آخری آیتیں بلند آواز سے پڑھنے کا التزام بدعت ہے

(۵۰) سوال: - جناب مفتی صاحب! مجھے چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ حوالہ کے ساتھ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) روزانہ نماز فجر کے بعد اجتماعی طور پر بلند آواز سے سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں پڑھنے کا التزام (کہ تخلف نہ ہو) کرنا کیسا ہے؟

(۲) سورۂ حشر کی آخری تین آیات پڑھتے وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کے بعد بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنا کیسا ہے؟

(۳) قرأت محفل میں بعض قراء حضرات کی تلاوت کے وقت لوگ بلند آواز سے تکبیر یا تسبیح پڑھتے ہیں یہ طریقہ سلف صالحین سے منقول ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱): سورۂ حشر کی آخری تین آیتوں کو پڑھنے کی فضیلت حدیث سے ثابت ہے پابندی کے ساتھ پڑھنا چاہئے مگر ہیئت اجتماعیہ کا التزام اگر تعلیماً نہ ہو تو اس کا ثبوت قرون ثلاثہ سے نہیں ہے، اس لئے اسطرح پڑھنا نہیں چاہئے یہ التزام بھی بدعت کے زمرے میں آتا ہے البتہ امام صاحب اگر تعلیم کی غرض سے کبھی کبھی ہیئت اجتماعیہ کا اہتمام کریں تو یہ جائز ہے بلکہ مستحب ہے۔

كمافی "البزازية على هامش الهندية": واعظ يدعو كل أسبوع بدعاء مسنون جهراً لتعليم القوم ويخافت القوم اذاتعلم القوم خافت هو أيضا وإن جهر فهو بدعة. (ج ۴ ص ۴۲)

جواب (۲): - حدیث شریف میں تسمیۃ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے، اس لئے نہ پڑھنا افضل ہے اور یہی سنت متوارثہ کے عین مطابق ہے البتہ کسی نے آداب تلاوت کا لحاظ کرتے ہوئے پڑھی تو جواز معلوم ہوتا ہے۔

جواب (۳): - تلاوتِ قرآن کے وقت اس کے آداب واحترام کا لحاظ کرنا واجب ہے یعنی کان لگا کر سننا واجب ہے شور وغل کرنا، چیخ مارنا وغیرہ ناجائز ہے البتہ دل دل میں کلام اللہ کی تصدیق کرنا اور تکبیر کہنا درست ہے۔

قال: فی "الشامية": قال فی الهندية: رفع الصوت عند سماع القرآن والوعظ

مکروه ومایفعله الذين يدعون الوجد والمحبة لاأصل له ويمنع الصوفية من رفع الصوت وتخريق الثياب كذافى السراجية. (مطلب فى المواضع التى تكره فيها الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم. (ج ا ص ۵۱۹)

وفى "الهندية" يكره الصعق عند القرأة ...... وقدردالصحابة والتابعين والسلف الصالحين فى المنع من الصعق والزعف والصياح عند القرأة.

صورت مسئولہ میں اسطرح تکبیر وتسبیح کہنے کو عبادت اور فضیلت سمجھ کر بلند آواز سے پڑھنا روایات سے ثابت نہیں پس مذکورہ تسبیح وتکبیر کا طریقہ غیر ثابت ہے البتہ کسی کی بے اختیار اور بے قابو ہوکر تسبیح یا تکبیر کی آواز نکل گئی تو حرج نہیں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۶؍ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۶؍ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ

آپ ﷺ کے اسم گرامی سنتے وقت انگوٹھے چومنا بدعت ہے

(۵۱) سوال:- ایک بریلوی عالم صاحب نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی سنتے وقت انگوٹھے چومنا سنت ہے، حدیث شریف میں اس کے فضائل کا ذکر ہے، چنانچہ:

(۱) "مسند الفردوس" میں ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قبل باطن الأنملتين السباحتين ومسح عينيه فقال صلى الله عليه وسلم من فعل مثل مافعل خليلى فقد حلت له شفاعتى.

لہٰذا اذان میں أشهد أن محمّدًا رسول اللّه " سنا تو ہم نے شہادت کی دونوں انگلیوں کے پوروں کو چوما اور انکھوں سے لگایا۔

(۲) کتاب "مدارج النبوة" اور "فتاویٰ جواہر" میں بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی انگوٹھے کو بوسہ دیا ہے۔

(۳) حضرت امام حسین کی روایت ہے کہ جو آدمی اذان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک سنکر ابہام کو بوسہ دیکر آنکھوں پر رکھے گا تو وہ اندھا نہ ہوگا اور اس کی آنکھیں کبھی درد نہ کریں گی۔ (نور العینین)

(۴) **قال القهستانی فی شرحه الکبیر نقلاً عن کنز العباد .**

اعلم أنه يستحب أن يقال عند السماع الأولى من الشهادة الثانية صلى الله عليك يارسول الله وعند سماع الثانية قرة عينى بك يارسول الله متعنى بالسمع والبصر بعد وضع ظفر الابهامين على العينين فإنه صلى الله عليه وسلم قائد له إلى الجنة. (حاشية جلالين شريف (ج۲ ص۳۵۷)

اس قسم کی روایتیں ہیں مگر دیوبندی حضرات کو ان کا علم نہیں خواہ مخواہ وہ لوگ بکواس کرتے ہیں اب سوال یہ کہ عالم صاحب کی ذکر کردہ روایتیں کہاں تک درست اور قابل قبول ہیں۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک سنتے وقت درود شریف پڑھنے کی تاکید اور فضیلت احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اس لئے آپ ﷺ کا اسم گرامی سنتے وقت درود شریف پڑھنا واجب ہے اور اذان کے اندر مؤذن صاحب سے جب "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" سنیں تو انہیں الفاظ سے جواب دینا سنت ہے، چنانچہ بخاری اور مسلم شریف میں ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا سمعتم المؤذن فقولوا مثل مايقول الخ. (بحوالہ مشکوٰۃ شریف : ج ۱ ص ۶۴)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤذن جب اذان کہے تو مؤذن کے الفاظ کے ساتھ سننے والا وہی الفاظ دہرائے مگر حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح میں لاحول ولاقوۃ الخ پڑھیں۔

لیکن اذان میں اسم گرامی سنتے وقت انگوٹھے چومنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں اسلئے خلاف سنت اور بدعت ہے، نیز یہ عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین رحمہم اللہ سے ثابت نہیں ہے، سوال کے اندر ذکر کردہ روایتیں موضوع روایات ہیں اور روایات موضوعہ سے استدلال کرنا ناجائز اور باطل ہے۔

چنانچہ مذکورہ روایتوں کے بارے میں امام جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں:

الأحاديث التى رويت فى تقبيل الأنامل وجعلها على العينين عند كل سماع اسمه صلى الله عليه وسلم عن المؤذن فى كلمة الشهادة كلها موضوعات.

(تیسیر المقال للسیوطی).

نوٹ:- اکثر علماء بریلوی قرآن وحدیث اور فقہ کے علم میں کچے ہوتے ہیں اس لئے وہ لوگ صحیح اور موضوع روایتوں میں تمیز نہیں کر سکتے جو بھی روایت خواہ کیسی ہو اس کو یہ لوگ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، البتہ علماء دیوبند اکثر محققین ہوتے ہیں اسلئے وہ حضرات تحقیق کے ساتھ بتاتے ہیں کہ کون سی حدیث صحیح اور کونسی حدیث غیر صحیح کونسا عمل صحیح اور کونسا عمل غیر صحیح ہے۔

ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء. (الجمعة. ۴)

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ أعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللّٰہ عنہ
۱/۳/۱۹۲۷ھ	۱/۳/۱۹۲۷ھ

قبروں پر چادریں چڑھانا اور پھول وغیرہ ڈالنا بدعت ہے

(۵۲) سوال:- جناب مفتی صاحب! کچھ دن پہلے ہمارے علاقے کے ایک M.p (ایم، پی) صاحب کا انتقال ہوا، گذشتہ ہفتہ اس کے وارثین نے ایصال ثواب کے لئے ایک محفل میلاد کا انتظام کیا، بعض لوگ اس کی قبر پر پھول وغیرہ ڈالنے لگے، میں نے کہا قبر پر پھول کی مالا وغیرہ ڈالنا بدعت ہے اور اسی مجلس میں ایک بریلوی عالم صاحب بھی حاضر تھے انہوں نے کہا بدعت نہیں اس کا ثبوت حدیث شریف سے ہے پھر انہوں نے کھجور کی ٹہنی گاڑنے والی حدیث کو بطور دلیل پیش کیا، حاضرین مجلس میں سے بعض لوگوں نے مولوی صاحب سے کہا: کہ امام صاحب نے تو قبروں میں پھول وغیرہ ڈالنے سے منع کیا اور آپ نے جائز کہا، کیا بات ہے آپ لوگوں میں اتنے اختلافات کیوں ہیں؟ اور اسی موضوع پر جب بات چیت لمبی ہونے لگی تو علاقے کے کمیشنر صاحب نے حاضرین مجلس سے کہا کہ آپ لوگ جھگڑا مت کرو آئندہ دونوں فریقوں کے علماء حضرات اپنے اپنے دعویٰ پر قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں تحریری فتوی پیش کریں پھر فیصلہ ہوگا اسی بات پر بحث ختم ہوگئی آئندہ اس پر تحقیقی فیصلہ ہوگا۔

لہٰذا جناب عالی سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر اپنا محققانہ تحریری فتوی اور مدلل ومفصل جواب دیکر ہمارے درمیان واقع ہونے والی غلط فہمیوں کو دور فرمائیں۔

الجواب ومنه الصدق والصواب۔

قبروں پر چادریں چڑھانا اور پھول وغیرہ نچھاور کرنا بدعت اور ناجائز ہے، خیر القرون سے اس کا ہرگز کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ چنانچہ:

(۱) علامہ بدرالدین عینیؒ شارح بخاری فرماتے ہیں:

ولكن مايفعله أكثر الناس من وضع مافيه رطوبة من الرياحين والقبول ونحوهما على القبول ليس بشئ وإنماالسنة الغرز.

(عمدة القاری شرح البخاری: ج۳ص ۱۲۱)

یعنی بعض لوگ قبروں پر تازہ پھول وغیرہ جو نچھاور کرتے ہیں وہ بے اصل ہے البتہ کھجور کی ٹہنی گاڑنا ثابت اور مستحب ہے۔

(۲) امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وقد أنكر الخطابى مايفعله الناس على القبور من الأخواص ونحوها متعلقين بهذا الحديث وقال لاأصل له ولاوجه له. والله اعلم. (ازحاشیه مسلم شریف : ج۱ ص ۱۴۱)

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قبروں پر تازہ پھول وغیرہ نچھاور کرنے کے متعلق شریعت مطہرہ میں کوئی اصل نہیں۔

(۳) خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

امّا إلقاء الرياحين على القبور.... قلت وصرح العينى أنه لغو وعبث وقال الخطابى أن مايفعله الناس على القبور لاأصل له الخ . (فیض الباری شرح البخاری :ص ۱ ج ۱ ۳۱۱)

یعنی قبروں پر تازہ پھول وغیرہ نچھاور کرنا ایک لغو اور خلاف شرع کام ہے۔

(۴) علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ "فتح الملهم شرح مسلم" میں فرماتے ہیں:

قلت وأما وضع الرياحين والبقول ونحوها على قبور أولياء اللّٰه والصالحين دون العصاة المعذبين اى الذين كان ظاهر حالهم الفسوق والعصيان كمايفعله كثيرمن المبتدعة فى عصرنا فليس من اتباع هذا الحديث فى شئ فمن شاء أن لايغتر بتموية بعض الجهلة فلايغتر واللّٰه الموفق. (فتح الملهم شرح مسلم : ج۳ص ۹۴)

خلاصہ یہ کہ بعض مبتدعین اولیاء کرام کی قبروں پر جو چادر و تازہ پھول وغیرہ ڈالتے ہیں یہ بدعت وخلاف شرع کام ہے۔

(۵) محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

قال الراقم اتفق الخطابی والطرطوسی والقاضی عیاض علی المنع وقولهم اولیٰ بالاتباع حیث اصلح مثل المسافحات التعللات مثارًا. للبدع المنکر والفتن والسائرة فتری العامة یلقون الزهور علی القبور والاخص علی قبور الصلحاء والاولیاء والجهلة منهم ازدادوا إصرارًا علی ذلک وتعاونوا فیه .... وبالجملة هذه بدعة مشرقیه منکرة وبجنبها بدعة مغربیة قدراجت فی کثیر من البلادالشرقیة التی تدعیٰ بلاد اسلامیة وهی بلاد مصر وماوَالاها واستمع لذلک بلسنان بعض علماء القاهرة وقضاة مصر یقول ازداد العامة إصرارًا علی هذا العمل الذی لاأصل له وغلوًا فیه خصوصًا فی بلاد مصر تقلیدًا للنصاری حتی صاروا . یصنعون الزهور علی القبور والریحان الذی یوضع فی القبور. وکل هذه بدع ومنکرات لاأصل لهافی الدین ولامسند لهافی الکتاب والسنة ویجب علی أهل العلم أن ینکروها ان یبطلوا هذه العادات مااستطاعوا انتهی. (ج ا ص: معارف السنن شرح الترمذی: ج ا ص۲۶۵. ۲۶۶)

یعنی قبروں پر چادر چڑھانا اور تازہ پھول وغیرہ نچھاور کرنا بدعت اور غلوفی الدین ہے قرآن وحدیث اور فقہ وفتاویٰ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں، اس لئے یہ سب کام بدعت ہیں اور اہل علم پر ضروری ہے کہ اس کے متعلق لوگوں کو سمجھائیں۔

(۶) فقیہ ملت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فتاوی محمودیہ میں لکھتے ہیں:

دفن کے بعد پانی چھڑکنا مستحب ہے تاکہ قبر کی مٹی جم جائے منتشر نہ ہو لیکن پھول ڈالنا ثابت نہیں۔ (فتاویٰ محمودیہ : ج۱۶ ص۴۶۳)

پس مذکورہ بالاحوالاجات سے ثابت ہوا کہ قبروں پر چادریں چڑھانا اور پھول وغیرہ ڈالنا بدعت اور ناجائز ہے، اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بچنے کی توفیق نصیب فرماویں۔

اب مولوی صاحب کی ذکر کردہ حدیث کا جواب سنئے: مولوی صاحب نے جس حدیث کو پیش کیا ہے، اس کے متن کو دیکھئے پھر مولوی صاحب کا مغالطہ ظاہر ہوجائے گا۔

عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنه قال مرّالنّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم بقبرین فقال إنهما لیعذبان ومایعذبان فی کبیر أما أحدهما فکان لایستنزه من البول وفی

روایة لمسلم لایستنزه من البول وأما الأخر فكان يمشى بالنميمة ثم أخذجريدة رطبة فشقها بنصفين ثم غرز فى كل قبرواحدة فقالوا يارسول الله صلى الله عليه وسلم لم صنعت هذا فقال لعله ان يخفف عنها مالم ييبسا.

(بخاری شریف: بحواله مشکوٰة :اداب الخلاء. ج ا ص ۴۲)

حدیث مذکور میں صرف تر کھجور کی ٹہنی گاڑنے کا ذکر ہے اس میں تازہ پھول وغیرہ ڈالنے کا ذکر قطعاً نہیں ہے، پس مولوی صاحب کا استدلال غلط ہے۔

چنانچہ علامہ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں:

كماقال العينى مايفعله أكثر الناس من وضع مافيه رطوبة من الرياحين والبقول ونحوها على القبوروليس بشئ إنما السنة الغرزَ. (عمدة القاری شرح بخاری: ج۳ص ۱۲۱)

یعنی قبروں پر تازہ پھولوں ڈالنے کی بعض لوگوں میں عادت ہے وہ بالکل بے اصل اور لغو ہے ثواب سمجھ کر کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۶؍ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی درالافتاء
۱۶؍ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۴ھ

بدعت کی تعریف، منطق وفلسفہ کی تعلیم بدعت کے تحت داخل نہیں ہے

(۵۳) سوال:- جناب مفتی صاحب! گذشتہ جمعہ کی تقریر میں حضرت خطیب صاحب نے کہا کہ ”شر الامور محدثاتها“ یعنی دین کے نام سے نئی نئی چیزوں کا اختراع کرنا بدعت اور ضلالہ ہے اور ہر صاحب بدعت جہنمی ہوگا، اب بندہ کو اشکال ہوا کہ ہر نئی چیز اگر بدعت ہو، تو پکی مسجد، مدرسہ خانقاہ وغیرہ بنانا بھی بدعت ہونی چاہئے، چونکہ یہ امور بھی خیر القرون میں نہیں تھے، اب مندرجہ ذیل مسائل کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) بدعت کی جامع مانع تعریف کیا ہے؟

(۲) منطق وفلسفہ وغیرہ کا وجود جبکہ خیر القرون کے زمانہ میں نہیں تھا ان میں سے کسی علم کو پڑھنا، حاصل کرنا اساتذۂ کرام کا ترغیب دینا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱): -محدثین کرام نے بدعت کی تعریف مختلف الفاظ سے کی ہے۔ چنانچہ:

(۱) علامہ مجدالدین فیروز آبادیؒ المتوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

بدعة بالكسر الحدث فى الدين بعد الإكمال أو ما استحدث بعد النبى صلى الله عليه وسلم من الأهواء والأعمال . (قاموس)

ترجمہ: بدعت (کسرہ کے ساتھ) ایسی چیز کو کہا جاتا ہے جو تکمیل دین کے بعد نکالی گئی ہو یا وہ چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کے بعد خواہشات اور اعمال کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہو۔

(۲) امام راغب اصفہانیؒ المتوفی سن ۵۰ھ لکھتے ہیں۔

والبدعة فى المذهب إيراد قول لم يستن قائلها أو فاعلها فيه بصاحب الشريعة وأماثلها المتقدمة وأصولها المتقنة. (مفردات قرآن: ۳۷)

ترجمہ: مذہب میں بدعت کا اطلاق ایسے قول پر ہوتا ہے جس کا قائل یا فاعل صاحب شریعت کے نقش قدم پر نہ چلا ہو اور شریعت کی سابق مثالوں اور اسکے محکم اصولوں پر وہ گامزن نہ ہوا ہو۔

(۳) امام محمد بن ابی بکر بن عبدالقادرؒ الرازی لکھتے ہیں:

والبدعة : الحدث فى الدين بعد الإكمال . (مختار الصحاح : ۲۸۰)

ترجمہ: بدعت اکمال دین کے بعد اس میں احداث کا نام ہے۔

(۴) حافظ بدرالدین عینیؒ متوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں:

والبدعة فى الأصل إحداث أمر لم يكن فى زمن رسول الله صلّى الله عليه وسلم.

ترجمہ: بدعت اصل میں ایسی نو ایجاد چیز کو کہتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھی۔

(۵) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں:

والبدعة أصلها ما أحدث على غير مثال سابق وتطلق فى الشرع فى مقابل السنّة فتكون مذمومة. (فتح الباری: ج۴ص ۲۱۹)

ترجمہ: بدعت اصل میں اس چیز کو کہا جاتا ہے جو بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے ایجاد کی گئی ہو اور شریعت میں بدعت کا اطلاق سنت کے مقابلہ میں ہوتا ہے لہذا وہ مذموم ہی ہوگی۔

(۶) وقيل البدعة السيئة هى التى ليس لها من الكتاب والسنة أصل وسند ظاهرًا وخفى ملفوظ أو مستنبط. (مجالس الأبرار: ۱۳۲)

(۷) قال النووى البدعة كل شئ عمل على غير مثال سابق وفى الشرع البدعة إحداث مالم يكن فى عهد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم. (كمافى المرقاة)

(۸) وقال الشافعى رحمة اللّٰه عليه ماأحدث مما يخالف الكتاب والسنة والأثر والإجماع فهو ضلالة وماأحدث من الخير فما لايخالف شيئا من ذالك فليس بمذموم. (كمافى المرقاة)

یعنی حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر محدثین کرام نے بدعت کی جو تعریف کی ہے اس کا خلاصہ یہ کہ "الزيادة فى الدين أو النقصان منه" یعنی دین میں کوئی نئی چیز پیدا کر کے اس میں اضافہ کرنا یا اس میں جس قدر ہے اس میں سے کچھ گھٹانا بدعت ہے، لیکن ہر وہ چیز جو حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین کے عہد مبارک میں نہیں تھی بلکہ ان کے بعد ایجاد ہوئی مثلاً علم نحو کا ایجاد کرنا، اصول فقہ کی تدوین کرنا، جرح وتعدیل کے قواعد مقرر کرنا، خانقاہوں کا بنانا، مدارس دینیہ کا بنانا وغیرہ وغیرہ یہ چیزیں بدعت نہیں ہیں، کیونکہ بدعت وہ ہے جو کہ دین کے فرائض یا واجبات اور سنن میں نہ تھی مگر کسی نے فرض یا واجب یا سنت کہکر یا سمجھ کر بڑھا دیا جبکہ مذکورہ چیزیں ایسی نہیں، دین میں اضافہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ دین کی حفاظت کے لئے ان کو بڑھایا گیا ہے، مثلاً قرآن کی کسی سورت میں سات آیات ہیں اس میں آٹھ آیات لکھدینا تحریف اور بدعت ہے اور اذان کے الفاظ میں درود شریف نہیں پھر کسی نے کلمات اذان میں درود شریف بڑھا دیا تو بدعت ہے۔

جواب (۲):- منطق، فلسفہ پڑھنا بدعت نہیں کیونکہ پڑھنے والے اور پڑھانے والے ان کو قرآن وحدیث سمجھنے کا ذریعہ سمجھ کر پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں ان کو عبادت محضہ نہیں سمجھتے نیز منطق، فلسفہ وغیرہ کتابیں پڑھنے سے طلبہ کی ذہن میں تیزی اور استعداد پیدا ہوتی ہے اور قرآن وحدیث اور فقہ کے نکات اور تحقیقات کو کماحقہ سمجھنے کے لئے کافی استعداد کی ضرورت ہے، بدون استعداد کے انکا سمجھنا مشکل ہے، اسلئے وسائل کی کتابیں پڑھنا ضروری ہے اسکی تعلیم وتعلم میں نیکی ہے چنانچہ شیخ عزالدین بن عبدالسلامؒ فرماتے ہیں:

البدعة اما واجبة كتعلم النحو لفهم كلام اللّٰه ورسوله و كتدوين أصول الفقه واما محرمة كمذهب الجبرية والقدرية و المرجئة والمجسمة والرد على

هؤلاء من البدع الواجبة لأن حفظ الشريعة من هذه البدعة فرض كفاية وإما مندوبة كإحداث الربط و المدارس و كل إحسان لم يعهد فى الصدر الأوّل و كالتراويح أى بالجماعة العامة و الكلام فى دقائق الصوفية و امامكروهة كزخرفة المساجد وتزويق المصاحف يعنى عندالشافعية .وأماعند الحنفية فمباح و امامباحة كالمصافحة عقيب الصبح و العصر أى عند الشافعيةأيضًا وإلافعند الحنفية مكروه (مرقات شرح المشكوٰة: ج ۱ ص ۳۶۸)

یعنی بعض بدعتیں واجب اور ضروری ہیں جیسے کلام اللہ اور احادیث نبوی کو سمجھنے اور دین کا اصل علم حاصل کرنے کیلئے نحو وصرف کے فن کو سیکھنا اور ان کی تعلیم لینا اسی طرح اصولِ فقہ کی تدوین، بعض بدعتیں حرام ہوتی ہیں جیسے جبریہ اور قدریہ کا مسلک ہے جب کہ اس مسلک کی تردید میں بدعت واجب مانی جائے گی، بعض بدعتیں مستحب ہیں مثلاً خانقاہوں اور مدارس کا قیام، اسی طرح امت مسلمہ کی خدمت اور فلاح و بہبود کے وہ کام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں تھے بعض بدعتیں مکروہ ہیں جیسے مساجد کے در و دیوار پر نقش ونگار کرانے اور کلام اللہ (مصحف) میں زیبائش و مینا کاری، بعض بدعتیں مباح ہیں جیسے صبح کی نماز کے بعد مصافحہ جو امام شافعی مسلک میں مباح ہے اور حنفی مسلک میں مکروہ ہے۔ تو وسائل کی کتابیں جبکہ قرآن وحدیث اور فقہ کی موقوف علیہ کتابیں ہیں اسلئے ان کو سیکھنا ضروری ہے، اور ان کی تعلیم وتعلم میں بھی قرآن وحدیث کو سیکھنے کی طرح کا ثواب ملے گا۔

فقط و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

بدعت حسنہ اور سیئہ پر ایک اشکال اور اس کا جواب

(۵۴) سوال:- بندہ ایک سرکاری کامل مدرسہ کا محدث ہے بندہ کی تقسیم میں مشکوٰۃ کی کتاب الایمان اور الصلوٰۃ ہیں، بات یہ کہ بعض شارحین حدیث نے ”کل بدعة ضلالة“ کی تشریح میں بدعت کی دو قسمیں ذکر کی یعنی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ چنانچہ از شیخ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ منقول ست،

بدانکہ ہرچہ پیدا شدہ بعد از پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بدعت ست واز آنچہ موافق اصول وقواعد سنت اوست وقیاس کردہ شدہ است برآں بدعت حسنہ گویند وآنچہ مخالف آں باشد بدعت سیۂ خوانند وکلیت کل بدعۃ ضلالۃ محمول بریں ست ای بر بدعت سیۂ کمافی "الاشعۃ" ۔ اور ایک طرف حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اس پر تنقید کی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تقسیم کہاں تک درست ہے اور بدعت کو حسنہ (نیکی) کہنا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ہر بدعت ضلالۃ ہے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ "کل بدعۃ ضلالۃ" پس کوئی بدعت حسنہ نہیں ہو سکتی البتہ بعض شارحین حدیث اور اکابرین نے بدعت کی جو تقسیم کی ہے اس کے ساتھ حدیث بالا کا کوئی تعارض نہیں کیونکہ یہ تقسیم لغۃً ہے، چنانچہ "مجالس الابرار" میں ہے۔

قيل البدعة لها معنيان أحدهما: لغوى وهو عام المحدث مطلقًا والثانى: شرعى خاص اى الزيادة فى الدين أو النقصان منه بعد الصحابة بغير إذن من الشارع لاقولاً ولافعلاً ولاصريحًا ولااشارةً. (مجالس الأبرار: ۱۳۲)

یعنی بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعت لغوی، بدعت شرعی، بدعت لغوی وہ ہے جو وجود کے اعتبار سے نئی ہے لیکن دین کے لئے ضروری ہے، تو یہ بدعت محمودہ ہے مذمومہ نہیں ہے اور بدعت شرعی سے مراد "احداث فی الدین" ہے یعنی دین سماوی کے اجزاء میں دین کے نام سے کار ثواب سمجھ کر نئی نئی چیزوں کا اختراع کرنا، یہ ضلالہ اور مذموم اور مردود ہے، یہ حدیث شریف کے تحت داخل ہے۔

بدعت لغوی سے مراد "احداث للدین" ہے یعنی دین کی حفاظت کے لئے نئے نئے ایسے ذرائع کا پیدا کرنا جو خیر القرون کے زمانہ میں نہیں تھے (مگر وہ قرآن وحدیث اور اجماع وقیاس کے خلاف نہیں بلکہ موافق ہیں) تو یہ امور وجود اور ایجاد کے اعتبار سے نئے ہیں، اس لئے ان کو لغۃً بدعت کہا گیا ہے، جبکہ یہ نصوص شرعیہ کے موافق ہونے کے اعتبار سے بدعت شرعی میں داخل نہیں ہے کیونکہ یہ دین میں اضافہ نہیں ہے بلکہ دین کے لئے اضافہ ہوا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بدعت شرعی اور لغوی کے درمیان عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے یعنی بدعت شرعی خاص ہے اور بدعت لغوی عام ہے بناءً علیہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو جماعت کے ساتھ تراویح ادا کرنے کو ''اچھی بدعت'' فرمایا اس سے بھی ان کی مراد لغۃً بدعت ہے شرعاً نہیں۔

پس بعض شارحین نے بھی اسی اعتبار سے تقسیم کی ہے اور بدعت لغوی کو بدعت حسنہ سے تعبیر کیا ہے اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے جو کہا وہ بھی اپنی جگہ پر درست وصواب ہے یعنی بدعت شرعی کبھی حسنہ نہیں ہو سکتی۔

فلہٰذا کوئی تعارض نہیں یعنی بعض محدثین کی تقسیم کرنا درست ہے۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۴ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۴ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

* * *

کِتَابُ الْمَنَاقِبِ بَابُ مَنَاقِبِ الصَّحَابَةِ

صحابی وتابعی اور تبع تابعی کا تعارف

(۵۵) سوال:- صحابی وتابعی اور تبع تابعی کی تعریف کیا ہے؟ اور ہر ایک کا زمانہ کہاں سے کہاں تک ہیں؟ مہربانی فرما کر تفصیل سے بتا دیجئے۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

صحابی:- وہ شخص ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بحالت ایمان ملاقات کی ہو اور ایمان واسلام پر ان کا خاتمہ ہوا ہو، اس میں کئی درجات ہیں، سابقین اوّلین کی جماعت جو مکہ میں مسلمان ہوئے پھر وہ حضرات جو ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے، پھر وہ حضرات جو آخر میں مسلمان ہوئے، پھر ان میں افضل وہ ہیں جو زیادہ صحبت اٹھانے والے ہیں اور صحبت اٹھانے والوں میں سے بعض حضرات فقیہ ومجتہد تھے اور بعض حضرات ایسے نہیں تھے، لیکن سب کے سب عادل اور ثقہ تھے پھر وہ حضرات ہیں جنہوں نے کم صحبت اٹھائی ہے یا صرف ملاقات کی ہے، اس سے زیادہ تفصیل کتب تاریخ میں موجود ہے۔

تابعی:- وہ شخص ہے جس نے ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملاقات کی ہو اور اسلام وایما پر اس کا خاتمہ ہوا ہو جیسے حسن بصری، محمد بن سیرین، مجاہد، علقمہ، اسود، عطاء بن ابی رباح، شعبی، امام اعظم ابوحنیفہؒ وغیرہ، امام صاحب کی متعدد صحابہ کرامؓ سے ملاقات ہوئی۔

تبع تابعی:- وہ شخص ہے جس نے بحالت ایمان کسی تابعی سے ملاقات کی ہو اور ایمان واسلام ہی پر اس کا خاتمہ ہوا ہو جیسے لیث بن سعد، امام اوزاعی، امام مالکؒ وغیرہ، امام مالکؒ کو متعدد تابعین سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔

ہر ایک کا زمانہ: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا زمانہ سو سال تک رہا اور بعض کے نزدیک ۱۱۰ھ (سو دس) تک رہا، پھر تابعین کا دور آیا ہے اور یہ دور ۱۷۰ھ (ایک سو ستر) تک رہا، پھر تبع تابعین کا زمانہ آیا اور ان کا زمانہ ۲۶۰ھ (دو سو ساٹھ) تک رہا۔

کمافی "شرح النخبة". الصحابی کذلک وهو من لقی النّبی صلّی اللّٰه علیه

وسلم مؤمنًا به ومات على الإسلام ولو تخللت ردة في الأصح ...... التابعي وهو من لقي الصحابي كذلك.

فقط والله سبحانه وتعالىٰ أعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ	۲ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ

(۵۶) سوال :- اہل بیت سے کون مراد ہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اہل بیت آپ ﷺ کے گھر والوں کو کہا جاتا ہے مثلاً خصوصیت کے ساتھ آپ کی بیویاں، بچے، نواسے، نواسیاں، سب اہل بیت میں داخل ہیں اور عموماً لونڈی، غلام لے پالک بلکہ معتقدین اور ان کی اولاد بھی اہل بیت میں شامل ہیں۔

جیسے آپ ﷺ کی بیویاں (۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، (۲) حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا (۳) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا (۴) حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما (۵) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا (۶) حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا (۷) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا (۸) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا (۹) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (۱۰) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا (۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا وغیرہن ازواج مطہرات آپ کے صاحبزادے طیب، طاہر، قاسم، ابراہیم ہیں اور حضرت فاطمہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت ام کلثوم، حضرت رقیہؓ آپ کی صاحبزادیاں تھیں، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ داماد، حضرت حسنؓ حضرت حسینؓ، نواسے، حضرت امامہؓ، ام کلثوم نواسیاں زیدؓ متبنی اسامہؓ زید کا بیٹا اور ان کی اولاد سب اہل بیت اور عترت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہیں۔ (تذکیر الاخوان: ص ۱۶۶) فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۸ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۸ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ

حضرات ازواج مطہرات کی تعداد

(۵۷) سوال:- حضرات ازواج مطہرات کی تعداد اور ترتیب نکاح کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات گیارہ تھیں، جن میں سے دو نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں انتقال فرمایا، ایک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا دوسری حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا اور نو بیویاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حیات تھیں۔

اِن سب بیویوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: (۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، (۲) حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا (۳) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا (۴) حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا (۵) حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہما (۶) حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا (۷) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا (۸) حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا (۹) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا (۱۰) حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا (۱۱) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا (از سیرۃ مصطفیٰ)

ترتیب النکاح:- حضرت خدیجہ بنت خویلد سے شادی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ہجرت سے تین سال قبل وفات پائی، ان کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۵۰ سال تھی اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا سن وفات ۴۱ھ یا ۵۴ھ ہے، حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح مکہ میں ماہ شوال سنہ ۱۰ نبوی کو ہوا، اس وقت انکی عمر چھ سال کی تھیں پھر ہجرت کے بعد ماہ شوال ۱ھ میں جب آپ کی عمر نو سال کی ہوئی، تو مدینہ منورہ میں آپکی رخصتی ہوئی، سن وفات آپ کی ۵۵ھ یا ۵۸ھ ہے، حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے آپکا نکاح ۲ھ یا ۳ھ میں ہوا اور انکا سن وفات ۴۱ھ یا ۴۵ھ ہے، حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنھا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ۳ھ میں ہوا چند ہی ماہ کے بعد ۳ھ یا ۴ھ میں انکا انتقال ہو گیا، حضرت ام سلمہ بنت مخزومی رضی اللہ عنہا سے آپکا نکاح ۳ھ یا ۴ھ میں ہوا اور انکا سن وفات ۵۹ھ یا ۶۲ھ ہے، حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح ۵ھ میں ہوا اور انکا سن وفات ۲۰ھ یا ۲۱ھ

ہے، حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح ۶ھ میں ہوا اور ان کا سن وفات ۴۴ھ ہے، حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح ۷ھ میں ہوا اور ان کا سن وفات ۵۱ھ یا ۶۱ھ ہے، حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب کا نکاح ۷ھ میں ہوا اور انکا سن وفات ۵۰ھ یا ۵۲ھ ہے۔

كما هو مصرح فى كتب التواريخ والأحاديث.

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

عشرۂ مبشرہ کا تعارف اور ان کے اسماء گرامی

(۵۸) سوال:- عشرۂ مبشرہ کن کو کہتے ہیں اور ان کی فضیلت کیا ہے اور وہ حضرات کون کون ہیں؟ اور ان کے اسماء گرامی کیا ہیں؟

الجواب باسمہ تعالیٰ

عشرۂ مبشرہ ان صحابۂ کرام کو کہتے ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں جانے کی بشارت دی ہے، ان کی فضیلت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے:

عن بريدة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله تبارك تعالىٰ أمرني بحبِّ أربعة وأخبرني أنه يُحِبّهُم قيل يارسول الله سمّهم لنا قال عليّ منهم يقول ذالك ثلاثًا أبوذر والمقداد وسلمان أمرني بحبّهم وأخبرني أنه يحبّهم. (ترمذی).

ترجمہ: حضرت بریدۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تعالیٰ نے مجھے چار شخصوں سے محبت رکھنے کا حکم فرمایا اور مجھے خبر دی کہ وہ بھی ان سے محبت رکھتا ہے، پوچھا گیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے نام کیا ہیں؟ فرمایا ان میں علی رضی اللہ عنہ بھی ہیں تین دفعہ یہی جملہ فرمایا اور ابوذرؓ، مقدادؓ اور سلمانؓ اور ان سے محبت رکھنے کا مجھے حکم دیا اور خبر دی کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے۔

عشرۂ مبشرہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں

عن عبدالرحمن بن عوف أن البنی صلی اللّٰہ علیه وسلم قال أبو بكر فی الجنّة وعمر فی الجنّة وعثمان فی الجنّة، وعلّی فی الجنّة، وطلحة فی الجنّة والزبیر فی الجنّة وعبدالرحمن فی الجنّة وسعد بن أبی وقاص فی الجنّة وسعید بن زید فی الجنّة وأبو عبیدة بن الجراح فی الجنّة (رواه الترمذی ورواه ابن ماجة عن سعید بن زید، (مشکوۃ ج۲ ص۵۶۷)

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکرؓ جنت میں ہیں، عمرؓ جنت میں ہیں، عثمانؓ جنت میں ہیں، علی جنت میں ہیں، طلحہؓ جنت میں ہیں، عبدالرحمٰن بن عوفؓ جنت میں ہیں، سعد بن ابی وقاصؓ جنت میں ہیں، سعید بن زید جنت میں ہیں، ابوعبیدہ بن الجراحؓ جنت میں ہیں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

حضرت سعد بن معاذ کی موت سے عرش کا ہل جانا

(۵۹) سوال:- ایک عالم صاحب سے سنا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت سے اللہ تعالیٰ کا عرش ہل گیا تھا، یہ بات درست ہے یا نہیں، حدیث کی رو سے جواب مطلوب ہے؟

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

جی ہاں یہ بات درست ہے حدیث شریف سے منقول ہے:

عن جابر رضی اللّٰہ عنہ قال سمعت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول اهتزعرش الرحمن بموت سعدبن معاذ. (متفق علیه جامع المناقب مشکوۃ ج۲/ص۵۷۵)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ سعد بن معاذ کی موت سے رحمٰن کا عرش ہل گیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے شیطان کے سوا ساری مخلوق محبت کرتی ہے، ان کا ادب واحترام کرتی ہے اور جب تک وہ دنیا میں ہیں، ان کے لئے دعائیں کرتی رہتی ہیں اور جب وہ دنیا سے گزر جاتے ہیں، تو سب کو ان کا غم ہوتا ہے اور جہاں ان کی روحیں جا کر ٹھہرتی ہیں وہ جگہ اور وہاں کے فرشتے مسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ خدا کے نیک بندے ہمارے پاس آئے پس جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی روح عرش تک پہنچی تو عرش نے بھی مارے خوشی کے ان کے استقبال کے لئے ہلنا شروع کر دیا۔ واللہ اعلم۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۸؍رجب المرجب ۱۴۲۷ھ	۸؍رجب المرجب ۱۴۲۷ھ

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عادل ہیں

(۶۰) سوال:- تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عادل ہیں یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ انکے عادل ہونے پر اعتراض کرتے ہیں دلائل کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب وھو الموفّق للصّواب

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عادل، اور معیار حق ہیں، یہ نصوص قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ومنقول ہے، یہی عقیدہ رکھنا صحت ایمان کے لئے شرط وضروری ہے۔

(۱) چنانچہ محقق ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

واعتقاد أهل السّنة والجماعة تزكية جميع الصّحابة وجوبًا بإثبات العدالة لكل منه والكفّ عن الطعن فيهم والثناء عليهم كماأثنى الله سبحانه وتعالىٰ عليهم. (مسايرة: ص ۱۳۲)

(۲) علامہ سفارینیؒ فرماتے ہیں:

و الذی أجمع عليه أهل السنّة والجماعة أنه يجب على كل أحد تزكية

جميع الصّحابة بإثبات العدالة لهم والكفّ من الطعن فيهم والثناء عليهم فقد أثنى اللّٰه سبحانه عليهم فى عدة اٰيات من كتابه العزيز على أنه لولم يرد عن اللّٰه ولاعن رسوله فيهم شيئ لأوجبت الحال التى كانوا عليها من الهجرة والجهاد ونصرة الدين وبذل المُهج والأموال وقتل الأباء والأولاد والمناصحة فى الدين وقوة الإيمان واليقين القطع بتعديلهم والاعتقاد لنزاهتهم وأنهم أفضل جميع الأمة بعد نبيهم هذا مذهب كافة الأمة ومن عليه المعوّل من الأئمة. (عقيدة سفارنى ص: ۳۲۸)

لہٰذا جو لوگ جمیع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عادل اور معیار حق نہیں سمجھتے وہ لوگ گمراہ اور فاسق ہیں اور اہل سنت والجماعت کے راستہ سے ہٹے ہوئے ہیں، ان کی پیروی ناجائز و حرام ہیں۔ فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

تمام صحابۂ کرام جنتی ہیں ان پر جہنم کی آگ حرام ہے

(۶۰) سوال :- سوال تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جنت میں داخل ہوں گے یا نہیں یا ان میں سے بعض جہنم میں بھی جائیں گے؟ حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب وهوالموفّق للصّواب

تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جنت میں داخل ہوں گے، ان پر جہنم کی آگ حرام ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن جابر رضى اللّٰه عنه عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال لاتَمَسُّ النار مسلما رآنى أو رأى من رآنى، رواه الترمذى.

(مشکوۃ: باب مناقب الصحابةؓ: ج ۱ ص ۵۵۴)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس مسلمان کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھ کو دیکھا ہو یا اس شخص کو دیکھا ہو جس نے مجھ کو دیکھا۔

* علامہ سفاریؒ حافظ الحدیث ابن حزم اندلسیؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

قال ابن حزم الصحابة كلهم من الجنّة قطعًا قال اللّٰه تعالىٰ "لايستوى منكم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئک أعظم درجة من الذين أنفقوا من بعد وقاتلوا كلا وعد اللّٰه الحسنىٰ" وقال اللّٰه تعالىٰ: إن الذين سبقت لهم منا الحسنى أولئک عنها مبعدون: (ص ۳۸۹)

فقط واللّٰه تعالىٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۷رصفر المظفر ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۷رصفر المظفر ۱۴۲۷ھ

صحابہ کرامؓ کو بُرا کہنے والے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے

(۶۱) سوال:- صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُرا کہنے کے بارے میں بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے اور بعض کہتے ہیں ناجائز ہے، جناب عالی سے اس بارے میں حتمی رائے چاہتے ہیں کیونکہ بعض لوگ کہتے ہیں کے برائی کرنے والا خواہ صحابی ہو ان کو بُرا کہنا چاہئیے، جیسا کہ نیکی کرنے والے کو نیک کہا جاتا ہے، اس بارے میں آپ کی تحقیق درکار ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُرا کہنا حرام ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ارشاد ہے:

(۱) عن أبی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم لَاتَسُبُّوْا أصحابی فلو أن أحدكم أنفق مثل أُحد ذهبًا مابلغ مدأحدهم ولانصیفه، متفق علیه. (مشكوٰة: باب مناقب الصحابة: ج ۲ ص ۵۵۳)

ترجمہ: حضر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے صحابہ کو بُرا نہ کہو حقیقت یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد پہاڑ کے برابر سونا

اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو اس کا ثواب میرے صحابہ کے ایک مد یا آدھے مد کے ثواب کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

(۲) علی ابن حرب طائی اور خثیمہ ابن سلیمانؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے:

لاتَسَبُّوْا أصحاب محمّد فلمقام أحد هم ساعة خير من عمل أحد كم عمره.

ترجمہ: اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا نہ کہو، درحقیقت ان کو (اپنی عبادتوں کا) یہ مقام حاصل ہے کہ ان کے ساعت بھر کا نیک عمل تمہاری پوری عمر کے نیک عمل سے بہتر ہے۔

(۳) عقیلی نے ضعفاء میں نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إنَّ اللّٰه اختار لی أصحابًا وأنصارًا وأصحابًا وأصهارًا وسياتی قوم يسبّونهم ويستنقصو نهم فلا تجالسوهم ولا تشاربوهم. ولا تواكلوهم ولا تناكحوهم.

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب کیا اور میرے لئے میرے اصحاب میرے انصار اور میرے قرابتدار تجویز کئے اور (یاد رکھو) عنقریب کچھ لوگ پیدا ہوں گے جو میرے صحابہ کو بُرا کہیں گے اور ان میں نقص نکالیں گے پس تم نہ ان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنا اور نہ ان کے ساتھ کھانا پینا اور نہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کرنا۔

(۴) عن ابن عمر قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم إذا رأيتم الذين يسبّون أصحابی فقولوا لعنة اللّٰه على شركم رواه الترمذی.

(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابة: ج ۲ ص ۵۵۴)

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ کو بُرا کہتے ہیں تو تم کہو اللہ کی لعنت ہو تمہاری بُری حرکت پر۔

(۵) عن عبداللّٰه بن مغفل قال قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اللّٰه اللّٰه فی أصحابی لاتتخذوهم غرضًا من بعدی فمن أحبّهم فبحبّی أحبّهم و من أبغضهم فببُغضی أبغضهم ومن أذاهم فقد أذانی ومن أذانی فقد أذى اللّٰه فيوشک أن يأخذه رواه الترمذی قال هذاحديث غريب.

(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابة: ج ۲ ص ۵۵۴)

ترجمہ: ...... جس شخص نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے دشمنی رکھی اس نے درحقیقت مجھ سے دشمنی رکھی ہے اور جس شخص نے ان کو ایذا پہنچایا اس نے درحقیقت مجھ کو ایذا پہنچایا اور جس نے مجھ کو ایذا پہنچایا اس نے درحقیقت اللہ کو ایذا پہنچایا......۔

(٦) قاضی عیاضؒ نے شفاء میں لکھا ہے کہ حضرت مالک ابن انسؓ وغیرہ کا قول ہے:

من أبغض الصحابة وسبهم فليس له في فئ المسلمين حق.

ترجمہ: جس شخص نے صحابہؓ رضی اللہ عنہم سے بغض رکھا اور ان کو بُرا کہا ہے، اس کو مسلمانوں کے مال فئی میں کوئی حق نہیں۔

(۷) ملا علی قاریؒ مشکوٰۃ کی شرح ''مرقات'' میں لکھتے ہیں:

وفي شرح مسلم: اعلم أن سبّ الصَّحابة حرام من أكبر الفواحش، ومذهبنا ومذهب الجمهور أنه يعزرو، قال بعض المالكية: يقتل، وقال القاضي عياض: سبّ أحدهم من الكبائر انتهىٰ. وقد صرح بعض علمائنا بأنه يقتل من بسبّ الشيخين ففي كتاب "السير" من كتاب "الاشباه والنظائر" للزين بن نجيم: كل كافر تاب فتوبته مقبولة في الدنيا والآخرة إلا جماعة الكافر سبّ النّبي صلّى اللّٰه عليه وسلم وسبّ الشيخين أو أحد هما أو بالسحر أو بالذندقة ولو امرأة إذا أُخذ قبل توبته الخ." (باب مناقب الصحابة: ج١٠ ص٣٥٦)

ترجمہ: یعنی شرح مسلم میں لکھا ہے جاننا چاہئے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بُرا کہنا حرام ہے اور جمہور علماء کا عقیدہ و مذہب یہی ہے کہ جو کوئی صحابہؓ کو بُرا کہے اس کو سزا دی جائے اور بعض مالکیہ نے کہا ہے کہ اس کو قتل کیا جائے اسی طرح کی بات طیبیؒ نے بھی لکھی ہے اور قاضی عیاضؒ نے کہا ہے: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو بُرا کہنا گناہ کبیرہ ہے اور ہمارے بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ جو شخص شیخین یعنی ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کو بُرا کہے وہ مستوجب قتل ہے، قواعد فقہ کے اصول کی مشہور کتاب ''الأشباہ والنظائر'' کی کتاب ''السیر'' میں لکھا ہے کہ جو بھی کافر اپنے کفر سے توبہ کرلے اس کے لئے دنیا و آخرت کے لئے معافی ہے، لیکن جو لوگ اس بناء پر کافر قرار دیئے گئے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا کہا تھا یا شیخین کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کو بُرا کہا تھا یا سحر اور جادو کے کام کے مرتکب ہوئے اور زندقہ میں مبتلا ہوئے اور پھر توبہ کرنے سے پہلے انکو گرفتار کرلیا گیا ہے، تو اب اگر توبہ کریں تو ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور ان کو معافی نہیں ملے گی۔

(۸) محقق ''ابن ہمامؒ'' فرماتے ہیں:

”واعتقاد أهل السنّة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوبًا بإثبات العدالة لكل منهم والكفّ من الطعن فيهم والثناء عليهم كماأثنى اللّٰه سبحانه وتعالىٰ عليهم.“

(مسامر: ص ۱۲۳)

پس مذکورہ بالاحوالجات سے واضح ہوا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سب وشتم کرنا حرام و ناجائز ہے، بُرا کہنے والا گمراہ ہے اور اہل سنت والجماعت سے خارج ہے۔ فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۸ر صفر المظفر ۱۴۲۶ھ	یکم صفر المظفر ۱۴۲۶ھ

جنگ جمل اور صفین کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ

(۶۲) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہماری مسجد کے خطیب صاحب یونیورسیٹی کے شعبۂ تاریخ اسلامی کے پروفیسر ہیں کبھی کبھی جمعہ کی تقریر میں تاریخی بات چیت کرتے ہیں، جناب نے گذشتہ جمعہ میں جنگ جمل اور صفین کے واقعات بیان کئے ہیں اور تقریر کے آخر میں بات یہ کہی ہے کہ ”صحابۂ کرام کی اندھی تقلید کرنا ایک قسم کی غلطی ہے چونکہ یہ لوگ بھی انسان تھے ان کے اندر بھی بھلے، بُرے تھے، جیسے کہ جنگ جمل اور صفین کے واقعات میں سب حالات مذکور ہیں، لیکن بعض علماء ان واقعات کی فاسد تاویلیں کر کے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں پس ہماری رائے یہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام معیار حق نہیں ہیں یعنی جن صحابۂ کرام سے فسق وفجور ظاہر ہوا ہے، وہ لوگ قابل اقتداء نہیں ہیں جیسے امیر معاویہؓ وغیرہ“ اھ،

اب ہمیں ان کے بیان سے متعلق چند سوالات ہیں:

(۱) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عادل ہیں یا نہیں؟ ان کی شان میں بُری بات کرنا اور ان کو غیر عادل کہنا کیسا ہے؟

(۲) جنگ جمل اور صفین کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ کیا ہے؟ اور ان جنگوں میں لڑنے والے صحابۂ کرام کے بارے میں کیسا عقیدہ رکھنا چاہئے؟ اور ان جنگوں سے متعلق سلف صالحین کے اقوال کیا ہیں؟

(۳) ان جنگوں کے قاتلین اور مقتولین کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۴) تنقید اً جنگ جمل اور صفین کے واقعات بیان کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۵) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں غلط خیالات رکھنے والے علماء یا کسی آدمی کو امام یا خطیب بنانا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ عادل ہیں، جیسے دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عدول ہیں، فضل وکمال کے اعتبار سے خیار صحابہ میں سے ہیں، ان کے بارے میں کوئی بھی بُرا خیال رکھنا، یا ان کی شان میں کوئی بھی ایسی بات کہنا جو مرتبۂ صحابیت کے منافی ہو، اور انکی برائی بیان کرنا اس طرح حرام وناجائز ہے، جس طرح دوسرے صحابۂ کرام کے بارے میں۔

✻ چنانچہ قاضی عیاضؒ "مالکی شفاء" میں لکھتے ہیں:

> قال مالك من شتم أحدًا من أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم أبابكر أوعمر أوعثمان أومعاوية أوعمر وبن العاص رضی الله عنهم فإن قال: كانوا على ضلالٍ أو كفرٍ قُتِلَ وإن شَتَمَ بغيرهذامن مشاعة الناس نُكِّلَ نكالاً شديدًا، فلايكون مُحَارِبُوا عليٍ كَفَرَةً كمازعم الغُلاةُ من الرفضة ولافسقةً كمازعم البعض ونسبه شارح المواقف إلى كثير من أصحابه .

(نقل ازمکتوبات امام ربانی: دفتر اوّل، حصّہ چهارم، مکتوب: ۲۵۱، ص ۶۷ تا ص ۶۹، جلددوم)

جنگ جمل اور صفین کے متعلق اہل سنت والجماعت کا عقیدہ

جواب (۲):- رہی یہ بات کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان جو باہمی نزاع یا باہمی جنگ وجدال کی نوبت آئی، اس کو مشاجرۂ صحابہ کہا جاتا ہے، اس پر بحث وتمحیص کرنا اور اس سے کوئی نتیجہ نکال کر کسی کی تنقیص کرنا ہمارا مقام نہیں ہے، وہ سارے معاملات ان کے اپنے اجتہادات سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی صحابی ایسا نہیں تھا، جس نے ان معاملات میں نفسانی تقاضے یا دنیاوی اغراض کے تحت شرکت کی ہو، وہ سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اپنے موقف کو درست اور جائز ہونے کا اعتقاد اور اپنی باہمی لڑائیوں اور تنازعات کی تاویل کرتے تھے اور دونوں طرف سے اہل علم وفضل اور مفتیان کرام صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے، ارباب اجتہاد ان کے ساتھ ہوتے تھے اور چونکہ ان صحابہ کو مجتہدانہ مقام ومرتبہ حاصل تھا اور مسائل میں ایک دوسرے سے اختلافِ رائے رکھنے کا حق رکھتے، اس

لئے ان کے تنازعات کی بنا پر ان میں سے کوئی صحابی بھی مرتبۂ عدل کے زمرہ سے خارج نہیں ہوا اور نہ ان کی حیثیت اور ان کے مرتبہ میں کوئی نقص آیا کیونکہ سب نے جو کچھ کیا۔ للّٰہ فی اللّٰہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک اور عقیدہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں زبان درازی نہ کیجائے، ان کے حق میں منہ سے وہی بات نکالی جائے جو انکی تعریف اور بھلائی کی ہو، اگر ان میں سے کسی سے کوئی ایسی چیز منقول ہو جو بظاہر تعریف کے خلاف نظر آتی ہو، تو اس سے صرف نظر کیا جائے، لیکن کچھ کہا نہیں جائے، دین وایمان کی سلامتی اسی میں ہے، جو لوگ ان کی تنقید میں لگیں گے وہ گمراہی میں پڑیں گے خطاکار رہوں گے، سیاہ کار رہوں گے، اہل سنت والجماعت سے خارج ہو جائیں گے۔

سلف صالحین اور ائمہ دین کے اقوال ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) امام قرطبیؒ ”إِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ الخ“ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

العاشر: لایجوز أن يُنسَبَ إلى أحدٍ من الصّحابة رضی اللّٰه عنهم خطاءٌ مَقْطُوْعٌ به إذ كانوا كلهم اجتهدوا فيما فعلوه وأرادوا اللّٰه عزوجل وهم كلهم لنا أَئِمَّةٌ وقد تَعَبَّدْنَا بالكفّ عما شَجَرَ بينهم، ولَانَذْكُرُهُمْ إلا بِأَحْسَنِ الذِّكْرِ لحرمة الصّحبةِ و لِنَهْيِ النّبی صلّی اللّٰه عليه وسلم عن سَبِّهم، وأن اللّٰه غَفَرَلَهُمْ وأخبر بالرضاء عنهم، هذا مع ماقدورد من الأخبار من طرقٍ مختلفةٍ لهم عن النبی صلی اللّٰه عليه وسلم، أن طلحة شهيد يمشی علی وجه الأرض، فلو كان ماخرج إليه من الحرب عصيانًا لم يكن القتل فيه شهيدًا، وكذلک لو كان ماخرج إليه خطاءً فی التأويل وتقصيرًا فی الواجب عليه لأن الشهادة لاتكون إلابقتل فی طاعةٍ، فوجب حَمْلُ اَمْرِهِمْ مابَيَّنّاه، ومما يدل علی ذلک ماقدصح وانتشر من اخبار عليٍّ بأن قاتل الزبير فی النار وقوله: سمعت رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم يقول بشّر قَاتِلَ ابن صَفيّة بالنّار.

وإذا كان كذلک فقد ثبت أن طلحة و الزبير غيرُ عاصِيَيْنِ ولَاآثِمَيْنِ بالقتل، لأن ذلک لوكان كذلک لم يقل النبیُّ صلی اللّٰه وسلم فی طلحة: شهيدولم يُخْبِرِ اَنّ قَاتِلَ الزبير فی النار، وكذالک مَنْ قَعَدَ غيرُ مُخْطِيءٍ فی التّأويل بل صَوَابٌ أراهم اللّٰه بالإجتهاد، وإذاكان كذلک لم يوجب ذلک لعنهم

والبرائة منهم وتفسيقهم وإبطالَ فضائلِهم ، وجهادِهم عظيمِ غنائهم فى الدين رضى اللّٰه عنهم وقد سُئِل بعضهم من الدِّماء التى أُريقتْ فيما بينهم فقال "تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْخَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَاتُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ".

وسُئِلَ بعضهم عنهاأيضا فقال:تلك دماءٌ قد طَهَّرَاللّٰهُ مِنْهَا يَدَىَّ فَلَا اَخْضِبُ بها لسانى يعنى فى التّحرّز من الوقوع فى خطاء والحكمِ على بعضهم بمالايكون مصيبًا فيه قال ابن فورك: ومن أصحابنا من قال: إِنَّ سَبِيْلَ مَاجَرَتْ بَيْنَ الصَّحَابَةِ مِنَ الْمُنَازَعَاتِ كسبيلِ ماجَرٰى بين إخوةِ يوسفَ مع يوسفَ ثم إنهم لم يَخْرُجُوْا بذلك عن حدِّ الوِلَايَةِ وَالنُّبُوَّةِ فكذٰلك الأمرُفيما جرٰى بين الصّحابةِ.

وقال المحاسبى: فأما الدماء فقدأشْكَلَ علينا القولُ فيها فيهاباختلافهم.

وقد سئل الحسن البصرى عن قتالهم فقال: شَهِدَهٗ أصحابُ محمّدٍ صلى اللّٰه عليه وسلم وغِبْنَا وَعَلِمُوْا وَجَهِلْنَا وَاجْتَمَعُوْا فاتبعنا واختلفوافوقفنا. قال المحاسبىّ: فنحن نقول كماقال الحسن ونعلم إن المقوم كانوا أعلم بمادخلوافيه منا ونتبع مااجتمعوا عليه ونقف عند مااختلفوا فيه، ولانبتدع رأيًا منا نعلم أنهم اجتهدوا، وارادوااللّٰه عزوجل إذكانوا غير مُتَّهِمِيْنَ فى الدين ونسئال اللّٰه التوفيق. (تفسير قرطبى)

(۲) حضرت علامہ سید جرجانیؒ شرح المواقف میں لکھتے ہیں:

"وأما الفتنُ والحروبُ الواقعةُ بين الصّحابة فالشامية أنكروا وقوعها، ولاشك أنه مكابرة للتواتر فى قتل عثمان وواقعة الجمل والصفين والمعترِفون بوقوعها منهم من سكت عن الكلام فيها بتخطيةٍ أو تصويبٍ، وهم طائفة من أهل السنة فإن أرادواأنه اشتغالٌ بمالايعنى فلابأس به إذ قال الشافعى وغيره من السلف تِلْكَ دِمَاءٌ طَهَّرَ اللّٰهُ عَنْهَا أَيْدِيَنَا فَلْنُطَهِّرْ عَنْهَا اَلْسِنَتَنَا."

(شرح المواقف: ج ۸ ص ۳۷۴ طبع مصر)

(۳) محقق ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ "مسایرہ" میں فرماتے ہیں:

"وماجرى بين معاوية وعلىّ مَن الحروب كان مبنيًا على الاجتهاد."

جواب (۳): ۔ ان جنگوں کے مقتولین شہداء ہیں اور قاتلین مغفورین ہیں، کسی جانب سے غلطی ہونے سے وہ شہداء کے زمرہ سے خارج نہیں ہوئے ہیں۔ چنانچہ:

(۱) جنگ جمل اور صفین کی وجہ وعلت کے متعلق علامہ سفارینیؒ فرماتے ہیں:

"وسبب تلک الحروب اشتباه القضايا فلشدة اشتباهها اختلف اجتهادُهم وصاروا ثلاثةَ أقسامٍ قِسْمٌ أظهر لهم اجتهادُهم أن الحق فى هذا الطرف وإن مخالفه باغٍ فوجب عليه نصرة المُحِقِ وقتالُ الباغى عليه فيما اعتقدوه ففعلوا ذلک ولم يكن لمن هذا صفتُهُ، التاخُّرُ عن مساعدة الإمام العادل فى قتال البُغاة فى اعتقادهم، وقِسْمٌ عكسُهُ سواءً بسواءٍ وقِسْمٌ ثالثٌ اشتبهت عليهم القَضِيَّةُ ، فلم يظهر لهم ترجيحُ أحدِ الطرفين فاعتزلوا الفريقين وكان هذا الاعتزالُ هو الواجب فى حقهم لأنه لايحل الإقدام على قتالِ مسلمٍ حتى يظهرَ مايُوجِبُ ذالک وبالجملة فكلهم مَعْذُوْرُوْنَ وَمَاجُوْرُوْنَ لَامَازُوْرُوْنَ ولهذا اتفق أهلُ الحق مَنْ يُعْتَدُّبه فى الإجماع على قبول شهادتِهم ورواياتِهم وثبوتِ عدالتِهم." (عقيدة سفارنى: ج۲ص۳۸٦)

(۲) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قال فى" شرح العقيد ة الواسطية" ويتبرؤون من طريقة الروافض الذين يبغضون الصّحابة ويسبُّونهم، وطريقة النواصب الذين يُؤْذُوْنَ أهلَ البيت بقول لاعملٍ، ويمسكون عماشجر بين الصّحابة ويقولون: إن هذه الأثارَ المروية فى مَساوِيهم منها ماهو كذب، ومنها مَاقَدزِيْدَفيه ونقص وغيروجهه والصّحيح منه، هم فيه معذورون اما مجتهِدون مصيبون، واما مجتهدون مخطئون، وهم مع ذلک لايعتقدون أن كل واحد من الصّحابة معصوم من كبائر الإثم وصغائره بل يجوز عليهم الذنوب فى الجملة ولهم من الفضائل والسَوابق مايوجب مغفرة مايصدر منهم إن صدر حتى أنهم يغفرلهم من السيأت مالايغفرلمن بعد هم."

(۳) امام قرطبی رحمہ اللہ "وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"وَأَنَّ اللّٰهَ غَفَرَلَهُمْ وَأَخْبَرَبِالرِّضَاءِ عَنْهُمْ."

ان جنگوں کے قاتلین اور مقتولین دونوں طائفہ کو اپنے اپنے اجتہاد کا اجر ملے گا۔

✸ چنانچہ علامہ سفارنیؒ "الدر المضیئة" اور اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

"فإنـه أى التـخـاصُـم والـنِّـزاعُ والتـقـاتُلُ والدِّفاعُ الذى جرى بينهم كان عن اجتهـادٍ قدصدرمن كل واحد من رؤوس الفريقين ومَقْصدٌسائغٌ لكل فرقةٍ من الطائفتين وإن كان المصيبُ في ذلك للصواب، واحدهما وهوعليّ رضوان اللّٰه عليه وَمَنْ وَالَاهُ والمُخطئُ هو مَنْ نَازَعَهُ وَعَادَاهُ غَيْرَ أن للمخطئ في الاجتهاد اجرًا ثوابًا خلافا لأهل الجَفَاءِ وَالْعِنَادِ فكلّ ماصح مماجرى بين الصحابة الكرام وجب حمله على وجه ينفي عنهم الذنوبُ والأثامُ فمُقَاوَلَةُ عليٍّ مع عباس رضى اللّٰه عنهما لاتُفضى إلى شَيْنٍ وتَقَاعُدُ عليٍّ عن مُبايعة الصديق رضى اللّٰه عنهمافى بداء الأمر كان لأحدأمرين إمالعدم مَشْوَرَتِهِ كماعتب عليه بذلك وإمّا وقوفامع خاطرِ سيدةِ نساءِ العالَمِ فاطمةَ البَتُولِ مما ظنت أنه لها وليس الأمر كماهنالك ثم إن عليًّابَايَعَ الصّديقَ رضى اللّٰه عنهما على رؤوس الاشهاد فاتحدت الكلمةُ ولله الحمد وحصل المرادوتوقف عليّ عن الاقتصاص من قتلة عثمان إما لعدم العلم بالقتل وإمّا خشيةَ تَزَايدِ الفسادِ والطغيانِ وكانت عائشةُ وطلحة والزبيرُ ومعاويةُ رضى اللّٰه عنهم وَمَنْ تَبِعَهُمْ مابين مجتهدٍ ومقلّدٍ في جواز مُحَارَبَةِ أميرِ المؤمنين سيدنا أبى الحسين الأَنْزَعِ الْبَطِيْنِ رضوان اللّٰه تعالىٰ عليه وقد اتفق أهلُ الحقِّ إن المصيبَ فى ذلك الحروب والتنازع أميرُ المؤمنين عليّ من غير شك ولاتدافُعَ والحق الذى ليس عنه نزولٌ أنهم كُلهم رضوان الله عليهم عدولٌ لأنهم مُتَأوِّلُوْنَ فى تلك المُخَاصَمَاتِ مجتهِدون فى هاتيك المُقَاتَلاتِ فإنّه وإن كان الحق على المعتمد عندأهل الحق واحدٌ فالمخطِئُ مع بدلِ الوُسْعِ وعدمِ التقصيرِ مَاجُوْرٌ لَامَأزُوْرٌ" (شرح عقائد سفارنی: ج ٢ ص ٣٨٦)

جواب (۴): -تنقید کی نگاہ سے جنگ جمل اور صفین کے واقعات کا بیان کرنا ناجائز و حرام ہے۔ چنانچہ:

(۱) امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ’’تفسیر قرطبی‘‘ میں لکھتے ہیں:

”لایجوز أن ینسب إلی أحد من الصحابة خطاء مقطوع به إذ کانوا کلهم اجتهدوا فیما فعلوه وأرادوا اللّٰه عزوجل وهم کلهم لنا أیمة وقد تعبدنا بالکف عما شجر ولا نذکرهم إلا بإحسن الذکر لحرمة الصحبة ولنهی النبی صلی اللّٰه علیه وسلم عن سبّهم.“ (تحت قوله تعالی” وإن طائفتان من المؤمنین“).

(۲) ابن حمدان ’’نهایة المبتدئین‘‘ میں لکھتے ہیں:

”یُوجِبُوْنَ حُبَّ کُلِّ الصحابةِ والکفِّ عما جری بینهم کتابةً وقِرَاءَ ةً وَإقْرَاءَ ةً وسماعًا وتسمیعًا ویجب ذکرُ مَحَاسِنِهِمْ والتَّرَاضِیْ عَنْهُم وَالْمُحَبَّةَ لهم.“ وترکُ التَّحَامُلِ علیهم والاعتقادُ العذرِلهم وإنهم إنما فعلوا مافعلوا باجتهادٍ سائغٍ لایُوْجِبُ کفرًا ولافسقًابل وربما یُثَابُوْنَ علیه لانه اجتهادٌ ثم قتالٌ وقیل: والمصیبُ علیٌّ ومَنْ قَاتَلَهٗ فخطائه مَعْفُوٌّ عنه إنما نهی عن الخَوْضِ فی النظم (أی فی نظم العقیدة من الخوض فی مُشَاجَرَاتِ الصّحابة)لأن الإمام أحمد کان یُنْکِرُ علی مَنْ خَاضَ ویُسَلِّمُ أحادیثَ الفضائلِ وقد تَبَرَّأَ ممن ضَلَّلَهُمْ أَوْکَفَّرَ هُمْ وَقَالَ: السُّکُوْتُ عَمَّا جَرٰی بَیْنَهُمْ.“ (شرح عقائدسفارنی: ج۲ص۳۸۶)

مذکورہ بالا عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عدول تھے اور جادۂ حق وسنت پر تھے اور آنے والی امت کے لئے قیامت تک معیارِ حق اور مقتدیٰ ہیں، کوئی صحابی غیر عادل نہیں ہے اور ان کے درمیان باہمی جو نزاع اور جنگ واقع ہوئیں ہیں، ان کو اجتہادی غلطی پر محمول کرنا چاہیے، نفسانیت، شیطانیت نہیں کہہ سکتے اور جمہور علماء محققین کا اس پر اجماع واتفاق ہے کہ اجتہادی مسائل میں مجتہد اگر حق پر رہتا ہے تو دہرا اجر ملتا ہے، ورنہ پھر بھی ایک اجر ملتا ہے، احادیث میں اس کے نظائر بے شمار ملتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عن عبداللّٰه بن عمر وأبی هریرة رضی اللّٰه عنهما قالا: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: إذاحکم الحاکم فاجتهدو أصاب فله أجر ان وإذاحکم فاجتهد أخطأ فله أجرواحدٌ متفق علیه.“ (مشکوٰة: باب العمل فی القضاء والخوف منه: ج۲ص۳۴۲)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو اور ابوھریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا: جب کوئی حاکم حکم وفیصلہ دینے کا ارادہ کرے اور اجتہاد کرے (یعنی قرآن وحدیث کی روشنی میں غور وفکر کے ذریعہ حکم وفیصلہ دے) اور پھر اس کا وہ حکم وفیصلہ صحیح یعنی کتاب وسنت کے موافق ہو، تو حاکم کو اس کا دہرا اجر ملے گا (ایک اجر تو اجتہاد کرنے کا اور دوسرا اجر، صحیح فیصلہ پر پہنچنے کا، اور اگر اس نے کوئی ایسا حکم وفیصلہ دیا جس میں اس نے اجتہاد کیا، لیکن (نتیجہ اخذ کرنے میں) چوک گیا (یعنی صحیح حکم تک پہنچنے میں غلطی واقع ہوگئی) تو اس کو ایک اجر ملے گا کیونکہ اس نے صحیح فیصلہ کے لئے کوشش کی اور اجتہاد کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ جمل وصفین میں لڑنے والے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین عدول ہیں، اپنے اپنے اصول پر کام کر رہے تھے جو صحابۂ کرام ان جنگوں میں مقتول ہوئے ہیں وہ شہداء کے زمرہ میں داخل ہیں اور قاتلین حضرات مغفورین کے زمرہ میں داخل ہیں، یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، یہی مسلک ومذہب برحق ہے، اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والا ضال ومضل اور گمراہ ہے، ایسے لوگ اہل حق کی جماعت سے خارج ہیں، صحابۂ کرام کی جماعت اور ان کے متبعین کی جماعت پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہیں اور جو ان سے ہٹے ہوئے ہیں، ان پر اللہ کی رحمت کی بجائے اللہ تعالیٰ کی لعنتیں ہیں۔

پس جنگ جمل اور صفین وغیرہ کے واقعات صحابہ کرام پر تنقید کی نگاہ سے بیان کرنا حرام وناجائز ہے، صحابۂ کرام کو بُرا کہنے والے اور ان پر تنقید کرنے والے لوگ راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں، فاسق وفاجر ہیں یہ لوگ ہرگز لائق اقتداء یا لائق اتباع نہیں ہیں۔

جواب (۵): -صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں غلط خیالات رکھنے والے عالم یا کسی بھی شخص کو مساجد میں امام، خطیب، مؤذن مقرر کرنا جائز نہیں، ان کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں کمیٹی اور نمازی لوگوں پر واجب ہے کہ مذکورہ خطیب کو سبکدوش کر کے ایک دیندار متقی ومتبع سنت عالم دین کو خطیب مقرر کریں، ورنہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے جوابدہی کرنی ہوگی، کون ہوگا کہ ان کے سوال کا جواب دے سکے گا؟ بلکہ جس سے سوال ہوگا وہ ذلیل وخوار ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو قیامت کے روز ذلت وخواری سے بچاوے۔

نسئل اللّٰہ تعالیٰ أن یھدینا إلی الصراط المستقیم وجنبنا عن زلالت القلم

واللّسان فی حق الصحابة أجمعین رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنه وھو الموفق للحق والصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۱۷؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

حضرات شیخین کی خلافت کا منکر کافر ہے۔

(۶۳) **سوال:۔** بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت کا منکر کافر ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا منکر کافر نہیں، یہ بات درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب۔

(۱) ابن عساکرؒ روایت کرتے ہیں:

"أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال حُبّ أبی بکر وعمر إیمانٌ وبغضھما کفر."

ترجمہ: رسول اللہ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر وعمر سے محبت رکھنا ایمان ہے اور ان دونوں سے بغض وعناد رکھنا کفر ہے۔

(۲) ملا علی قاریؒ، ابن نجیم حنفیؒ سے نقل فرماتے ہیں:

"قال فی "المرقاة" وقال: سبُّ الشیخین ولعنھما کفر وإن فضّل علیّا علیھما فمبتدعٌ کذا فی الخلاصة وفی مناقب الکردری: یکفر إذا نکر خلافتھما أو أبغضھما لمحبة النّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم لھما."

(کتاب المناقب: باب مناقب الصحابة: ۳۵۶/۲)

ترجمہ: شیخین کو بُرا کہنا یا ان پر لعنت کرنا کفر ہے اور جو شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شیخین پر فضیلت دے، وہ مبتدع ہے اور "مناقب کردری" میں لکھا ہے: اگر کوئی شخص شیخین پر حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہے اور شیخین کی خلافت کا منکر بھی ہو تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، اسی

طرح اگر وہ دونوں حضرات سے دل میں بغض وعناد رکھے تو بھی اس کو کافر کہا جائیگا، بایں سبب اس نے ایسی ہستیوں سے قلبی بغض وعناد رکھا ہے جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قلبی محبت تھی۔

(۳) ”خلاصۃ الفتاویٰ“ میں ہے:

من أنكر خلافة الصديق فهو كافر. (كتاب الفاظ الكفر: ج۴ص ۳۸۱)

شیخین کی تخصیص کی وجہ

✸ ملا علی قاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

قال فى ”المرقاة“ : ولعل وجه تخصيصهما لما ورد فى فضيلتهما من قوله صلى الله عليه وسلم فى حقهما خاصةً على ما سيأتى فى باب على حدة لهما أو للإجماع على احقيتهما خلافًا للخوارج فى حق عثمان رضى الله عنه وعلى رضى الله عنه ومعاوية رضى الله عنه وأمثالهم والله أعلم.

(كتاب المناقب: باب مناقب الصحابة: ۱۰/۳۵۶)

ترجمہ: ان دونوں کی فضیلت میں رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی احادیث جس مخصوص طور سے منقول ہیں، اس طرح سے کسی اور صحابی کے بارے میں منقول نہیں ہے، جیسا کہ محدثین کرام نے ان کے متعلق الگ الگ مناقب کا باب قائم کیا ہے، یا وجہِ تخصیص یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی خلافت پر مسلمانوں کا مکمل اجماع تھا، ان کی قیادت وسربراہی کو کسی طرف سے بھی چیلنج نہیں کیا گیا، اس کے برخلاف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر شیخین کی طرح اجماع واتفاق نہیں ہوا اور معاویہ رضی اللہ عنہ کی امارت پر اس درجہ کا اتفاق نہیں تھا، بلکہ ان میں سے ہر ایک کے زمانے میں ان کے بارے میں اختلاف ظاہر ہوا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالی اعلم.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵ رمضان ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۵ رمضان ۱۴۲۶ھ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شیخین کے برابر محبت کرنا

(۶۴) سوال: -حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے برابر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ہاں اگر یہ صورت ہو کہ کوئی شخص نہ تو شیخین پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا قائل ہے، نہ شیخین کی خلافت کا منکر ہے، نہ ان دونوں حضرات سے بغض وعناد رکھتا ہے اور نہ ان میں سے کسی کو بُرا کہتا ہے، مگر شیخین کے بہ نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کہیں زیادہ پسندیدگی وگرید ویدگی اور محبت رکھتا ہے تو محض اس بناء پر ماخوذ نہیں ہوگا۔

قال فی "المرقاة شرح المشکوٰة": وإذا أحب عليًّا أكثر منهما لا يؤخذبه.

(ج۱۰ ص۳۵۶)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۸ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۱۸ رصفر المظفر ۱۴۲۶ھ

صحابۂ کرام کو سبّ وشتم کرنے والے آدمی کی گواہی شرعًا مقبول نہیں

(۶۵) سوال: -صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سبّ وشتم کرنے والے لوگوں کی گواہی دینی یا دنیوی معاملات میں معتبر ہے یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو امام بنانا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں ایسا آدمی فاسق اور گمراہ ہے، کیونکہ قرآن واحادیث میں صحابۂ کرام کے بارے میں بے شمار فضیلتیں آئی ہیں، گویا کہ وہ ان کا منکر ہے، ایسا آدمی بڑا فاسق ہے، اس پر توبہ واستغفار لازم ہے، چنانچہ امام مسلم کے استاد حضرت ابوذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”إذا رأيت الرجل ينتقص أحدًا من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديقٌ وذلك أن القراٰنَ حقٌّ والرسولَ حقٌّ وماجاء به حقٌّ وماأدّىٰ إلينا ذلك كلَّهُ إلا الصّحابةُ فمَنْ جَرَحَهُمْ إنما أراد إبطالَ الكتابِ والسُّنّةِ فيكون الجرحُ به أليق والحكمُ عليه بالزندقةِ والضلالِ أقومَ وأحقَّ.“

(لوامع الانوار البهية شرح الدرة المضيئة)

پس ایسے فاسق کی گواہی شرعاً قابل قبول نہیں ہے، ویسا ہی ان کو امام مقرر کرنا بھی جائز نہیں، اگر کسی مسجد میں مقرر ہو چکا ہے، تو کمیٹی پر واجب ہے کہ ان کو فارغ کر دیں اور متقی عالم دین کی تقرری کریں، واضح رہے کہ ایسے عقیدے والے لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

فقط والله سبحانه وتعالىٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۷؍محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

صحابۂ کرام کو سبّ وشتم کرنے والے کی عبادت دربار الٰہی میں قبول نہیں ہوگی۔

(۶۶) سوال: ایک قومی عالم صاحب نے کہا کہ جو لوگ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سبّ وشتم کرتے ہیں اور ان کو بہت سے معاملات میں طعن کرتے ہیں، ان کی فرض ونفل کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی، بلکہ ان کے ایمان کا خطرہ ہے، اب سوال یہ کہ ان عالم صاحب کی باتیں کہاں تک درست ہیں؟ امید ہے کہ شرعی دلائل سے مسئلہ کی وضاحت فرمائیں گے۔

الجواب وهو الموفق للصّواب

جناب عالم صاحب کی باتیں درست ہیں اور حدیث سے ثابت ومنقول ہیں، چنانچہ:

(۱) عن عويمر ابن ساعدة رضى الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسم: إن اللّٰه اختارنى واختارلى أصحابًا فجعل لى منهم وزراء وأنصارًا

وأصهاراً فمن سَبَّهُمْ فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين ولايقبل الله منه صرفًا ولاعدلاً. (محاملی طبرانی، حاکم، تفسیر قرطبی، سورۃ الفاتحۃ)

ترجمہ: عویمر ابن ساعدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب فرمایا اور میرے لئے رفقاء اور ساتھی بھی منتخب فرمائے اور پھر ان رفقاء میں سے کچھ کو میرا وزیر، کچھ کو میرا مددگار اور کچھ کو میرا رشتہ دار بنایا، پس جس شخص نے ان کو بُرا کہا، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور فرشتوں کی لعنت اور تمام لوگوں کی لعنت، جب تک توبہ نہ کرے تب تک اللہ تعالیٰ نہ اس کی نفل قبول کرے گا نہ فرض۔

(۲) **عن علی عن النبی صلّی الله علیه وسلم قال: سيأتی من بعدی قوم يقال لهم الرفضة فإن أدركتهم فاقتلهم فإنهم مشركون قال قلت يارسول الله! ماالعلامة فيهم قال يخرطونک بماليس فيک ويطعنون على السلف.“**

(دارقطنی)

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب میرے بعد ایک گروہ پیدا ہوگا، جن کو رافضی کہا جائیگا، پس اگر تم ان کو پاؤ تو ان کو قتل کرنا، کیونکہ وہ مشرک ہوں گے حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! ان کی پہچان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”وہ لوگ تمہیں ان چیزوں کے ذریعہ نہایت اونچا دکھائیں گے جو تم میں نہیں ہونگے اور صحابہ پر طعن کریں گے۔

(۳) ”دارقطنی“ کی ایک اور روایت کے الفاظ یہ ہیں:

”وذلک يَسُبُّوْنَ أبابکر وعمر ومن سَبَّ أصحابی فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين.“

ترجمہ: اور ان لوگوں کو مشرک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو بُرا کہیں گے اور جس شخص نے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بُرا کہا اس پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں کی لعنت اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔

(۴) قاضی عیاضؒ ”شفاء“ میں لکھتے ہیں: کہ حضرت مالک بن انس وغیرہ کا قول ہے:

”مَنْ أبغض الصّحابة وسَبَّهم فليس له فی فئ المسلمين حقٌّ.“

ترجمہ: جس شخص نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھے اور ان کو بُرا کہے اس کو مسلمانوں کے مال فیٔ میں کوئی حق نہیں۔

(۵) انہیں کا یہ قول بھی ہے:

”من غاظه أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم فهو كافر قال الله تعالىٰ: ليغيظ بهم الكفّار.“

ترجمہ: جس شخص نے اصحاب محمد کے سے بغض وغصّہ رکھا وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ”لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ“ (ان سے کافروں کا غصّہ دلائے) کے بموجب کافر ہے۔

پس صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو سبّ وشتم کرنے والے اور ان سے بغض اور عداوت رکھنے والے گمراہ ہیں، راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

كتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۷ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ	۱۷ محرم الحرام ۱۴۲۶ھ

”لَاتَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ“ کے خطاب میں تمام صحابہ داخل ہیں

۶۷) سوال:۔ جناب مفتی صاحب! جماعت اسلامی کے لوگوں میں سے ایک صاحب نے کہا ”لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ“ سے چند مخصوص صحابۂ کرام مراد ہیں، تمام صحابۂ کرام اس ”نہی“ کے تحت داخل نہیں جیسا کہ مرقات اور بعض کتابوں میں اس کی تصریح ہے۔

فلہٰذا جن صحابۂ کرام سے فسق وفجور اور معصیت صادر ہوئی ان پر تنقیدی نظر ڈالنا گناہ نہیں، جیسا کہ مولانا مودودی صاحب نے جگہ جگہ بعض صحابہ پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کی غلطی سے مسلمانوں کو آگاہ کیا ہے تاکہ لوگ اس سے بچیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان صاحب کی بات کہاں تک درست ہے؟ اور انہوں نے بعض کتابوں کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ کس حد تک معتبر ہیں؟۔

الجواب وھوالموفّق للصّواب

اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کے ایمان اور اعمال کا امتحان لیا اور نتائج بھی بیان فرمادیئے ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

"أولئک الذین امتحن اللّٰہ قلوبھم للتقویٰ لھم مغفرۃ و أجر عظیم. (حجرات:۳)

ترجمہ: یہ لوگ وہ ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے خاص کردیا ہے، جن لوگوں کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ (بیان القرآن)

- پھر صحابۂ کرام کے بارے میں امتحان میں کامیاب ہونے کا ارشاد ہوا، چنانچہ:

"اولئک ھم المفلحون" (یہی لوگ فلاح یاب ہیں) اور ارشاد ہے:"اولئک ھم الصادقون"(اور یہی لوگ صادقین ہیں اور سچے ہیں)

- بعد کے لوگ ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"لایستوی منکم من أنفق من قبل الفتح و قاتل أولئک أعظم درجۃ من الذین أنفقوا من بعد و قاتلوا و کلاوعد اللّٰہ الحسنی و اللّٰہ بما تعملون خبیر"

(حدید ص ۱۰)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے (فی سبیل اللہ) خرچ کرچکے اور لڑ چکے وہ اور لوگوں کے برابر نہیں ہیں، وہ لوگ درجہ میں ان لوگوں سے بڑے ہوئے ہیں، جنہوں نے (فتح مکہ کے) بعد میں خرچ کیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے بھلائی (یعنی ثواب) کا وعدہ سب سے کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے۔

یعنی یوں تو اللہ کے راستہ میں کسی وقت بھی خرچ کیا جائے اور جہاد کیا جائے وہ اچھا ہے، خدا اس کا بہترین بدلہ آخرت میں دیگا، لیکن جن مقدور والوں نے "فتح مکہ" یا "حدیبیہ" سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا، وہ بڑے درجے لے اڑے، بعد والے مسلمان ان کو نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ وہ وقت تھا کہ حق کے ماننے والے اور اس پر لڑنے والے اقل قلیل تھے، اور دنیا کافروں اور باطل پرستوں سے بھری ہوئی تھی، اس وقت اسلام کو جانی اور مالی قربانیوں کی ضرورت زیادہ تھی اور مجاہدین کو بظاہر اسباب اموال وغنائم وغیرہ کی توقعات بہت کم، ایسے حالات میں ایمان لانا اور خدا کے راستہ میں جان و مال لٹا دینا بڑے اولوالعزم اور پہاڑ سے زیادہ ثابت قدم انسانوں کا کام ہے، فرضی اللّٰہ

عنهم ورضوا عنه ورزقنا الله اتباعهم وحبهم۔ (تفسیر عثمانی: ج۲ ص ۶۴۵)

✷ نیز بعد کے مسلمانوں کے لئے ان کے ایمان واعمال کو معیار قرار دیا گیا۔

چنانچہ ارشاد ہے: "**امنوا کما امن الناس**" (بقرۃ)

ترجمہ: اے لوگوں جیسے صحابہ کرام ایمان لایا ہے، اس طرح ایمان لاؤ

اور ارشاد ہے: "**فإن امنوا بمثل ماأمنتم به فقد اهتدوا.**" (بقرہ: ۱۳۷)

ترجمہ: سو اگر وہ بھی اس طریقہ سے ایمان لے آویں جس طریقہ سے تم اہل (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تو وہ بھی راہ حق پر لگ جاویں گے۔

مذکورہ بالا آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ صحابۂ کرام کا ایمان واعمال دوسرے لوگوں کے واسطے معیار حق اور کسوٹی ہے، اگر ان کے ایمان واعمال کے مطابق بعد والے مسلمانوں کے ایمان واعمال ہوں گے، تو ہدایت پر ہوں گے، ورنہ نہیں، حدیث شریف میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) "عن أنس قال: قال رسول الله صلّى الله عليه سلم: مثل أصحابي في أمتي كالملح في الطعام ولايصلح الطعام إلابالملح."

(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابة ج۲ ص ۵۵۴)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں میرے صحابہ کی مثال اس طرح ہے جس طرح کھانے میں نمک ہوتا ہے، کھانا نمک ہی سے درست ہوتا ہے۔

(۲) عن عبدالله بن بريدة عن أبيه أنه قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلم: مامن أصحابي يموت بأرض إلابعث قائداً ونورًا لهم يوم القيامة."

(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابة ج۲ ص ۵۵۴)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن بریدۃ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا جو بھی صحابی کسی ملک میں فوت ہوگا قیامت کے دن جب وہ زندہ ہوگا تو وہ لوگوں کے لئے جنت کا رہنما ہوگا اور ان کے لئے نور ہوگا۔ (سبحان اللہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ قیامت والے دن بھی نور وہدایت ثابت ہوں گے اور نجات کا ذریعہ بنیں گے)۔

(۳) "عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: سألت ربي عن اختلاف أصحابي من بعدي فأوحىٰ إليّ

یامحمد! إن أصحابک عندی بمنزلة النُّجُومِ فی السماء بعضها أقوی من بعض ولکل نور، فمن أخذ بشیٔ مما هم علیه من اختلافهم فهو عندی علی هدی قال: وقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: أَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ. بِأَيِّهِمِ اقْتَدَيْتُمِ اهْتَدَيْتُم رواه رزین." (مشکوٰۃ : باب مناقب الصحابة ج۲ ص ۵۵۴)

ترجمہ: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: میں نے اپنے پروردگار سے اپنے صحابہ کے درمیان اختلاف کے بارے میں پوچھا (شریعت کے فروعی مسائل کے بارے میں) جو میرے بعد واقع ہوگا؟ تو اللہ نے وحی کے ذریعہ مجھ کو آگاہ کیا کہ اے محمد! حقیقت یہ ہے کہ تمہارے صحابہ میرے نزدیک ایسے ہیں جیسے آسمان پر ستارے، جس طرح ان ستاروں میں سے اگرچہ بعض سے بعض زیادہ قوی یعنی زیادہ روشن ہیں لیکن نور (روشنی) ان میں سے ہرایک میں ہے، (اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہرایک اپنے اپنے مرتبہ اوراپنی اپنی استعداد کی بناء پر نور ہدایت رکھتا ہے بس ان میں سے جس نے بھی فروعی مسائل میں اختلاف کیا ہے، جس نے جس کو اختیار کیا ہے پھر بھی وہ ہدایت پر ہے سب کی منشاء دین پر چلنا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ میرے (صحابہ رضی اللہ عنہم) ستاروں کی مانند ہیں (پس تم ان کی پیروی کرو) تم جس کی بھی پیروی کروگے تم اس سے ہدایت پاؤگے۔

تشریح: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ میرے صحابہ "ایسے ہیں جیسے آسمان کے ستارے" اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھپ اندھیری رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے مسافروں کو دریا وجنگل کے راستوں کا نشان بتاتے ہیں جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ "وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ" (اور ستاروں کے ذریعہ وہ راستہ پاتے ہیں) میں اشارہ کیا ہے اس طرح صحابہ رضی اللہ عنہم بھی سچائی کے راستہ کو ظاہر کرنے اور بُرائی کے اندھیروں کو دور کرنے والے ہیں کہ ان کے نورانی وجود کے اخلاق وکردار اوران کی روایات وتعلیمات کی روشنی میں راہ حق نمودار ہوتی ہے اور بدی کا اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔

"جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے" چونکہ "وَلِکُلِّ نُوْرٌ" (نورِ ہدایت ان میں سے ہرایک میں ہے) اس حدیث کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ہرصحابی اپنے اپنے مرتبہ

واستعداد کے مطابق علم وفقہ کا نور ہدایت ضرور رکھتا ہے اور اس اعتبار سے کوئی بھی صحابی دین وشریعت کے علم سے خالی نہیں ہے، اس لئے جو صحابی اپنے مرتبہ واستعداد کے مطابق دین وشریعت کی جو بھی بات بیان کرتا ہے اس کی پیروی ہدایت کی ضامن ہوگی۔

واضح رہے کہ اس حدیث "أَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ الخ" میں بعض علماء نے کلام کیا ہے، چنانچہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر طویل گفتگو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، بلکہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع وباطل ہے، لیکن اس کے ساتھ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی ذکر کیا ہے کہ مسلم کی حدیث:

"عن بردة عن أبیه قال رفع یعنی النبی ﷺ رأسه إلی السماء کان کثیرًا مما یرفع رأسه إلی السماء فقال النجوم أَمَنَةٌ للسماء فإذا ذهبت النجوم أتی السماءَ ماتوعد وأنا أمنة لأصحابی فإذاذهبتُ أنا أتی أصحابی مایوعدون وأصحابی أَمَنَةٌ لأمتی فإذاذهب أصحابی أتی أمتی مایوعدون. رواه مسلم."
(مشکوٰۃ: باب مناقب الصحابة ج۲ ص ۵۵۳)

یعنی حدیث بالا سے حدیث عمر رضی اللہ عنہ کے بعض معنی ثابت ہوتے ہیں اور مسلم کی حدیث میں ہے: "اَلنُّجُوْمُ اَمَنَةٌ لِلسَّمَاءُ" (ستارے آسمان کے محافظ وامین ہیں) اور پھر اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ "أَصْحَابِیْ أَمَنَةٌ لِأُمَّتِیْ" (اور میرے اصحاب میری امت کے امین ومحافظ ہیں) چنانچہ:

کما فی "المرقاة": قدذکره ابن حجر العسقلانی فی تخریج أحادیث الرافعی فی باب ادب القاضی وأطال الکلام علیه ذکره أنه ضعیف واهٍ بل ذکر عن ابن حزم أنه موضوع باطل، لکن ذکره عن البیهقی أنه قال: أن حدیث مسلم یودّی بعض معناه یعنی قوله صلی الله وسلم: "النجوم أمنةللسماء" الحدیث قال ابن حجر صدق البیهقی وهویؤدی صحة التشبیه للصحابة بالنجوم الخ."
(کتاب المناقب، باب مناقب الصحابة: ص ۳۵۴)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو فلاح یابی کی شہادت اور سند عطا کی ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

(۱) والسابقون الأوّلون من المهاجرین والأنصار والذین اتبعوهم بإحسان رضی الله عنهم ورضوا عنه. (سورہ توبہ، آیۃ: ۱۰۰)

ترجمہ: اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب سے) سابق اور مقدم ہیں (بقیہ

امت میں) جتنے اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس سے (یعنی اللہ سے) راضی ہوئے۔ (بیان القرآن)

(۲) دوسری جگہ ارشاد ہے:

"لقد رضی اللّٰہ عن المؤمنین إذیبایعونک تحت الشجرۃ." (سورۃ فتح،ایۃ: ۱۸)

ترجمہ: بالتحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے خوش ہیں جب کہ یہ لوگ آپ سے درخت (سمرہ) کے نیچے بیعت کررہے تھے۔ (بیان القرآن)

(۳) اور ارشاد ہے:

"رضی اللّٰہ عنھم ورضوا عنہ اولئک حزب اللّٰہ ألا إن حزب اللّٰہ ھم المفلحون."
(مجادلہ: ۲۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگئے ہیں، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کا گروہ ہے خوب سن لو کہ اللہ ہی کا گروہ فلاح پانے والا ہے (بیان القرآن)

"حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں یعنی جو دوستی نہیں رکھتے اللہ کے مخالف سے، اگرچہ باپ، بیٹے ہوں، وہ") سچے ایمان والے ہیں ان کو یہ درجے ملتے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان یہ ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ورسول کے معاملہ میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کی، اسی سلسلہ میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کو قتل کردیا، جنگ "احد" میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے مقابلہ میں نکلنے کو تیار ہوگئے، معصب بن عمیر رضی اللہ عنہ اپنے بھائی عبید بن عمیر کو، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اپنے ماموں عاص بن ہشام کو، علی بن ابی طالب، حمزہ، عبیدۃ بن الحارث رضی اللہ عنہم نے اپنے اقارب عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو قتل کیا اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جو مخلص مسلمان تھے، عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ حکم دیں تو اپنے باپ کا سر کاٹ کر خدمت میں حاضر کروں، آپ نے منع فرمایا:

فرضی اللّٰہ تعالیٰ عنھم ورضوا عنہ ورزقنا اللّٰہ حبھم واتباعھم واماتنا علیہ أمین.
(تفسیر عثمانی ص: ۶۶۲)

مذکورہ بالا آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین فلاح یاب ہیں، خود باری تعالیٰ نے ان کا امتحان لیا ہے، یہ باتیں نصوص قرآنیہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور ان نصوص شرعیہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین صرف امت محمدیہ صلی اللہ علیہ سلم کے لئے نمونے نہیں ہیں بلکہ اسلام کی بنیاد ایمان اور جملہ اعمال کے سلسلہ میں امت کے لئے معیار اور کسوٹی ہے، ہر آدمی

کا ایمان ان کے ایمان کے مطابق ہونا چاہیے اور ہر فرد کے اعمال ان کے اعمال کے مطابق ہونے چاہیے۔ لہٰذا کسی حال میں ان کی تنقید و تنقیص کرنا ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جوانکو معیار ایمان واعمال بنایا ہے، اس پر تنقید کرنا ہے، دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> ”أولئک هم المؤمنون حقًا“ اور ”أولئک هم المتقون“ اور ”أولئک هم الفائزون“ اور ”أولئک حزب الله هم المهتدون“ اور ”أولئکب عنها مبعدون“ اور ”أولئک أعظم درجةً“ اور ”أولئک هم المفلحون“ اور ”أولئک هم الراشدون“ اور ”أولئک هم الصادقون“ اور ’رضی الله عنهم ورضوا عنه“.

اور رسول علیہ ﷺ نے فرمایا:

> ”ولکل نور“ اور ”أصحابی کالنجوم“ اور ”مثل أصحابی فی أمتی کالملح فی الطعام“ اور ”بعث قائدًا ونورًا لهم یوم القیامة“ اور ”أکرموا أصحابی فإنهم خیارکم“ اور ”أصحابی أمنة لأمتی“ اور ”کانوا افضل هذه الأمة“ اور ”فإنهم علی الهدی المستقیم.“

جبکہ تنقید کرنے والے کہتے کہ صحابہ کرام تنقیص سے بالاتر نہیں بلکہ وہ تنقیص کے مستحق ہیں تو صحابہؓ کرام کی تنقید کرنے کی بات ان کی ذات تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کا اثر صحابہ کرام اور ان کو چننے والا حق جلّ مجدہ اور ان کی تعدیل کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر آ کر پڑتی ہے، جس سے آدمی کے ایمان میں فتور آسکتا ہے، نقصان آسکتا ہے، آدمی بے ایمان ہو کر مرسکتا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

مرقات کی عبارت کا جواب

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ”نیم طبیب خطرۂ جان است ونیم ملا خطرۂ ایمان است“ سوال کے اندر جس عالم صاحب کا ذکر ہے مذکورہ عالم صاحب کا حال بھی ایسا ہی ہے، کیونکہ اس نے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی بعض عبارت کو نقل کیا اور بعض عبارت کو چھوڑ دیا، اب ”مرقات“ کی پوری عبات ملاحظہ فرمائیں۔

> قال فی ”المرقاة“: ”لاتسبوا أصحابی“ الخطاب بذالک للصحابة لماورد أن سبب الحدیث أنه کان بین خالد بن الولید وعبدالرحمٰن بن عوف بشیٔ فسبّ خالد فالمراد بأصحابی مخصوصون وهم السابقون علی المخاطبین فی الإسلام وقیل: نزّل السابّ منهم لتعاطیه مالایلیق به من السبّ منزلة

غیرهم فخاطبه خطاب غیر الصّحابة ذکره السیوطیؒ ویمکن أن یکون الخطاب للأمة الأعم من الصّحابة حیث رأی بنور النبوة أن مثل هذا یقع فی أهل البدعة فنهاهم بهذه السنّة وفی شرح مسلم :اعلم أن سبّ الصحابة حرامٌ من أکبر الفواحش ومذهبنا ومذهب الجمهور أنه یعزر وقال بعض المالکیة : یقتل وقال القاضی عیاض: سبّ أحد هم من الکبائر انتهی.“

(کتاب المناقب، باب مناقب الصحابة، الفصل الاوّل: ۱۰/۳۵۵)

ترجمہ: حدیث شریف کے اندر ”تم“ کے مخاطب خود صحابہ کے بعض حضرات تھے جیسا کہ ایک روایت میں اس ارشاد گرامی کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے: حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو برا کہا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ وغیرہ کو خطاب کر کے فرمایا: کہ میرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بُرا نہ کہو، پس ”میرے صحابہ“ سے وہ مخصوص صحابہ مراد ہیں، جو ان مخاطب صحابہ یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ سے پہلے اسلام لائے تھے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس حدیث شریف میں ”تم“ کے ذریعہ پوری امت کو مخاطب کیا گیا ہو اور چونکہ نور نبوت نے پہلے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ آگے چل کر میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو میرے صحابہ کو بُرا بھلا کہیں گے، ان کی شان میں گستاخیاں کریں گے، (جیسا کہ روافض وخوارج کے مختلف گروہ ایک دوسرے کو ممدوح صحابہ کے حق میں سب وشتم کرتے ہیں) اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں میں احترام صحابہ کے جذبات کو بیدار کرنے کے لیے حکم دیا کہ کوئی شخص میرے کسی صحابی کو بُرا نہ کہے اور ”شرح مسلم“ میں لکھا ہے جاننا چاہیے کہ صحابۂ کرام کو برا کہنا حرام اور اکبر فواحش (سخت بڑے گناہوں) میں سے ہے ہمارا اور جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ جو کوئی بُرا کہے اس کو سزا دی جائے اور بعض مالکیہ نے کہا اس کو قتل کیا جائے، اسی طرح کی بات علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھی ہے اور قاضی عیاض نے کہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو بُرا کہنا گناہ کبیرہ ہے۔

عبارت بالا سے واضح ہوا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں سے کسی صحابی کو سبّ وشتم کرنا حرام ونا جائز ہے، لیکن سوال میں جس عالم صاحب کا ذکر کیا گیا اس نے زبردست دروغ گوئی اور تلبیس سے

کام لیا ہے کہ حضرت ملا علیؒ پر بھی تہمت لگانے سے نہیں شرمایا اور اہل سنت والجماعت کا اجماع واتفاق ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین عدول ہیں اور کسی کا سبّ وشتم درست نہیں ہے اور صحابہ کرام بعد میں آنے والی امت کے لئے ایمان واعمال کی کسوٹی اور معیار حق ہیں، ان میں سے کسی ایک صحابی کو بُرا کہنا گناہِ کبیرہ ہے لہٰذا جملہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان پر ہر طرح کی بُرائی سے سکوت اختیار کریں اور ان کو بھلائی کے ساتھ ذکر کریں، اس کا خلاف کرنا گناہ عظیم ہے۔

محقق ابن ہمام رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

"اعتقاد أهل السنة والجماعة تزكية جميع الصحابة وجوبًا بإثبات العدالة لكل منهم والكف عن الطعن فيهم والثناء عليهم كماأثنى اللّٰه سبحان تعالىٰ عليهم."

(مسایرہ ص: ۱۳۲)

ترجمہ: یعنی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عدول ہیں اور صحابہ کرام کو سبّ وشتم کرنا حرام ہے اور ان کو بھلائی کے ساتھ ذکر کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں تعریف کی۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں عالم صاحب کی بات درست نہیں۔

نسال اللّٰه عزوجل أن يحفظنا والمسلمين من طاعة الهوى والشيطان وأنه على كل شئ قدير. واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ	۱۹؍صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

تمام شہداء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(۶۸) سوال: - جناب مفتی صاحب! تمام شہداء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب بعون اللہ تعالیٰ وتوفیقہ

تمام شہداء اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) ”ولاتقولوا لمن يقتل فى سبيل الله أموات بل أحياء ولكن لاتشعرون.“
(بقرہ: ۱۵۴)

ترجمہ: اور نہ کہو جو کوئی مارا جاوے اللہ کی راہ میں کہ مردے ہیں بلکہ زندے ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔ (بیان القرآن)

(۲) ”حدیث شریف“ میں ہے:

”عن مسروق قال سألنا عن عبدالله بن مسعود عن هذه الاية ولاتحسبن الذين قتلوا فى سبيل الله أمواتًا بل أحياء عند ربهم يرزقون الاية؟ قال إنا قدسألنا عن ذلك فقال: أرواحهم فى أجواف طير خضر لها قناديل معلقة بالعرش تسرح من الجنة حيث شاء ت ثم تاوى تلك القناديل فاطلع إليهم ربهم اطلاعة، فقال: هل تشتهون شيئًا قالوا أى شيئ نشتهى ونحن نسرح من الجنة حيث شئنا؟ ففعل ذلك بهم ثلث مرات فلمارأ وا أنهم لن يتركوا من يسألوا قالوا يارب! نريد أن ترد أرواحنا فى أجسادنا حتى نقتل فى سبيلك مرة اخرى لما رأى أن ليس لهم حاجة تركوا. رواه مسلم.“
(مشکوۃ کتاب الجهاد م: ج۲ ص ۳۳۰)

ترجمہ: حضرت مسروقؒ (تابعی) کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کریمہ کی تفسیر پوچھی ”وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ“ (الآیۃ) جو لوگ خدا کی راہ جہاد میں مارے گیے ہیں، ان کو تم مردہ خیال نہ کرو، بلکہ وہ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے الخ تو انہوں نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کریمہ کی تفسیر پوچھی، تو آپ نے فرمایا: کہ ان (شہداء) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے قالب میں ہیں، ان کے (رہنے) کے لیے عرش الٰہی کے نیچے (بمنز لہ گھونسلوں) کے قندیلیں لٹکائی گئی ہیں، وہ (روحیں) بہشت میں سے جہاں سے ان کا جی چاہتا ہے میوے کھاتی ہیں، پھر ان قندیلوں میں جا کر بسیرا کرتی ہیں تب پروردگار ان (شہداء) کی طرف جھانکتا ہے اور فرماتا ہے: کہ کیا تم کو کسی چیز کی خواہش ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں ”کہ ہم کس چیز کی خواہش کریں درانحالیکہ ہم بہشت میں سے جہاں سے ہمارا جی چاہتا ہے میوے کھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تین مرتبہ یہی معاملہ کرتا ہے (یعنی تین بار ان سے یہی سوال کرتا ہے) جب وہ یہ جانتے ہیں کہ

پروردگار کی مراد یہ ہے کہ ہم کسی خواہش کا اظہار کریں) تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ''اے ہمارے پروردگار ہماری بس یہی خواہش ہے تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں واپس بھیج دے تاکہ ہم ایک بار اور تیری راہ میں مارے جائیں) جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ ان کی کوئی (متعین) خواہش وحاجت نہیں ہے (کیونکہ انہوں نے جس خواہش کا اظہار کیا ہے، اس کو پورا کرنا اللہ کے ارادے اور مصلحت کے خلاف ہے، دوسرا یہ کہ ان کو پہلی ہی بار میں جو عظیم ثواب اور عظیم اجر ملا ہے اور اسی وجہ سے ان کی کوئی حاجت وخواہش نہیں ہے اگر وہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں وہی اجر وانعام انہیں دوبارہ بھی ملے گا اور اس کی انہیں حاجت ہی نہیں ہے، کیونکہ شہید کا اجر وثواب ایک ہی ہے، جو انہیں حاصل ہے) تو ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے یعنی اللہ ان سے پوچھنا چھوڑ دیتا ہے۔

(۳) وکذافی نیل الأوطار: أن الشهداء أحياء يرزقون فی قبورهم: (ج۵ص۱۰۱)

پس ایت قرآنی اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگیا کہ شہداء کرام اپنی اپنی قبروں میں حیات ہیں جسماً اور جنت کے طیور میں ہیں روحًا۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۵؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ	۵؍صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

شہداء کی بیویوں کی شادی درست ہے۔

(۶۹) سوال:- تمام شہداء اگر اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں، تو ان کی بیویوں کو دوسری جگہ شادی کرنا کس طرح جائز ہوگا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شہداء کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی بیویوں کی شادی کرنا نصوص کے ذریعہ جائز وحلال ہے۔

کمافی ''تفسیر المظهری'' فذهب جماعة من العلماء إلى أن هذه الحياة مختص بالشهداء والحق عندی عدم اختصاصهابهم بل حياة الأنبياء أقوى منهم وأشد ظهورًا أثارها فی الخارج حتی لايجوز النكاح بأزواج النبی صلّی

اللّٰہ علیہ وسلم بعد وفاته بخلاف الشهيد والصديقون أيضًا على درجة من الشهداء والصالحون يعنى الأولياء ملحقون بهم كمايدل عليه الترتيب فى قوله تعالىٰ: "من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين" (تحت قوله تعالىٰ:) ولاتقولوا لمن يقتل فى سبيل اللّٰہ أمواتًا. الأية." (بقرة: ۱۵۴، ج ۱ ص ۱۵۲)

نیز بے شمار صحابۂ کرام نے شہداء کی بیویوں سے بعد وفات نکاح کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے، کیونکہ وہ دنیا کے حق میں مردے ہیں اور آخرت کے حق میں زندہ ہیں، البتہ انبیاء علیہم السلام کی بیویوں کو امت کی مائیں بتلایا گیا ہے اور ان کے ساتھ نکاح ناجائز وحرام ہے، لہٰذا نبیوں کی بیویوں سے نکاح ناجائز وحرام ہے اور شہداء کی بیویوں سے نکاح کی اجازت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اور ان کی وراثت کو تقسیم کیا گیا ہے، لہٰذا دنیا کے احکام میں وہ مردہ کے حکم میں، ہیں ہاں آخرت کے اعتبار سے زندہ ہیں۔

واللّٰہ سبحانه و تعالى اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۶/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ	۲۶/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

بعض اولیاء کے جسموں کو زمین پر حرام کردیا گیا ہے۔

(۷۰) سوال :- اولیاء کے جسموں کو زمین پر حرام کردیا گیا ہے یا نہیں؟ حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بعض اولیاء کے جسموں کو زمین پر حرام کردیا گیا ہے۔ چنانچہ:

قال فى "تفسير المظهرى": ويدل على ان أجساد الأنبياء والشهداء وبعض الصلحاء لايأكلها الأرض...... كماأخرج الطبرانى من ابن عمر قال: قال رسول اللّٰہ صلى الله عليه وسلم: المؤذن المحتسب كالشهيد المتشحط

فی دمه إذامات لم یدودفی قبره وأخرج ابن مندة عن جابر بن عبدالله قال: قال رسول الله صلّی الله علیه وسلم: إذامات حامل القرآن أوحیٰ الله إلی الأرض أن لا تاکل لحمه، فیقول الأرض: أی رب کیف اکل لحمه وکلامک فی جوفه. قال ابن مندة: وفی الباب عن ابی هریرة وابن مسعود قلت: لعل المراد بحامل القرآن الصدیق، فإن مساس برکات القرآن مختص به حیث قال الله تعالیٰ: "لایمسه إلاالمطهرون" وأخرج المروزی عن قتادة قال: بلغنی أن الأرض لاتسلط علی جسد الذی لم یعمل خطیئة، قلت: لعل المراد بالذی لم یعمل خطیئة، الصالحون من عباد الله أعنی الاولیاء لماکانوا محفوظین من الخطا یامغفورین حتی صلحت قلوبهم واجسادهم .والله أعلم. (تحت قوله تعالیٰ: ولاتقولوا لمن یقتل فی سبیل الله أمواتًا بل أحیاء، بقرة: ۱۵۴). (مظهری: ج ۱ ص ۱۵۳)

فقط والله سبحانه و تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۵/صفر المظفر ۱۴۲۶ھ	۵/صفر المظفر ۱۴۲۶ھ

* * *

کِتَابُ الطَّهَارَةِ

فصل: غسل اور اس کے احکام کے بارے میں

(۷۱) سوال:- جناب مفتی صاحب! وضوو غسل کے متعلق چند باتوں کی تحقیق مطلوب ہے (۱) جنابت کے غسل میں دانتوں کو خلال کرنا ضروری ہے یا نہیں اور سوراخ والے دانتوں کے سوراخ میں پانی پہنچانا واجب ہے یا نہیں؟

(۲) غسلِ جنابت میں عورتوں کو ناک اور کان کی بالی کے سوراخوں میں پانی پہنچانا فرض ہے یا نہیں؟

(۳) ناخن کے نیچے پانی پہنچانا وضوو غسل میں فرض ہے یا نہیں؟

(۴) وضو میں ہر عضو کو اطمینان قلب کی غرض سے چار چار مرتبہ دھونا درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ التوفیق والصواب

جواب (۱):- غسل جنابت میں دانتوں کو خلال کرنا ضروری نہیں، صرف کلّی کرنا کافی ہے، البتہ دانتوں کے درمیان طعام کا حصہ زیادہ ہو جو کہ نظر آئے یعنی چنے کی مقدار سے زیادہ ہو، تو اس کو نکالنا اور خلال کرنا ضروری ہے، دانتوں کے چھوٹے سوراخ میں پانی پہنچانا واجب نہیں، لیکن سوراخ بڑے ہوں جیسے چنے سے بڑی چیزیں وہاں رہ جاتی ہوں، تو اس کو نکالنا اور خلال کرنا ضروری ہے ورنہ غسل نہ ہوگا۔

كما في "الخلاصة": فإن كان بين أسنانه شئ من الطعام هل يجب إيصال الماء إلى ماتحته إن كان كثيرًا يتبين للناظر كمافي سقوط السن يجب إيصال الماء إليه وإن كان قليلايكون عفوًا وإن كان في طواحينة ثقب وفيها شئ يجب إيصال إليه. (الفصل الثالث تحت جنس آخر: ج ۲ ص ۲۱)

جواب (۲):- فرض ہے، فقہائے کرام رحمہم اللہ نے لکھا کہ سوراخ اگر وسیع و کشادہ ہے تو بالی کو حرکت کرنا سنت ہے اور اگر تنگ ہے تو حرکت کرنا فرض ہے، ویسا ہی انگوٹھے کا مسئلہ ہے یعنی انگوٹھی کشادہ ہے تو حرکت کرنا سنت ہے اور تنگ ہے تو فرض ہے۔

كما في "الخلاصة": في مجموع النوازل تحريك الخاتم سنة إن كان واسعًا وفرض إن كان ضيقًا بحيث لم يصل الماء تحته والثقب الذي فيه

القرط على هذا. (الفصل الثالث تحت جنس. ج ۱ ص ۲۱)

جواب (۳): - ناخن اگر ایسے لمبے ہیں کہ انگلی کے سر کو ڈھانپ لیا ہے تو اس کے نیچے پانی پہنچانا فرض ہے ورنہ نہیں، نیز ناخن کو اتنا لمبا کرنا خلاف سنت اور مکروہ تحریمی ہے۔

کما فی "الخلاصة". ولو كان الظفر طويلاً بحيث يستر راس الأنملة يجب إيصال الماء إلى ما تحته وإن كان قصيراً لايجب. (الفصل الثالث جنس اخر)

جواب (۴): - یہ خلاف سنت اور مکروہ ہے البتہ ضرورت کے موقع پر یعنی کسی کو اگر وہاں پانی نہ پہنچنے کا شبہ ہو تو دھونا جائز ہے گناہ نہیں ہے۔

کما فی "الخلاصة": وإن غسل مواضع الوضوء أربع مرة وقال الفقيه أبو جعفر رحمه الله لايكره إلا إذا رأى السنّة فيماوراء الثلاث.
(الفصل الثالث جنس اخر: ج ۱ ص ۲۲)

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۶ / محرم الحرام: ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۶ / محرم الحرام: ۱۴۲۴ھ

(۷۲) سوال: - غسل جنابت کے متعلق مزید چند مسائل کی تحقیق مطلوب ہیں۔

(۱) غسلِ جنابت میں عورت کو داخل فرج میں پانی پہنچانا فرض ہے یا نہیں؟

(۲) جنابت کے غسل میں ناف کے سوراخ میں پانی پہنچانا فرض ہے یا نہیں؟

(۳) جنابت کے غسل میں غرغرہ کے ساتھ کلّی کرنا اور ناک کے نرم حصّہ تک پانی پہنچانا فرض ہے یا نہیں؟ اگر فرض ہے تو ماہِ رمضان میں جنبی آدمی کسطرح فرض غسل کرے گا؟

الجواب ومنه التوفيق والصواب

جواب (۱): - فرض نہیں ہے۔

کماذکرہ" الشامية "عن الفتح ولايجب إدخالها الاصبع فى قبلهاوبه يفتى.
(كتاب الطهارة مطلب فى ابحاث الغسل: ج ۱ ص ۱۵۲)

جواب (۲): - ناف کے ظاہری حصے میں پانی پہنچانا فرض ہے اس کے اندرونی حصہ میں پانی پہنچانا فرض نہیں۔

کمافی شرح التنویر (ویجب) ای یفرض (غسل) کل مایمکن من البدن بلاحرج (سرة وشارب وحاجب)درمختار مع شامیه: ج ۱ ص ۱۵۲)

جواب (۳):- جنابت کے غسل میں صرف کلّی کرنا اور ناک کے داخل حصّہ میں پانی پہنچانا اور سارے بدن کو دھونا فرض ہے، غرغرہ کے ساتھ کلّی کرنا اور ناک کے نرم حصّہ تک پانی پہنچانا فرض نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ وضو میں سنت موکدہ ہے مگر روزہ دار کے لئے نہ فرض ہے نہ مستحب ہے بلکہ مکروہ ہے کیونکہ غرغرہ اور استنشاق سے اگر حلق میں پانی چلا جاوے تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

کمافی "شرح التنویر"(وفرض الغسل)...... (غسل) کل (فمه) ویکفی الشرب عبًا لأن المجّ لیس بشرط فی الأصح (وأنفه) حتی ماتحت الدرن الخ

(درمختار مع شامیة : ج ا ص ۱۵۱)

فقط و اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲؍ رجب المرجب ۱۴۲۶ھ

بَابُ الْحَیْضِ وَالْاِسْتِحَاضَةِ

نماز کے آخری وقت میں اگر عورت کو حیض شروع ہو اور عورت نماز نہیں پڑھ سکی تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۷۳)سوال:-(۱) دوپہر دو بجنے کے بعد مجھے حیض شروع ہوا ہے مگر میں نے ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی حالانکہ حیض شروع ہونے سے قبل نماز پڑھنے کا کافی وقت تھا، اب سوال یہ ہے کہ مجھے اس ظہر کی نماز قضا کرنی ہوگی یا نہیں؟

(۲) جنبی اور حیض ونفاس والی عورت ذکر واذکار کر سکتی ہیں یا نہیں؟

الجواب باسمہ تعالیٰ وتوفیقہ

جواب (۱):- صورت مسئولہ میں قضاء ضروری اور فرض نہیں۔

کما فی "الفتاویٰ الولوالجیة": إمراء ة حاضت فی آخر الوقت وهو وقت

لو كانت فيه طاهرة أمكنها أن تصلي ؟ تقسط عنها فرض الوقت وكذلك لو كان لايسع فيه صلاتها لأن الوجوب اخر الوقت سواء كان الوقت قليلا أو كثيرًا فقد وجب سبب الوجوب وهي ليست من أهل الصلوٰة فلم تجب عليها الصلوٰة فلايجب عليها القضاء . (كتاب الطهارة: الفصل الخامس : ج ا ص ۵۷)

جواب (۲) :- ذکرو اذکار کرسکتی ہے، مگر قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرسکتی، البتہ دعاء والی آیات دعا کی نیت سے پڑھ سکتی ہے۔

قال فی "البحر" وأما الأذكار فالمنقول إباحتها مطلقا الخ
(كتاب الطهارات ، باب الحيض : ج ا ص ۲۰۰)

فقط و الله تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲ رجب ۱۴۳۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاوم مفتی دارالافتاء
۱۲ رجب ۱۴۳۶ھ

مستحاضہ عورت کا حکم

(۴۷) سوال :- ایک عورت کی عمر چالیس سال ہے اسی عورت کو دو سال سے حیض کا خون مسلسل جاری ہے، اس سے قبل عورت کی مدت حیض آٹھ روز کی تھی، اب سوال یہ ہے کہ عورت کسطرح نماز، روزہ تلاوت وغیرہ کرے گی؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حیض کی اقل مدت تین دن اور اکثر مدت دس دن ہے اور اس سے کم وبیش یعنی تین دن سے کم اور دس دن سے زیادہ ہونے کو اصطلاح شرع میں استحاضہ کہا جاتا ہے اور مستحاضہ عورت کا حکم طاہرہ عورت کی طرح ہے یعنی حیض کی عادت والی مدت کے علاوہ باقی اوقات میں عورت احکام شرعیہ کی مکلّفہ رہے گی ہر وقت کے لئے تازہ وضو کر کے نماز و تلاوت وغیرہ ادا کرے گی۔

قال فی " شرح التنوير" (وأقله ثلاثة أيام بلياليها) ......وأكثره عشرة (والناقص) عن أقله (والزائد) على أكثره ...... استحاضة (درمختار مع شامية ، باب الحيض: ج ا ص ۲۸۲) وفي موضع أخر لايمنع صوما وصلوٰة

ولو نفلا (وجماعاً) (درمختار مع شامية كتاب الطهارات ج ا ص ۲۹۸)

فلہٰذا صورت مسئولہ کی عورت کو اپنی حیض کی عادت والی مدت آٹھ روز ہی مدت حیض ہوگی (اس مدت کی نمازیں معاف رہیں گی اور ماہ رمضان میں اسی آٹھ روز کی قضا ضروری ہوگی) مابقیہ استحاضہ میں شمار ہوگا، اس میں نماز روزہ سب کچھ احکام شرعیہ بحال رہیں گے، البتہ مذکورہ عورت کو ہر وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو ضروری ہوگا، چونکہ مستحاضہ عورت بھی معذور کے تحت داخل ہے اور معذور کو ہر وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا ہوتا ہے لہٰذا مستحاضہ بھی ہر وقت تازہ وضو کرکے نماز وغیرہ ادا کرے گی۔

فقط و اللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۳ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۳ر صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

فَصْلٌ فِی الْاِسْتِنْجَاءِ وَآدَابِهٖ

پیشاب کے بعد ڈھیلا استعمال کرنا سنت ہے

(۷۵) سوال :- عرض کہ بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ڈھیلے سے پیشاب خشک کرنا چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے اس لئے پیشاب کے بعد ڈھیلا لینا کسی کے لئے نہ ضروری ہے، نہ سنت ہے، بلکہ صرف پانی سے استنجا کر لینا کافی ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

یہ شبہ بالکل غلط ہے اور یہ ایک گمراہانہ نظریہ ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ جس کا جسم اور قویٰ قوی ہے، قطرات نکلنے کی بیماری اور عادت نہیں ہے، اس کا ڈھیلا اور پانی دونوں چیزوں کا استعمال کرنا سنت اور مستحب ہے اور جو شخص ایسا نہیں اس کو قطرات نکلنے کی بیماری ہے یا کبھی کبھی قطرات نکلنے کی عادت ہے (جیسا کہ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے، اس کے لئے ڈھیلا پھر پانی سے استنجا کرنا ضروری ہے، ورنہ یقیناً اس کا پاجامہ اور کپڑا گندہ ہوگا، اور وہ پیشاب کے معاملہ میں احتیاط نہ کرنے پر گنہگار رہوگا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ڈھیلا لینا ثابت نہیں تھا تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آپ ﷺ کا مزاج مبارک نہایت قوی تھا آپ کو ڈھیلا لینے کی حاجت ہی نہیں تھی، لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ کوئی بھی شخص

ڈھیلا نہ لے خواہ اس کو حاجت ہو یا نہ ہو، یہ بالکل لایعنی بات ہے۔

علاوہ ازیں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ پیشاب کے بعد ڈھیلے سے استنجا کرتے تھے۔

* چنانچہ مصنف بن ابی شیبہ میں روایت ہے۔

عن أبی بکر عن یسار بن نمیر کان إ ذابال مسح ذکرہ بحائط أوحجر لم یمسہ ماء. کذا رواہ أبوحنیفة کمافی الاثار لأبی یوسف أخرجہ الشافعی فی الام ورواہ البیہقی ایضًا وقال ہذا أصح مافی الکتاب رواہ الطبرانی فی الأوسط الخ (کذافی معارف السنن. ج۱ ص ۱۳۳)

ترجمہ: ابوبکر یسار بن نمیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب پیشاب کرتے تو اپنے ذکر کو دیوار یا پتھر سے خشک کر لیتے بعض دفعہ اس کو پانی لگاتے بھی نہیں تھے۔

آ و کذا فی مجمع الزوائد أنه بال فمسح ذکرہ بالتراب الخ (ج۲ ص ۴۹۷)

اسی روایت سے معلوم ہوا کہ پیشاب کے بعد ڈھیلا لینا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے شاید انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھا ہوگا اور اگر نہ بھی دیکھا ہے مگر صحابی کا فعل رسول اللہ ﷺ کے بعد حجت شرعیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے "إزالة الخفاء" میں لکھا ہے کہ پیشاب کے بعد ڈھیلا لینے کا مسئلہ پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۵/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۵/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْجَبَائِرَةِ

پٹی پر مسح کرنا

(۷۶) سوال:- میرا ہاتھ ٹوٹ گیا اب ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی ہے ڈاکٹروں نے پانی لگانے اور حرکت کرنے سے منع کیا چونکہ حرکت کرنے کی صورت میں ہڈیوں کا جوڑ صحیح نہ ہوگا ایسی صورت میں وضو

غسل کیسے کیا جاوے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو حرکت کئے بغیر اگر دیگر اعضاء کو دھونا ممکن ہو تو دوسرے اعضاء کو پانی سے دھوے اور ٹوٹے ہوئے حصوں کو پٹی کے اوپر گیلے ہاتھ سے مسح کرے تو پاکی حاصل ہوجائے گی، البتہ دیگر اعضاء کے دھونے میں اگر ہاتھ کی حرکت کا خوف اور ہڈی نہ جوڑنے کا یقین ہو تو پھر وضو و غسل کی جگہ تیمّم کرے تو اس سے بھی پاکی حاصل ہوجائے گی۔

کما فی "خلاصة الفتاویٰ" : ویجوز للمریض أن یتمم فی المصر إذا لم یستطع الوضوء أو الغسل للمرض أو یخاف علی نفسه الهلاک بسبب استعمال الماء أو یخاف تلف عضو من أعضائه وإن کان لا یخاف الهلاک ولا تلف العضو لکن یخاف زیادة المرض أو إبطاء البرء یجوز التیمم

(کتاب الطهارات : ج ۱ ص ۳۸)

فقط واللّٰه سبحانه وتعالیٰ أعلم بالصواب .

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللّٰہ عنہ
۲۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ	۲۴؍ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۳ھ

بَابٌ فِي النَّجَاسَةِ وَأَحْكَامِ التَّطْهِيرِ

(۷۷) سوال:- جناب مفتی صاحب! بعض پاکی اور ناپاکی کے بارے میں بعض سوالات کی تحقیق مطلوب ہیں۔

(۱) مچھلی کا خون پاک ہے یا نہیں؟ اور اگر مچھلی بدون دھوئے خون سمیت پکائی جاوے تو اس کو کھانا درست ہوگا یا نہیں؟

(۲) تھوڑی قئ ناقض وضو ہے یا نہیں؟ اور وہ تھوڑی قئ اگر کپڑے یا بدن وغیرہ میں لگنے سے کپڑا وغیرہ ناپاک ہوجائے گا یا نہیں ہے؟

(۳) کتا اگر بدن یا کپڑے وغیرہ کو کاٹے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۴) بھیگا ہوا کتا پاک ہے یا ناپاک؟ اگر کپڑے وغیرہ میں گیلے کتا کا بدن لگے تو کپڑا وغیرہ ناپاک ہوجائے گا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- مچھلی کا خون پاک ہے ناپاک اور حرام نہیں ہے، بدون دھوئے خون سمیت پکائے جاوے تو سالن بھی حلال ہے البتہ بعض لوگوں کو طبعی ناگواری ہوتی ہے اس لئے دعوت کے کھانے میں ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ صاف ستھرا کر کے پکانا چاہئے۔

کمافی "سراجیة علی هامش القاضی": دم السمک طاهر. (ج ا ص ۱۸)

جواب (۲):- تھوڑی قئی ناقص وضو نہیں ہے اور اس قدر قئی سے کپڑا، بدن وغیرہ ناپاک نہیں ہوگا البتہ بوقت نماز اس کو دھولینا چاہئے اور یہ سنت ہے۔

کمافی "سراجیة علی هامش القاضی خان": القی القلیل کما أنه لیس بحدث لیس بنجس. (ج ا ص ۱۸)

جواب (۳):- کتا اگر پاگل یا حالت غصہ میں ہے تو بدن، کپڑا ناپاک نہیں ہوگا البتہ دھولینا بہتر ہے، مگر کتا پاگل یا حالت غصہ میں نہیں تو ناپاک ہوجائے گا یعنی کاٹنے کی جگہ ناپاک ہوجائے گی اور یہ جگہ ہتھیلی کے برابر ہو تو بدون دھوئے نماز درست نہیں ہوگی۔

کما فی "القاضی خان": الکلب إذا أخذ ثوب إنسان أو عضوه بفیه إن أخذ فی الغضب لایفسد وإن أخذ فی المزاح واللعب یفسد لأنه فی الوجه الأوّل یاخذ بسنه وسنه لیس بنجس وفی الوجه الثانی یأخذ بفیه ولعابه نجس. (ج ا ص ۱۱)

جواب (۴):- اگر کتا کنوے یا بارش کے پانی میں چمڑے تک بھیگا ہوا ہے تو ناپاک ہے، کپڑے وغیرہ میں لگنے سے کپڑا وغیرہ ناپاک ہوجائے گا اور اگر ہلکی بارش کے پانی میں اوپر اوپر سے بھیگا ہے چمڑے تک تری نہیں گئی ہو تو ناپاک نہ ہونے کا ایک قول ہے، دوسرا قول ناپاک ہونے کا مطلقاً ہے۔

کمافی "القاضی خان". الکلب إذا خرج من الماء وانتقض فأصاب ثوب إنسان أفسده قیل إن کان ذلک ماء المطر لایفسده إلا إذا أصاب المطر جلده

وفی ظاهر الروایة أطلق لم یفصل . (ج ا ص ۱۱)

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۲ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ	۲۲ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

* * *

کِتَابُ الصَّلٰوۃِ

عورت کا وضع حمل کے وقت نماز پڑھنا لازم ہے یا نہیں

(۷۹) سوال :- جناب مفتی صاحب! ایک واعظ صاحب نے تقریر کے دوران فرمایا کہ عورت کو بچہ کی پیدائش کے وقت بھی نماز معاف نہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان کی بات کہاں تک درست ہے اور بچّہ کے کم وبیش کتنا حصّہ باہر آنے تک عورت پر نماز لازم ہے اور اسی حالت میں عورت نفاس والی ہوگی یا نہیں؟ اگر نماز پڑھنا ضروری ہے تو اسی حالت میں عورت کیسے نماز پڑھے گی؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جناب واعظ صاحب کی بات کسی قدر درست ہے یعنی وضع حمل کے وقت اگر بچہ کا ایک تہائی حصّہ یا اقل مقدار باہر آوے اور اکثر حصّہ اندر رہے اور عورت کا ہوش وحواس بھی درست رہے اور نماز کا وقت بھی جانے لگے تو اسی حالت میں وضو یا تیمّم کر کے عورت پر نماز پڑھنا ضروری ہے، بیٹھ کر یا جس حالت میں ہے اسی حالت میں نماز پڑھے گی اگر رکوع وسجدہ نہیں کر سکتی تو اشارہ کر کے پڑھے گی کیونکہ اب تک عورت نفاس والی نہیں ہوئی اگر نہیں پڑھی تو قضا کرے گی ورنہ عورت گنہگار ہوگی۔

نماز پڑھنے کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بچّہ کے سر کے نیچے ہانڈی رکھی جائے یا تو گھڑھا کیا جائے پھر اس میں روئی یا کپڑے رکھے جائیں اور بچّہ کا سر اسی میں رکھا جائے تا کہ بچّہ کو تکلیف نہ ہو لیکن بچّے کا اگر اکثر حصہ نکل جاوے اور اس کے ساتھ خون نظر آوے تو عورت نفاس والی ہوجائے گی اور نفاس شروع ہونے کے بعد سے بند ہونے تک نماز معاف رہے گی پھر نماز درست نہیں۔

كمافي "الفتاویٰ الولوالجية". المرأة إذاخرج بعض ولدها إن خرج الأقل ؟ لايكون حكمها حكم النفاس ولاتسقط عنها الصلوة لأن الأكثر ليس بخارج وللأكثر حكم الكل ويجب عليها أن تصلى لأن المانع من الصلوٰة وقدعدم ولم تصل فى تلك الحالة ؟ تصير عاصية ثم كيف تصلى ؟ قالوا: يوتى بقدر فيجعل القِدر تحتها اوتحفر لها حفيرة وتجلس هناك وتصلى كى لاتؤذى الولد. (كتاب الطهارة: الفصل الخامس. ج ۵۱)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
یکم رجب ۱۹۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
یکم رجب ۱۴۲۶ھ

(۸۰) سوال :- (۱) جناب مفتی صاحب! میرے بچے کی پیدائش اپریشن کے ذریعہ سے ہوئی ہے اب سوال یہ کہ میرا حکم نفاس والی عورت کا حکم ہوگا یا نہیں؟

(۲) حیض اور نفاس والی عورت پر نماز روزہ معاف ہے مگر نماز کے اوقات میں کچھ عبادات کرے گی یا نہیں؟

الجواب ومنہ التوفیق والصواب

جواب (۱):- بچہ پیدا ہونے کے بعد رحم سے نکلنے والا خون نفاس کا خون ہوتا ہے پس اپریشن کے بعد اگر آپکے رحم سے نفاس کا خون جاری ہوا ہے تو آپ بھی نفاس والی عورت کے حکم میں داخل ہے، یعنی جب تک نفاس کا خون جاری رہے تب تک آپکے حق میں نماز روزہ ممنوع ہیں۔

کمافی "الفتاویٰ الولوالجیة" المرأة إذاخرج ولدها میتًا من قبل سرتها بأن ظهرفرجة عند سرتها ثم انشقت وخرج منها و کذاإن سال الدم من قبل سرتها ؟ لاتكون نفساء بل مستحاضة لأن النفاس اسم لدم يخرج من الرحم عقيب الولد إن سال الدم من الأسفل صارت نفساء لوجود دم النفاس.

(کتاب الطهارة: الفصل الخامس ج ۱ ص ۵٦)

جواب (۲):- مستحب یہ ہے کہ نماز کے اوقات میں ایسی عورتیں وضو کر کے مصلّی میں بیٹھے بیٹھے تسبیح وتہلیل پڑھے گی تا کہ نماز کی عادت رہے اور اس تسبیح وتہلیل کی برکت سے نماز کا ثواب ملے گا۔

کمافی "الفتاویٰ الولوالجیة": ويستحب للمرأة الحائض إذادخل عليها وقت الصلوٰة أن تتوضأ و تجلس عند مسجد بيتها وتسبح وتهلل كی لاتزول عنها عادة العبادة. (فصل فی النفاس والحیض ج ۱ ص ۵٦)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم ۔

الجواب صحیح
بندہ محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲ رجب ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲ رجب ۱۴۲۶ھ

عربیہ ضیاء القرآن
تورکھو ضلع [illegible]

فصل فی الأذان والإقامة

جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا ہی سنت متوارثہ ہے

(۸۱) سوال :- بخدمت جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون عرض یہ ہے کہ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر دی جائے یا باہر، ہمارے یہاں کے ایک عالم صاحب نے فرمایا کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد سے باہر دینا سنت ہے اور اندر دینا خلاف سنت اور بدعت ہے اور وہ ابوداود شریف کی ایک حدیث سے اپنے دعوی پر استدلال کرتے ہیں۔

فلہذا جناب عالی سے گذارش ہے کہ اس مسئلہ پر اپنی محققانہ رائے سے آگاہ فرمائیں تاکہ ہمارے درمیان واقع ہونے والی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

قرآن وحدیث اور فقہ وفتاوی کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی اذانِ ثانی مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا سنت ہے اس پر تمام اہل علم وفتاوی کا اجماع واتفاق ہے۔

حدیث کی روشنی میں جمعہ کی اذان ثانی کا مقام

(۱) عن السائب بن يزيد قال كان يؤذن بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا جلس على المنبر يوم الجمعة على باب المسجد وأبى بكر وعمر الخ. (ابوداودمن اعلاء السنن: ج۸ ص۸۶ طبع دار الكتب بيروت.)

ترجمہ: حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جمعہ کی اذان ثانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مسجد کے داخلی حصہ دروازے میں دی جاتی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ منبر پر تشریف لاتے تھے، ویسا ہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں بھی۔

حدیث کی شرح میں علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ "بین یدی" کا معنی قریب ہے چنانچہ امام

اللغات علامہ راغبؒ فرماتے ہیں:

اعلم أن الراغب قال فی مفرداته يقال هذاالشيئ بين يديک ای قريبًا منک.

(من اعلاء السنن: ج۸ص ۸۶ طبع دار الکتب بيروت.)

ترجمہ: جب کہا جائے کہ یہ چیز تیرے سامنے ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز تیرے قریب ہے بعید نہیں۔

"**بین یدی**" کا معنی قریب ہونے پر مزید اور دو حدیثیں ذکر کیجاتی ہیں۔

(۲) عن سعيد بن أبی وقاص أنه دخل مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم على إمرأة وبين يديهانوی أوحصی تسبح به.

(باب ثواب التسبح مشکوٰة ج ۱/ص ۲۰۱.)

ترجمہ: حضرت سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک عورت کے پاس داخل ہوئے اس حال میں عورت کے سامنے (یعنی قریب) گھٹلیاں یا کنکری تھی جس سے وہ تسبیح پڑھ رہی تھی۔

(۳) عن عائشة رضى اللّٰه عنها زوج النبی ﷺ أنه قالت كنت أنام بين يدی رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ورجلای.

فی قبلته فإذا سجد غمزنی فقبضت رجلیّ إذا قام بسطتها قالت والبيوت يومئذليس فيها مصابيح. متفق عليه. (بخاری شریف ج ۱ ص ۳۷۵)

ترجمہ: ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہے ہیں کہ میں: (رات میں تہجد کی نماز کے وقت) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے سوتی رہتی تھی اور میرے پاؤں قبلہ کی طرف یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سجدہ کرنے کی جگہ پر پھیلے رہتے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ میں جانے لگتے تو مجھ کو ٹھوکا دیتے، یعنی میرے پاؤں کو دبا دیتے اور میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی تھی، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ کھڑے ہو جاتے تھے تو میں اپنے پاؤں پھیلا دیتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ان دنوں ہمارے گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث میں جو "**بین یدی**" کا لفظ ہے اسکا معنی قریب ہے جیسا کہ امام اللغات راغب کے حوالہ سے گذرا ہے تو حدیث شریف کا معنی یہ ہوا کہ جمعہ کی اذان ثانی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریب میں دی جاتی تھی البتہ "**علی باب المسجد**"، کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فاصلہ پر اذان دیجاتی تھی، اس کے جواب میں علامہ ظفر احمد عثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وأما لفظ "على باب المسجد" ههنا بمعنى فى وحروف الجر يقوم بعضها موضع بعض كما فى قوله تعالى (على جذوع النخل) عند بعضهم فيكون معنى قوله على الباب اى فى الباب الذى فى داخل المسجد وهذا الباب كان قريبًا من المنبر فلا منافاة بين قوله بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم" بالمعنى الذى مر انفا وبين قوله "على الباب" كما هو ظاهر.

(من اعلاء السنن: ج۸ ص۸۶ طبع دار الكتب بيروت.)

یعنی "على الباب" کا معنیٰ "فى الباب" کے معنیٰ میں ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں "على جذوع النحل" کا معنیٰ "فى جذوع النخل" کا ہے اور بعض کے نزدیک اس بعض کا تعلق سابقہ جملہ سے ہے یعنی علی جزوع النخل میں بعض "علی" کو "فی" کے معنی میں لیتے ہیں ای فى جزوع النخل۔ مابعد کے ساتھ تعلق جوڑنا محل نظر ہے، بلکہ صاحب اعلاء السنن نے تو تفریعاً یہ بات ذکر کی ہے کہ جب "علی" کو "فی" کے معنی میں مال لیا تو اس صورت میں "على الباب" کا معنیٰ فی الباب الذی فی داخل السجد ہو جائے گا۔ واللہ اعلم اصل کی طرف مراجعت کی جائے۔ "على الباب" کا معنیٰ "فى الباب الذى فى داخل المسجد" ہے تو اس صورت میں "بين يدی اور على الباب" کے مابین کوئی تعارض نہیں رہتا ہے۔

واضح رہے کہ اس زمانہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وسیع نہ تھی چنانچہ عمدۃ القاری (ج۲/ ص۳۵۸) میں ہے کہ مسجد کے تین دروازے تھے صحیح بخاری کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک دروازہ منبر کے سامنے تھا۔ چنانچہ:

عن أنس بن مالك رضى الله عنه يذكر أن رجلاً دخل يوم الجمعة من باب وكان وجاه المنبر رسول الله صلى الله عليه وسلم قائم يخطب فاستقبل رسول الله صلى الله عليه وسلم الخ (بخاری ج۱ ص۱۳۷)

ترجمہ: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جمعہ کے دن دروازے سے مسجد کے اندر ایک شخص داخل ہوا اور وہ دروازہ منبر کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر خطبہ دے رہے تھے۔

پس معلوم ہو گیا کہ عرب میں "قرب الباب" کو "على الباب" سے تعبیر کرنا معروف ہے، حاصل یہ ہے کہ یہ اذان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپکے قریب ہوتی تھی اور سامنے کی طرف مسجد کا دروازہ

بھی قریب تھا کیونکہ اوّلاً تو مسجد ہی زیادہ وسیع نہ تھی پھر یہ دروازہ بھی صحن کا نہیں تھا بلکہ مسقف حصہ کا تھا اس لئے کہ صحن مسجد پر احاطہ ہی نہیں تھا جس میں دروازہ ہوتا۔

كمايفهم من رواية أبى داود عن ابن عمررضى الله عنه كنت أبيت فى المسجد فى عهد رسول الله صلّى الله عليه وسلم وكنت فتى شابًا عزبًا وكانت الكلاب تبول وتقبل وتدبر فى المسجد فلم يكونوا يرشون شيًامن ذلك. (من اعلاء السنن: ج٨ص٨٦ طبع دار الكتب بيروت.)

اس لئے موذن اس دروازہ سے بھی قریب ہوتا تھا، یعنی منبر اور اس کے سامنے کے دروازہ کے درمیان مسجد کے اندر اذان ثانی ہوتی تھی۔

كما فى " العناية على هامش الفتح" : وكان الطحاوى يقول المعتبر هو الأذان عند المنبر بعد خروج الإمام فإنه هو الأصل الذى كان للجمعة على عهد رسول الله صلى الله عليه وسم وكذالك فى عهدابى بكر وعمر رضى الله عنهما، ج٢ص٣٨ ونحوه فى الكفاية ج٢ص٣٨ قال الشيخ ظفرأحمد عثمانىؒ فدل على أن الأذان الثانى محله عند المنبر وهوالمراد بين يديه الخ

(اعلاء السنن: ج٨ص٨٦)

بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ یہ اذان مسجد سے باہر ہوتی تھی تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جمعہ کیلئے صرف ایک ہی اذان تھی اس لئے تبلیغِ صوت کی خاطر مسجد سے خارج ہوتی تھی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اذان اوّل کا اضافہ ہوا تو اذان ثانی میں غائبین تک تبلیغِ صوت کی حاجت نہ رہی بلکہ اس سے مقصد صرف تنبیہِ حاضرین رہ گئی چونکہ حاضرین مسجد کے اندر ہیں، اس لئے ان کی خاطر اذان بھی مسجد کے اندر ہی متعین کردی گئی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے ساتھ مشورہ کرکے اتفاق رائے سے یہ کام کیا ہے اور صحابۂ کرام کا عمل شریعت میں حجت ہے اور انکی مخالفت گمراہی ہے:

كما "فى اعلاء السنن" فحاصل هذا الكلام :أن الأذان كان بين يدى رسول الله صلى الله عليه وسلم فى باب المسجد داخله وهوبين يد ى المنبر محاذيًا له فلم يلزم كون الأذان خارج المسجد وإن سلمنا أن "على " بمعناه وإن كان الأذان خارج المسجد فنقول إن الأذان كان على عهد رسول الله صلى

اللّٰہ علیہ وسلم على الباب للإعلان المطلق فلما كان عثمان رضى اللّٰہ عنه وزاد الأذان الأوّل للإعلان العام جعل الثانى عند المنبر قريبًا منه للإنصات كما فى فتح البارى ناظر ٢ فى ماقال المهلب الحكمة فى جعل الأذان فى هذا المحل أى قريبًا من المنبر يعرف الناس بجلوس الإمام على المنبر فينصتون له إذا خطب. (من اعلاء السنن: ج۸ ص ۸٦ طبع دار الكتب بيروت.)

کتب فقہ اور فتاوی کی روشنی میں جمعہ کی اذان ثانی کا مقام

(۱) امام علی بن ابوبکر ابوالحسن برہان الدین فرغانی متوفی ۵۹۳ھ ہدایہ میں فرماتے ہیں:

وإذصعد الإمام المنبر جلس وأذن المؤذن بين يدى المنبر بذلک جرى التوارث. (باب صلوٰة الجمعة ج ۱ ص ۱۷۱)

ترجمہ: خطیب جب منبر پر بیٹھے تو منبر کے سامنے اذان ثانی دیجائے یہی طریقہ سلف وخلف سے چلا آرہا ہے۔

(۲) ابوحنیفہ ثانی ابن نجیم زین العابدین ابراھیم مصری متوفی ۹۷۰ھ فرماتے ہیں:

فإذا جلس على المنبر أذن بين يديه بذلک جرى التوارث والضمير فيه بين يديه عائد إلى الخطيب الجالس(بحر ۱/)

ترجمہ: خطیب جب منبر پر بیٹھے تو منبر کے سامنے جمعہ کی اذان ثانی دیجائے یہی طریقہ سلف وخلف سے جاری ہے۔

(۳) محدث علامہ بدرالدین محمود بن احمد عینیؒ متوفی ۸۵۵ھ فرماتے ہیں:

أذن ثانيا بذلک جرى التوارث من لدن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم الى هذا الزمان أمام المنبر حين صعد المنبر. (بنايه شرح هدايه)

ترجمہ: خطیب جب منبر پر بیٹھے تو منبر کے سامنے اذان دیجائے یہ طریقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر آج تک جاری وساری ہے۔

(۴) علامہ حسن بن عمار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وأذان بين يديه جرى به التوارث كالاقامة بعد الخطبة

(۵) علامہ علاء الدین محمد بن علی حصکفی متوفی ۱۰۸۸ھ فرماتے ہیں:

وفی "شرح التنویر" (ویؤذن) ثانیًا (بین یدیه) ای الخطیب .

(٦) علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ فرماتے ہیں:

وفی الشامیة (قوله یؤذن ثانیا بین یدیه) أی علی سبیل السنّة.

(ج ا ص ۱۴۱ و کذافی الهندیه : ج ا ص ۱۴۹)

فقہائے کرام نے اذان ثانی کے مقام کے متعلق جو الفاظ بتائے ہیں وہ یہ کہ "عند المنبر" منبر کے سامنے "بین یدی الخطیب" خطیب کے سامنے "بین یدي المنبر" منبر کے سامنے، ان الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی اذان ثانی مسجد کے اندر منبر کے قریب خطیب کے سامنے ہوتی تھی اور فقہائے کرام نے "وَبِذٰلِکَ جَرٰی التَّوَارُثُ" کے الفاظ سے ہر دور کا توارث و توافق نقل کیا ہے یعنی اذان ثانی کا یہی طریقہ عہد رسالت سے لیکر آج تک جاری وساری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ جمعہ کی اذانِ ثانی مسجد کے اندر خطیب کے سامنے دینا سنت ہے، یہی طریقہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور دیگر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تابعینؒ ائمۂ مجتہدینؒ کے دور سے تھا، آج تک کے تمام اہل حق واہل علم وفتاوی کا عمل اسی پر رہا ہے، اہل حق میں سے کسی سے اس کے خلاف منقول نہیں ہے۔

لہٰذا جمعہ کی اذانِ ثانی مسجد سے باہر دینا سنت متوارثہ کے خلاف ناجائز اور بدعت ہے، ہر ایماندار و مسلمان پر ضروری اور واجب ہے کہ دینی امور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے اور ہر قسم کی منکرات اور بدعات سے اجتناب کرے اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستہ اختیار کرنے کی توفیق بخشے اور حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

أمین یارب العالمین صلی اللّٰه علیه و سلم و أصحابه أجمعین.

فقط واللّٰه سبحانه وتعالیٰ اعلم بالصواب .

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دار الافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۶/ ذی اقعدہ ۱۴۲۶ھ	۲۶/ ذی اقعدہ ۱۴۲۶ھ

اقامت میں بھی حیعلتین کے وقت تحویل وجہ مسنون ہے

(۸۱) سوال :- کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ اقامت میں مثل اذان "حی علی الصلوٰۃ" اور "حی علی الفلاح" کہتے وقت دائیں بائیں جانب منہ پھیرنا

سنت ہے یا نہیں؟ کتب فقہ اور فتاویٰ میں سنت اور عدم سنت دونوں طرح کی عبارتیں ملتی ہے۔ چنانچہ:

(۱) قال فی "البحر الرائق": قوله ويلتفت يمينًا وشمالًا بالصلاة والفلاح)...... وأطلق فی الالتفات ولم یقیده بالاذان وقد منا من الغنية أنه يحوّل فی الإقامة أيضًا وفی السراج الوهاج لايحوّل فيها لأنها لإعلام الحاضرين بخلاف الأذان فإعلام للغائبين وقيل يحوّل إذا كان الموضع متسعًا

(ج ۱ ص ۲۵۸)

(۲) قال فی "بدائع الصنائع": ومنها أن ياتى بالأذان والإقامة ......إلا أنه إذا انتهى إلى الصلوٰة والفلاح حوّل وجهه يمينًا وشمالاً كذلک فعل النازل من السماء ولأن هذا خطاب للقوم فيقبل بوجهه إليهم إعلامًا لهم كالسلام فی الصلوٰة. (ج ۱ ص ۱۴۹)

(۳) قال فی "الدر المختار مع حاشية ابن عابدين": (ويلتفت فيه) وكذا فيها مطلقًا وقيل أن كذا فی الأصل المحل متسعًا أو لا (قوله وكذافيها مطلقًا) أی فی الإقامة سواء كان المحل متسعًا أو لا: (ج ۱ ص ۳۸۵)

(۴) کفایت المفتی میں ہے: ہاں اقامت میں بھی مثل اذان "حيّ على الصلوٰة" اور "حيّ على الفلاح" کے وقت منہ پھیرنا چاہئے کیونکہ تحویل وجہ سنت ہے: ويحول فيه وكذا فيها مطلقًا. (ج ۳ ص ۷) (۵) امداد الفتاویٰ (مع جدید حاشیہ از مفتی سعید احمد پالنپوری مدظلہ) (ج ۱ ص ۱۴۴) میں ہے۔

اقامت کے حیعلتین میں تحویل وجہ کے متعلق تین قول ہیں:

(اوّل) تحویل نہ کرے اس لئے کہ اقامت حاضرین کے اعلام کے لئے ہے برخلاف اذان کے کہ وہ غائبین کے اعلام کے لئے ہے۔

(دوم) اگر جگہ وسیع ہو یعنی مسجد بڑی ہو تو تحویل کرے ورنہ نہ کرے۔

(سوم) خواہ جگہ وسیع ہو یا نہ ہو ہر صورت میں تحویل کرے یہ تیسرا قول صاحب درمختار کا پسندیدہ ہے، "کبیری" میں (ص ۳۶۰) میں تحویل کو سنت متوارثہ کہا ہے حضرت مجیب (تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اسی قول کے مطابق فتویٰ ارقام فرمایا ہے لیکن "سراج وہاج" میں پہلا قول ہے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے منحۃ الخالق حاشیہ بحر الرائق۔ ج ۱ ص ۲۵۸ میں النہر الفائق شرح کنز الدقائق سے اس کی ترجیح نقل کی ہے قوله فی السراج الوهاج: لايحوّل الخ قال فی النهر: الثانی أعدل

الأقــــوال اھ۔ مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے سعایہ میں (ج ۲ ص ۱۸) اسی کو حق کہا ہے "**قلت: والحق الصریح هو القول الأوّل** اھ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے محمود الروایۃ حاشیہ شرح نقایہ میں اذان واقامت کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے **وكذا لا يحوّل فيها** (**شرح نقايه**: ج ۱ ص ۶۱) یعنی ایک فرق یہ کہ اذان میں تحویل ہے لیکن اقامت میں نہیں ہے اور گو یہ بات صحیح ہے کہ اقامت احد الاذانین ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کہ اذان کی تمام سنتیں اقامت میں بھی ہوں اذان میں انگلیوں سے کان بند کرنا مسنون ہے..... لہٰذا صحیح یہ ہے کہ اقامت میں تحویل وجہ مسنون نہیں ہے، کذا فی نفع المفتی (ص ۱۷۱)، وفتاوی محمودیہ (ج ۱ ص ۲۵۸)۔

اب سوال یہ کہ فیصلہ کن بات کیا ہے؟ براہ کرم مطلع فرما کر شاکر وممنون کریں۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

کتب حدیث اور بعض فقہ کے متون اور شروح کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامت مثل اذان ہے۔

(۱) **عن أبي جحيفة :أذن بلال للنبي صلى الله عليه وسلم مثنى مثنى وأقام مثل ذلک.** (رواه الطبراني في الأوسط والكبير رجاله ثقات) مجمع الزوائد ج ۱ ص ۸۹)

(۲) **قال في "البحر الرائق": (قوله يلتفت يميناً وشمالاً بالصلوٰة والفلاح) ...... أطلق في الالتفات. ولم يقيده بالإذان وقدمنا من الغنية أنه يحوّل في الإقامة أيضًا.** (ج ۱ ص ۲۵۸)

(۳) کبیری (ص ۳۶۰) میں ہے کہ تحویل وجہ سنت متوارثہ ہے۔

مذکور بالا حوالجات سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامت مثل اذان ہے جب ایک چیز متوارث ہونا ثابت ہے تو اس میں تعلیل کی حاجت نہیں، لہٰذا ہمارے دار الافتاء کی رائے یہ ہے کہ تحویل یمین ویسار جیسے اذان میں سنت ہے ویسے ہی اقامت میں بھی، اب رہی یہ بات کہ سنت مؤکدہ ہے یا مستحب؟

اس میں ایک بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب کسی مسئلہ میں فقہائے کرام کے درمیان اختلاف واقع ہوتا ہے تو اس کی شدت میں تخفیف پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ امام اکمل الدین محمد بن محمود بابرتیؒ متوفی ۷۸۶ھ فرماتے ہیں:

فإن اختلاف العلماء يورث التخفيف (العناية على هامش الفتح: ج ۱ ص ۷۹)

اسی بناء پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقامت میں تحویل وجہ سنت مؤکدہ تو نہیں البتہ سنت

زائدہ ضرور ہے لیکن ہمیں متوارث چیزوں میں اس کی بھی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کو غیر ضروری قرار دیا جائے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک سنت (خواہ مؤکدہ ہو یا زائدہ) کو سنت ہی کہا جائیگا۔

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالی علم بالصواب ،

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ	۲۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

اذان کی دعا میں ”وَالْفَضِيْلَةَ“ کے بعد ”وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ“ کا اضافہ بدعت ہے

(۸۲) سوال:- یہ کہ بعض لوگ اذان کے بعد دعا میں ”وَالْفَضِيْلَةِ “ کے بعد ”وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ“ کے الفاظ کو بھی بڑھا کر پڑھتے ہیں کیا یہ درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بعض لوگ جو ”وَالْفَضِيْلَةَ“ کے بعد ”وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ“ کے الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں وہ احادیث صحیحہ سے ثابت نہیں ہیں، بلکہ محض بے اصل ہیں، کیونکہ کسی بھی روایت میں یہ الفاظ منقول نہیں ہیں اس طرح بعض لوگ ”إنک لاتُخلِفُ الْمِيْعَادَ کے بعد یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ بڑھا کر پڑھتے ہیں انکا بھی کتابوں میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ان کو سنت سمجھ کر پڑھنا درست نہیں۔

✸ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اس دعا میں ”وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ“ کا جملہ ایسے ہی اس کے اختتام پر یَااَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ کہنا بھی بے اصل ہے۔

ولفظه روى البخارى وغيره من قال حين يسمع النداء اللّٰهم رب هذه الدعوة التامة والصلوة القائمة آت محمدًا ن الوسيلة والفضيلة وابعثه مقاما محمودًا ن الذى وعدته حلت له شفاعتى يوم القيامة وزادالبيهقى إنک لاتخلف الميعاد وتمامه فى الإمداد والفتح قال ابن حجر فى شرح المنهاج وزيادة والدرجة

الرفيعة وختمه بياأرحم الراحمين لاأصل لهما الخ. (فتاوى شامية : ج ۱ ص ۳۷)

✵ امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

أمّا زيادة والدرجة الرفيعة المشتهرة على الألسنة فقال السخاوى لم أره فى شيئ زاد البيهقى فى رواية إنك لاتخلف الميعاد وأما زيادة يا ارحم الراحمين فلا وجود لها فى كتب الحديث. (بذل المجهود ج ۱ ص ۳۰۲)

لہٰذا مسنون الفاظ پر اضافہ کر کے پڑھنے سے دعاء مسنون کی برکت اور ثواب حاصل نہ ہوگا بلکہ الٹا گناہ ہوگا یعنی بدعت ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ	۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

لحن فی الاذان کے بارے میں عمر بن عبدالعزیز کی حدیث کا جواب

(۸۳) سوال:۔ بعض لوگ لفظ اللہ میں ایک الف سے زائد مد کرنے کو لحن کے ماتحت شامل کر کے خلاف سنت اور ناجائز بتاتے ہیں اور اس کی تائید میں: حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی حدیث:

عن عمر بن سعد أبى حسين المكى ان موذّنا أذّن فطرب فى أذانه فقال له عمر بن عبدالعزيز أذن أذانًا سمحًا وإلا فاعتزلنا (مصنف ابن ابی شیبہ: ج ۱ ص ۲۲۹)

اور لحن کے متعلقہ بعض فقہی عبارتیں بھی بطور دلائل پیش کرتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حدیث شریف اور فقہی عبارات میں جس لحن کو ناجائز اور خلاف سنت کہا گیا وہ بالکل درست ہے، جاننا چاہئے کہ لحن، تطریب، تمدید، تغنی وغیرہ سے مراد یہ ہے کہ کلمات اذان کا اسطرح تلفظ کرنا کہ الفاظ

میں تغیر وتبدل یا حروف میں کمی وبیش یا اعراب میں غلطی ہوجاوے مثلاً اللہ اکبر کو آللہ اکبار اور محمد کو موحاماد پڑھنا یہ سب لحن ہیں، خلاف سنت ہیں اور ناجائز ہیں چنانچہ حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے:

كما فى "حلبى كبير" أن لا يلحن فى الأذان لأنه لايحل فى الأذان ولافى القرائة وتحسين الصوت مطلوب ولا تلازم بينهما وقيد الحلوانى بها هو ذكر فلا بأس بإدخال المدفى الحيلعتين وظهر من هذاأن التلحين إخراج الحرف عما يجوز له فى الأداء وهو صريح فى كلام الإمام أحمد فإنه سئل منه فى القرائة فمنعه فقيل له ماسمك قال محمد قال أيعجبك أن يقال ياموحاماد؟

(ص ۳۷۳ وكذا في البحر: ج ۱ ص ۲۵۶ وكذافى الهندية: ج ۱ ص ۵۴)

باقی رہا یہ کہ لفظ "اللّٰہ" میں ایک الف سے زائد پانچ الف تک کی مد جائز ہے یہ تو دلائل سے ثابت ہے اور یہ لحن میں داخل نہیں ہے۔

كمافى الفتح الملك المتعال شرح تحفة الأطفال : وله سبب معنوى كالتعظيم ولأجله أجاز الفقهاء مدالف الجلالة أربع عشر حركة فى اللّٰه أكبر.

(ص ۲۵)

پس واضح ہوگیا کہ لفظ "اللّٰہ" میں ایک الف سے زائد مد کرنے سے اس قسم کی غلطی نہیں ہوتی ہے، لہٰذا ان حضرات کا لحن کو بنیاد بنا کر لفظ "اللّٰہ" میں ایک الف سے زائد پانچ الف تک مد کرنے کو ناجائز اور خلاف سنت کہنا درست نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

اذان کے کلمات کے اندر مد کرنے کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں ایک اہم استفتاء اور اس کا جواب

(۸۴) سوال:- حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم وعمت فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی خیریت سے ہونگے ایک مسئلہ درپیش ہے، چونکہ اس بارے میں علماء کرام

مختلف الرائ ہیں اسلئے ہمیں تحقیق کی ضرورت ہوئی۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسہ کے ایک مولانا صاحب جو ایک بزرگ کے مجاز ہیں جگہ جگہ وعظ کے دوران تاکید کے ساتھ فرماتے ہیں کہ جو اکثر مساجد میں اذان ہو رہی ہے وہ سنت کے موافق نہیں ہے، کیونکہ اذان کے اندر لفظ ''اللہ'' میں ایک الف کی مقدار مد جائز ہے اس سے زائد مد کرنا درست نہیں، جب کہ آجکل اذان میں ایک الف سے زائد مد کیا جاتی ہے، لیکن دیگر علما کرام فرماتے ہیں کہ اذان میں ایک الف سے زائد مد کرنا لفظ ''اللہ'' میں درست ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو حضرات ایک الف سے زائد مد کو ناجائز بتلاتے ہیں ان کی بات کہاں تک درست ہے تفصیلی اور مدلل جواب کی ضرورت ہے۔

عارض: مفتی محمد منیر الاسلام بھولوی

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اذان شعائر اسلام میں سے ہے اعلام للصلوۃ ہے، عقیدۂ توحید اور رسالت کا اعلان ہے لہٰذا مؤذن کے لئے اس کے الفاظ میں رفعِ صوت اور درازئ صوت کے ساتھ حسنِ صوت کو بھی اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے یہ امور نصوص اور روایات سے ثابت اور سنت سے منقول ہیں ان امور کی رعایت کئے بغیر اذان دینا مکروہ اور خلاف سنت ہے۔

پس قراء حضرات اور فقہائے کرام کی تصریحات کی روشنی میں کلمات اذان کو رفع صوت، حسن صوت، مد صوت اور طول صوت کے ساتھ ادا کرنا چاہئے اور لفظ جلالہ کی جلالت شان کو ظاہر کرنے کیلئے لفظ ''اللہ'' میں اور ''لا الٰہ إلا اللہ'' میں نفی واثبات کے اندر مبالغہ کے لئے زیادہ مد کرنی چاہئے تین الف تا پانچ الف مد کرنے کی اجازت ہے یہی سنت ہے اور اصول شرع اور اصول قراء کے موافق ہے اور جو لوگ اس کے خلاف کرتے ہیں، وہ اصول فقہاء اور اصول قراء اور جمہور علمائے امت کے خلاف کرتے ہیں لیکن تغنی اور تطریب یعنی اذان کو گانے کیطرح بہت زیادہ طویل کر دینا کہ گانے کی شکل پیدا ہو جائے از روئے شرع لحن اور سخت غلطی ہے اس لئے اذان کو گانے کی شکل دینا بھی درست نہیں، بلکہ گناہ ہے، جہاں خلاف شرع تطریب اور تغنی کے ساتھ اذانیں ہوتی ہوں اور پندرہ بیس الف تک اذان کے الف کو مد کرتے ہوں یہ سب اذانیں غلط ہوتی ہیں ایسے لوگوں کو روکنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں داخل

ہوگا لہٰذا کارِ ثواب ہے،

خیر القرون سے لیکر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کی مساجد اور علمی مراکز مثلاً دار العلوم دیوبند، سہانپور، جامعہ اشرفیہ لاہور، دار العلوم کراچی جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جامعۃ الاسلامیہ اکوڑہ خٹک، دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، جامعۃ الاسلامیہ پٹیہ چاٹگام وغیرہ کی اذانوں کے اندر لفظ اللہ میں کم از کم تین الف زیادہ سے زیادہ پانچ الف مد کا تواتر سے چلا آرہا ہے اور وہ تا حال جاری وساری ہے، تو گویا کہ تمام امت کا اس پر اتفاق ہے اور یہ شریعت کی بڑی دلیل ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کسی گمراہی پر اتفاق نہیں کر سکتی نہ گمراہی پر جمع ہو سکتی ہے۔

لہٰذا ۱۴۰۰ (چودہ سو) سال کے اندر کتنے مفسرین، محدثین، شارحین حدیث، فقہاء وصلحاء امت، مجددین ملت گذر چکے ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے لفظ جلالہ میں ایک الف سے زائد مد (یعنی تین یا پانچ الف تک) کو اذان میں خلاف سنت نہیں کہا اور نہ کسی مفتی اور فقیہ نے اس سے قبل اس کا فتویٰ دیا، البتہ بعض جگہ پر موجودہ دور میں جو اذانیں گانے کی شکل میں دی جاتی ہیں تین یا پانچ الف کی مد نہیں بلکہ دس بارہ سے پندرہ یا بیس الف تک اسکو کھینچا جا رہا ہے، یہ محض غلو فی الدین فقہاء کے اصول اور قراء حضرات کے قواعد کے خلاف کے سواء کچھ نہیں ہے، ایسی اذانیں خلاف سنت ہیں اور خلاف شرع ہیں ایسی اذانوں میں ثواب کے بجائے الٹا گناہ ہوگا ایسی اذانوں کا زبانی جواب دینا سنت نہیں ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دار الافتاء
۱۴ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ — ۱۴ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ

وضاحت: حمد وصلوٰۃ کے بعد: واضح رہے کہ اذان کے سلسلہ میں کافی لوگوں میں تشویش پائی جاتی ہے ہمارے یہاں بلکہ بیشتر علاقوں میں صحیح اور موافق شرع اذان نہیں دیجاتی جس وجہ سے بعض اکابر نے اس کی اصلاح کی کوشش فرمائی، مگر اس میں بھی جو چیزیں قابل اصلاح نظر آئیں احقر نے اس کی طرف اکابر علماء کو توجہ دلانے کا خیال کیا تھا لیکن امروز وفردا کرتے کرتے رہ گیا۔

الحمد للہ اب ہمارے دار الافتاء کے رفیق کار مولانا مفتی کمال حسین مونشاہی صاحب نے قرآن وحدیث اور تجوید وقراءت کے اصول وضوابط کی روشنی میں جو مفصل مدلل جواب لکھ دیا ہے مجھے امید ہے

کہ انشاء اللہ اہل علم اور عامۃ الناس بصیرت کے ساتھ اس سے رہنمائی حاصل کرلیں گے ہر فریق اپنے اپنے نقائص کی اصلاح کرلیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستہ کی ہدایت فرمادے اور حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی توفیق بخشے آمین یارب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔ فقط واللہ اعلم۔

کتبہ بندہ محمد عبد السلام چاٹگامی عفا اللہ عنہ
۱۵ محرم الحرام ۱۴۵۲ھ

ہمارے اس فتویٰ کی تائید میں مفتیان کرام کے فتاویٰ اور تصدیقات

جن علمائے کرام نے لفظ اللہ میں تین الف تا پانچ الف مد کرنے کو جائز کہا ہے ان کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمائے:

(۱) الجواب صحیح قاری محمد موسیٰ فاضل دار الترتیل لاہور استاد دار الافتاء والعلوم الاسلامیہ چاٹگام۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری دامت برکاتہم (استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند)

(رسالۂ ہذا آداب اذان واقامت : تالیف مفتی محمد امین پالنپوری صفحہ ۴۸)

(۳) حضرت مولانا مفتی رفیع عثمانی صاحب مدظلہ مہتمم دار العلوم کراچی۔

(۴) حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ شیخ الحدیث ونائب مہتمم کراچی۔

(بحوالۂ البلاغ ج ۲۳ شمارہ ۶۵ جمادی الاخری ۱۴۱۹ھ ص ۴۷-۵۴)

(۵) حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جگہ زیادہ مد کے قائل تھے۔

(ملاحظہ ہو ملفوظات فقیہ الامت قسط سادس)

(۶) مولانا اعجاز احمد قاسمی اعظمی مدرس مدرسہ وصیت العلوم الہ آباد۔

(۷) حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مفتی دار العلوم دیوبند:

(۸) حضرت مفتی محمد حنیف صاحب دامت برکاتہم مدرس مدرسہ ریاض العلوم چوگیہ گورنی جونپور

(۹) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب دامت برکاتہم مدرس مدرسہ العلوم گورینی جونپور:

(۱۰) حضرت مولانا نیاز احمد اعظمی صاحب مدظلہ العالی مدرس دار العلوم متو:

(۱۱) حضرت مولانا ظہیر الدین صاحب مدظلہ العالی معروفی مصنف احیاء المعانی۔

(بحوالۂ رسالۂ "المد التعظیمی لاسم الجلالۃ")

(۱۲) الجواب صحیح بندہ نور احمد عفی عنہ، مفتی دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام۔

(۱۳) الجواب صحیح کفایت اللہ عفا اللہ عنہ، مفتی دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام۔

(۱۴) الجواب صحیح جسیم الدین عفا اللہ عنہ، مفتی دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام۔

(۱۵) الجواب صحیح قاری محمد معین الدین استاد شعبۂ قراءت، دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام۔

(۱۶) الجواب صحیح محمد ظہیر الحق استاد شعبۂ قراءت، دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام

(۱۷) الجواب صحیح احقر محمد اسحٰق غفرلہ رانگنوی، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ جیری چاٹگام

(۱۸) الجواب صحیح محمد اسحٰق (غازی) غفرلہ، شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔

(۱۹) الجواب صحیح احمد اللہ غفرلہ، مفتی ومحدث جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔

(۲۰) الجواب صحیح مظفر احمد غفرلہ، مفتی ومحدث جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔

(۲۱) الجواب صحیح قاری محمد عبد الصمد غفرلہ استاد شعبۂ قراءت، جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔

(۲۲) الجواب صحیح احمد الحق غفرلہ، استاد شعبۂ قراءت، جامعہ اسلامیہ پٹیہ چاٹگام۔

(۲۳) الجواب صحیح محمد اظہار الاسلام عفا اللہ عنہ مدیر ومفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ لالخان بازار چاٹگام۔

(۲۴) الجواب صحیح محمد رحیم الدین عفا اللہ عنہ مفتی جامعۃ العلوم الاسلامیہ لالخان بازار چاٹگام۔

(۲۵) الجواب صحیح سلطان ذوق ندوی بانی ومدیر دار المعارف الاسلامیۃ چاندگاؤں چاٹگام۔

(۲۶) الجواب صحیح فرقان اللہ انواری، مفتی دار المعارف الاسلامیۃ چاندگاؤں چاٹگام۔

(۲۷) الجواب صحیح معصوم باللہ، مفتی ومحدث دار المعارف الاسلامیۃ چاندگاؤں چاٹگام۔

(۲۸) الجواب صحیح حبیب الرحمٰن، مفتی جامعہ عربیہ نصیر الاسلام ناظر ہاٹ چاٹگام۔

(۲۹) الجواب صحیح عبید الحق جلال آبادی، صدر المدرسین مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ، خطیب بیت المکرّم ڈھاکہ۔

(۳۰) الجواب صحیح قاضی معتصم باللہ، شیخ الحدیث جامعہ شرعیہ مالی باغ ڈھاکہ۔

(۳۱) الجواب صحیح محمود الحسن، رئیس دار الافتاء جامعہ شرعیہ مالی باغ ڈھاکہ۔

(۳۲) الجواب صحیح حفیظ الدین، مفتی جامعہ شرعیہ مالی باغ ڈھاکہ۔

(۳۳) الجواب صحیح محمد علی، مفتی جامعہ شرعیہ مالی باغ ڈھاکہ۔

(۳۴) الجواب صحیح عبد الوہاب غفرلہ رئیس جامعہ اسلامیہ برورہ کملا۔

(۳۵) الجواب صحیح محمد محبوب رئیس جامعہ خواجہ معین الدین مدرسہ بریشال۔

(۳۶) الجواب صحیح محمد ادریس نواکھالوی غفرلہ، معین مفتی دار العلوم دیوبند سابقا۔

(۳۷) الجواب صحیح محمد سعید احمد مدیر جامعہ اسلامیہ سلطانیہ فینی۔

(۳۸) الجواب صحیح محمد عبد المالک غفرلہ، مفتی مرکز الدعوۃ الاسلامیہ ڈھاکہ۔

(۳۹) الجواب صحیح عبد القیوم غفرلہ، مفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ حبیب گنج۔

(۴۰) الجواب خیر الامین، مفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ حبیب گنج۔

(۴۱) الجواب صحیح عبد الشہید غفرلہ مفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ حبیب گنج۔

(۴۲) لفظ اللہ میں تین الف سے پانچ الف تک مد کرنا جائز ہے کتبہ ابو الکلام زکریا مفتی جامعہ قاسم العلوم درگاہ حضرت شاہ جلال سلہٹ۔

نوٹ:۔ تفصیلی جواب اور تصدیقات مفتیان کرام وعلماء دین ''اذان وامامت کے ضروری مسائل'' نامی کتاب، شائع از دار الافتاء والعلوم الاسلامیہ چاندگاؤں چاٹگام اور دار الافتاء خادم القرآن والسنۃ راجہ خالی چکتائی چاٹگام میں موجود ہے۔

''خیر التقریر فی اثبات التکبیر'' مقالہ کے بارے میں ایک سوال اور اس کا جواب

(۸۵) سوال:۔ ''خیر التقریر فی اثبات التکبیر'' کے مقالہ نگار نے لکھا:

أن مد اللام الثانية من الجلالة زائدًا من ألف وقع اتفاقًا مكروهًا تنزيهًا فالاجتناب منه أولى وإن صدر بقصد الاستحسان أو بقصد التغني فمحرم وقبيح واستخفاف بالسنة والاجتناب منه واجب الخ .

یہ بات واضح ہے کہ استخفاف بالسنۃ یعنی سنت رسول اللہ ﷺ کو حقیر جاننا کفر ہے اب سوال یہ ہے کہ جو مؤذنین حضرات لفظ جلالہ میں ایک الف سے زائد تین الف تک مد کرتے ہیں اور جو علماء کرام اس تین الف کو مستحسن اور مستحب کہتے ہیں کیا یہ سب حضرات کفر میں مبتلا ہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

یہ حضرات ہرگز کفر میں مبتلا نہیں ہیں، جاننا چاہئے کہ ایک چیز کا سنت ہونا کسی خبر واحد سے اور کسی چیز کا سنت ہونا اخبار مشہورہ سے ہے، ان دونوں میں فرق ہے مثلاً، تمام ائمہ کے نزدیک جو چیز متفقہ طور سے ثابت ہے یا جو سنت اخبار مشہورہ سے ثابت ہے اور اہل علم کے نزدیک متفق علیہ ہے، تو اس چیز کا استخفاف

کفر ہے مثلاً نماز میں تسبیحات رکوع، سجدہ سنت ہیں نصوص سے ثابت ہیں اور اس میں سب کا اتفاق ہے کسی کا اختلاف نہیں ایسی سنت کا استخفاف گناہ کبیرہ ہے کفر ہے، لیکن جس چیز کی سنت وعدم سنت کے بارے میں اختلاف ہو اور وہ مسئلہ مختلف فیہ ہو اس کا انکار کسی کے نزدیک کفر نہیں ہے جیسے بسم اللہ کو نماز میں جہر کرنا، رفع یدین کرنا، جس کے مخالف اور موافق میں دونوں طرح کے دلائل ونصوص ہیں، اس کا انکار کفر نہیں ہے۔

پس ”خير التقرير فی إثبات حذف التكبير“ کے مقالہ نگار کو سخت مغالطہ ہوا حکم متفق علیہ اور حکم مختلف فیہ کو برابر سمجھا ہے لہٰذا انکی تحریر ہمارے نزدیک قابل اتباع نہیں بلکہ قابل غور ہے۔

فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۷؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

(۸۶) سوال:- اذان میں مائک کا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اذان یہ ایک مستقل عبادت ہے اس کے الفاظ اور ماثور طریقے وہیئت میں کوئی کمی وبیشی درست نہیں اور بلند آواز سے اذان کہنا از روئے شرع سنت اور مرغوب فیہ امر ہے

لہٰذا اذان کے اندر رفع صوت کے لئے آلۂ جدیدہ مائک کا استعمال کرنا جو کہ خاص اسی رفع صوت کے لئے وضع کیا گیا ہے بلا کراہت درست ہے، مائک میں اذان دینے سے اذان کا ثواب ملے گا اور اذان سننے سے سننے والوں کو بھی ثواب ملے گا ایسی اذان کا جواب دینا ضروری ہوگا زبان سے بھی اور عمل سے بھی۔

نوٹ: - تفصیلی جواب ”اذان وامامت کے ضروری مسائل“ نامی کتاب، شائع از دار الافتاء والعلوم الاسلامیہ چاندگاؤں چاٹگام اور دار الافتاء خادم القرآن والسنۃ، راجہ خالی چکتائی، چاٹگام میں موجود ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۲۴

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۴؍ رجب المرجب ۱۴۲۴

بَابٌ فِي الْقِرَأَةِ

فرض نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی قرأت مسنون کیسی تھی

(۸۶) سوال :- جناب مفتی صاحب! فرض نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کیسی تھی اس بارے میں ہمیں چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) ہمارے امام صاحب نماز مغرب میں سورۂ واقعہ کی ابتدائی آیات یا آخری آیات یا درمیانی سورت میں پانچ دس آیات پڑھتے ہیں از روئے شرع ایسا پڑھنا کیسا ہے؟ اور فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء، جمعہ، عیدین وغیرہ نمازوں میں آپ صلی اللہ وسلم کی قرأت کیسی تھی؟ تفصیل کے ساتھ حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

(۲) بعض علمائے کرام سے سنا کہ مغرب کی سنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر سورہ ''کافرون'' اور ''اخلاص'' کی قراءت پڑھتے تھے یہ بات کس قدر صحیح ہے؟

الجواب منه والصدق والصواب

جواب (۱):- نمازِ فجر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''قٓ وَالْقُرآنِ الْمَجِيدِ'' اور ایک روایت میں ''وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ'' اور ایک روایت میں سورۂ مؤمنون اسی جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے اور ظہر کی نماز میں سورۂ ''وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى'' اور ایک روایت میں ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى'' پڑھا کرتے تھے اور عصر کی نماز میں تقریباً اتنی قرأت فرماتے تھے یا اس سے کم، نماز مغرب میں کبھی سورۂ طور اور ایک روایت میں ''وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا'' پڑھا کرتے تھے، مغرب میں اکثر قصار مفصل سے سورتیں پڑھتے تھے اور عشاء کی نماز میں کبھی پہلی دو رکعتوں میں سے کسی ایک رکعت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ ''وَالتِّيْنِ'' کی قرأت فرماتے اور دوسری رکعت میں کوئی دوسری سورت پڑھتے تھے اور اکثر اوساط مفصل سے سورتیں پڑھا کرتے تھے اور اکثر جمعہ کے دن فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں ''الٓمٓ تَنْزِيْل'' یعنی سورۂ ''السجدة'' اور دوسری رکعت میں سورۂ ''هَلْ اَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ'' یا ''سورۂ قیامہ'' کی قرأت فرماتے تھے اور جمعہ وعیدین میں اکثر ''سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى'' اور ''هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ'' کی قرأت فرماتے تھے۔

پس حالت اقامت میں عام طور سے اسطرح قرأت پڑھنا سنت ہے یعنی نماز مغرب میں اکثر قصار

مفصل سے پڑھنا سنت ہے، لہٰذا امام صاحب کو نمازِ مغرب میں قصار مفصل سے پڑھنا چاہئے اور صورت مسئولہ میں امام صاحب کا طریقۂ قرأت خلاف استحباب ہے، باقی نماز ظہر وعصر وعشاء میں اوساط مفصل سے قرأت پڑھنا سنت اور افضل ہے کبھی کبھی دوسری جگہ سے پڑھنا بھی ثابت اور درست ہے۔

نوٹ: ساری حدیثیں مشکوٰۃ کے باب القرأۃ فی الصلاۃ میں موجود ہیں۔

جواب (۲):- جی ہاں اکثر نماز مغرب کی سنت میں سورۂ کافرون واخلاص پڑھنا ثابت اور افضل ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

عن عبداللّٰہ بن مسعود قال ماأحصی ماسمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ فی الرکعتین بعد المغرب وفی الرکعتین قبل صلوٰۃ الفجر بقل "یاأیھاالکافرون" وقل ھو اللّٰہ أحد" رواہ الترمذی ورواہ ابن ماجۃ عن أبی ھریرۃ أنہ لم یذکر بعد المغرب مشکوٰۃ.

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

طوال مفصل، اوساط مفصل، قصار مفصل کی تفصیل

(۱۸۷) سوال :- جناب مفتی صاحب! حدیث شریف میں قرأت کے متعلق جو "لفظ مفصل" کا ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے؟ طوال مفصل، اوساط مفصل، قصار مفصل کی تعریف کیا ہے؟ اور اس ترتیب سے قرأت پڑھنا سنت مؤکدہ ہے یا سنت زائدہ ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ترتیب مذکور کے ساتھ قرأت پڑھنا سنت زائدہ ہے مگر سنت زائدہ کو بلا عذر ترک کرنا مناسب نہیں اس لئے ائمۂ مساجد کو چاہئے کہ حالت اقامت میں اسی ترتیب سے قرأت پڑھے البتہ سفر میں کسی جگہ سے جس قدر پڑھنا چاہیں پڑھنا جائز ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

عن سليمان ابن يسار عن أبي هريرة قال ماصليت وراء أحد أشبه صلوة برسول الله صلّى الله عليه وسلم من فلان قال سليمان صليت خلفه فكان يطيل الركعتين الأولين من الظهر ويخفف الأخرين ويخفف " العصر ويقرأ في المغرب بقصار المفصل ويقرأ في العشاء بوسط المفصل ويقرأ في الصبح بطوال المفصل رواه النسائي وروى ابن ماجة إلى ويخفف العصر.

(مشکوٰۃ/ باب القرأة فی الصلوٰۃ ج ۱/ص ۸۰)

مفصل کی تفصیل:

قرآن مجید کا جو آخری حصہ ہے یعنی سورۂ حجرات سے سورۂ "ناس" تک اس کو مفصلات کہا جاتا ہے، مشہور قول یہی ہے اور اسی پر زیادہ عمل ہے، قرآن کی ان آخری سورتوں والے حصّے کو مفصل اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ مفصل کے معنی ہیں جدا جدا ہونا اور یہی (سورۂ حجرات) سے اخیر تک جو سورتیں ہیں وہ اس سے قبل والی سورتوں کے مقابلہ میں چھوٹی چھوٹی اور آیات بھی چھوٹی چھوٹی ہیں جدا جدا ہیں اور درمیان میں بسم اللہ ہونے کی وجہ سے ایک سورت دوسری سورت سے جدا ہیں، پھر ان مفصل سورتوں میں بھی تین طرح کی سورتیں ہیں۔ (کما فی المرقاۃ)

(۱) بڑی (۲) متوسط (۳) چھوٹی۔

طوال، اوساط، قصار کی تفصیل

(۱) طوال مفصل:- سورۂ "حجرات" سے سورۂ "بروج" تک کی جو سورتیں ہیں ان کو طوال مفصل کہا جاتا ہے (یعنی مفصل کی بڑی سورتیں)۔

(۲) اوساط مفصل:- اور سورۂ "بروج" سے لیکر سورۂ "لم یکن" تک جو سورتیں ہیں ان کو اوساط مفصل کہا جاتا ہے (یعنی مفصل کی درمیانی درجہ کی سورتیں)۔

(۳) قصار مفصل:- سورۂ "لم یکن" سے لیکر آخیر تک کی جو سورتیں ہیں ان کو قصار مفصل کہا جاتا ہے (یعنی مفصل کی چھوٹی سورتیں)۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲/محرم الحرام ۱۴۲۴ھ	۲۳/محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

فصل فی المسبوق و اللاحق

مسبوق کو امام کے سلام سے قبل ماسبق نماز ادا کرنا کیسا ہے

(۸۸) سوال :- جناب مفتی صاحب! نماز کے متعلق بعض سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) مسبوق اگر قعدۂ اخیرہ میں امام کے سلام پھیرنے سے قبل اپنی ماسبق نماز ادا کر لیتا ہے، تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

(۲) سلام پھیرنے میں مقتدی کو امام کی متابعت واجب ہے یا نہیں؟

(۳) مسبوق کو امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے قصداً تشہد نہیں پڑھا تو اس کا حکم کیا ہوگا؟

(۴) میں ایک سفر میں تھا ریلوے اسٹیشن میں مقیم امام صاحب کی اقتداء میں ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا، جب قعدۂ اخیرہ میں "التحیات" پڑھ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ریل گاڑی اسٹیشن سے جانے والی ہے اسلئے میں نے تشہد پڑھنے کے بعد امام صاحب سے قبل سلام پھیر دیا اور چلا گیا، اب سوال یہ ہے کہ میری نماز درست ہوئی یا نہیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱) :- صورت مسؤلہ میں مسبوق کی نماز ادا کرنے کی عقلاً دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک قعدۂ اخیرہ میں امام کے ساتھ بقدر تشہد بیٹھنے اور تشہد پڑھنے سے قبل کھڑا ہو جانا اور بقیہ نماز ادا کر لینا دوسری صورت یہ ہے کہ امام کے ساتھ بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد کھڑا ہو جانا، تو صورت اولیٰ میں نماز درست نہیں ہوگی، کیونکہ اس صورت میں قصداً واجب ترک ہوا یعنی امام کے حق میں قعدۂ اخیرہ بقدر تشہد بیٹھنا فرض ہے اور مقتدی کے حق میں امام کی متابعت کرنا سلام پھیرنے تک واجب ہے، پس مقتدی نے جبکہ واجب ترک کر دیا ہے تو اس کی نماز فاسد ہوگئی ہے اور صورت ثانیہ میں شدت ضرورت کے تحت کراہت کے ساتھ نماز درست ہو جائے گی بلا ضرورت ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

کمافی "شرح التنویر" لوقام قبل السلام هل يعتد بأدائه قبل قعود الإمام قدر

التشهد لاوإن بعده نعم وذكر تحريمًا إلا لعذر : كخوف حدث وخروج وقت فجر وجمعة وعيد ومعذوروتمام مدة مسح ومر ورمار بين يديه الخ .

(درمختار مع شامية:(ج ا ص ۵۹۷)

جواب (۲):– واجب ہے۔

كما فى الشامية (قوله وكره تحريمًا أى قيامه بعد قعود إمامه قدر التشهد لوجوب متابعته فى السلام . (درمختار مع الشامية: ج ا ص ۵۹۸)

جواب (۳):- مسبوق کو بھی امام کے ساتھ قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنا واجب ہے، مگر باقی دعا ودرود نہیں پڑھے گا کیونکہ اس کے ذمہ میں نماز باقی ہے، یہ قعدہ اس کے لئے قعدۂ اخیرہ نہیں ہے، البتہ تشہد کے بعد " أشْهَدُ أنْ لَّا إلٰهَ إلاّ اللّٰه " کی تکرار کرسکتا ہے، اور اگر کسی مسبوق نے قصداً امام کے قعدۂ اخیرہ میں تشہد نہیں پڑھا تو اس کی نماز مکروہ تحریمی کے ساتھ ادا ہوجائے گی البتہ بھول سے نہیں پڑھا تو نماز بلاکراہت درست ہوجائے گی۔

كمافى الهنديه. أن المسبوق ببعض الركعات يتابع الإمام فى التشهد الأخيروإذا أتم التشهد لايشتغل بمابعده من الدعوات ثم ماذا يفعل تكلموا فيه وعن ابن شجاع أنه يكرر التشهد أى قوله أشهد أن لاإله إلاالله هو المختار. وكذافى الغياثية والصحيح أن المسبوق يترسل فى التشهد حتى يفرغ الإمام كذافى الوجير للكردرى وفتاوى قاضى خان هكذا فى الخلاصة وفتح القدير. (فتاوى عالمگيرى ج ۱/ص ۹۱)

جواب (۴):- نماز میں قعدۂ اخیرہ (یعنی بقدر تشہد بیٹھنا) فرض ہے اور تشہد پڑھنا واجب ہے باقی دعا و درود پڑھنا مسنون ہے اور جماعت کی نماز میں سلام پھیرنے میں مقتدی کو امام صاحب کی متابعت کرنا واجب ہے، (یعنی امام صاحب کے ساتھ سلام پھیرنا) جبکہ وہ مسبوق نہ ہو بلکہ وہ مدرک ہو بلاضرورت شدیدہ اس کے لئے امام صاحب کے سلام پھیرنے سے قبل سلام پھیر لینا مکروہ تحریمی ہے، البتہ ضرورت کے موقع پر تشہد پڑھنے کے بعد امام سے قبل اگر کسی نے سلام پھیر لیا ہو تو اس کی نماز درست ہوجائے گی۔

كمافى "خلاصة الفتاوى": المقتدى إذا فرغ عن التشهد فى العقدة الاخيرة قبل الإمام ذهب جاز . (وكذافى الشامية : ج۲ص ۵۹۸)

لہٰذا صورت مسؤلہ میں آپکی نماز درست ہوگئی ہے البتہ بہتر یہ ہے کہ احتیاطًا کسی وقت اس کا اعادہ کردیا جاوے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ	۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

بعض صورتوں میں امام کی نماز فاسد ہوجاتی ہے مگر مقتدیوں کی نماز درست ہوجاتی ہے

(۸۹) سوال :- امام صاحب نے فجر کی نماز میں قرأت اتنی لمبی پڑھی کہ طلوع شمس کے قریب ہوگیا ہے تو میں نے قعدۂ اخیرہ میں سورج نکلنے کے خوف سے تشہد پڑھکر امام صاحب کے قبل سلام پھیرلیا، واضح رہے کہ امام صاحب نے جب سلام پھیرا تو اس وقت سورج نکل گیا تھا، اب ہماری نماز کا کیا حال ہوگا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں امام صاحب اوران کے ساتھ سلام پھیرنے والے تمام نمازیوں کی نماز فاسد ہوگئی ہے، انکی نمازیں واجب الاعادہ ہیں، البتہ جس نے سورج نکلنے سے قبل سلام پھیرلیا تھا اس کی نماز درست ہوگئی ہے۔

کما فی "خلاصة الفتاویٰ" : ولوسلم بعدما قرأ الإمام التشهد وأخر الإمام السلام إلى أن طلعت الشمس فإنه تفسد صلوٰة الإمام ولاتفسدصلوٰة من سبق بالسّلام. (ج ا ص ۱۶۰)

فقط واللہ أعلم.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۴۲۶/۶/۳ھ	۱۴۲۶/۶/۳ھ

بہت باریک پتلے کپڑے پہننے میں ستر عورت کی فرضیت ادا نہیں ہوگی

(۹۰) سوال :- جناب مفتی صاحب ستر عورت کے بارے میں چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) عورت اگر ایسا پتلا اوڑھنا یا کپڑا پہنے جس سے سر کے بال یا جسم کا چمڑا نظر آتا ہو، تو اس صورت میں مندرجہ ذیل مسائل کے جوابات کیا ہیں؟ ایسے دوپٹہ یا کپڑے میں ستر ڈھاپنے سے ستر عورت کی فرضیت ادا ہوگی یا نہیں؟

(۲) ایسے کپڑا پہن کر نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ خواہ مرد کے لئے یا عورت کے لئے؟

(۳) عورت کے بال ستر عورت میں داخل ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب(۱):- صورت مسئولہ میں ایسے کپڑے سے ستر عورت کی فرضیت ادا نہیں ہوگی، ایسی صورت میں عورت ستر نہ ڈھاپنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی اور نماز بھی درست نہ ہوگی۔

کمافی "حلبی کبیر": وفی شرح شمس الائمة السرخسی إذا کان الثوب رقیقًا بحیث (یصف ماتحته) أی لون البشرة (لایحصل به ستر العورة) إذلاستر مع رؤیته: (ص ۲۱۴)

جواب(۲):- ایسے کپڑے میں نماز درست نہیں ہوگی، اگر پڑھ لی تو نماز واجب الاعادہ ہے۔

کمافی "خلاصة الفتاوی": فإن کان رقیقًا یصف ماتحته لایجوز صلاته.

(کتاب الصلاة الفصل السادس وفی ستر العورة ج ۱ ص ۷۳)

جواب(۳) عورت کے بال ستر میں داخل ہیں، اس لئے نماز میں اگر عورت کے بال کپڑے سے باہر نکل آگئے یعنی بال کا ایک تھائی حصہ تین تسبیح کے برابر کھلا رہا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

کمافی "خلاصة الفتاویٰ": وإن صلت فی ثوب واحد متوشحة ورأسها مکشوف لایجوز لأن رأسها عورة. (کتاب الصلوۃ: ج ۱ ص ۷۳)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ — ۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

ٹائٹ پاجامہ میں نماز پڑھنے کا حکم

(۹۱) سوال :- جناب مفتی صاحب! لباس اور پوشاک کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) ایسا ٹائٹ پاجامہ جس کے اوپر سے شرمگاہ کا تشکل ہوتا ہے، ایسے پاجامہ میں نماز پڑھنا درست ہوگا یا نہیں؟

(۲) نماز میں پگڑی باندھنا سنت مؤکدہ ہے یا سنت زائدہ؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- ایسے پاجامہ میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے دوسرے پاک کپڑے ہوتے ہوئے اگر ایسے کپڑے میں نماز پڑھے تو نماز واجب الاعادہ ہے، اور اگر دوسرا کپڑا نہیں ہے تو مجبوراً نماز ہو جائے گی، لیکن اسطرح کا لباس بنانا مکروہ اور ناجائز ہے۔

کمافی "حلبی کبیر": امالو کان غلیظًا لایری منه لون البشرة إلاأنه التصق بالعضو وتشکل بشکله فصارشکل العضو مرئیا فینبغی أن لایجوز الصلوٰة لعدم حصول السترو فی القنیة لوستر عورته بزجاز یصف ماتحته ینبغی أن لایجوز: (ص ۲۱۴).

جواب (۲):- سنت ہے اس کا اہتمام کرنا چاہئے، مگر سنت مؤکدہ نہیں، بلکہ اس کے بدون نماز مکمل ہو جاتی ہے، لہٰذا سنت زائدہ ہے۔

کمافی " خلاصة الفتاوی": والمستحب أن یصلی الرجل فی ثلاثة أثواب قمیص وازار وعمامة. (کتاب الصلوٰة الفصل السادس فی ستر العورة ج ۱ ص ۷۳)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
یکم ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
یکم ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ

رکوع وسجدہ میں امام سے قبل مقتدیوں کی سبقت کرنا

(۹۲) سوال :- ہمارے امام صاحب رکوع سے سیدھے ہوکر کچھ دیر کھڑے رہتے ہیں اس وقت بعض لوگ سجدہ میں چلے جاتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ جو مقتدی امام سے قبل رکوع وسجدہ میں چلا جائے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نماز کے بعض ارکان ایسے ہیں کہ اس میں مقتدی اگر امام سے سبقت کرلے، تو اس کی نماز درست نہیں ہوگی، مثلاً امام سے قبل تکبیر تحریمہ باندھ لینا، البتہ مقتدی اگر رکوع اور سجدہ میں امام سے سبقت کرلے اور اس کے بعد امام رکوع وسجدہ کرے اور امام کے ساتھ رکوع وسجدہ میں وہ شریک رہے تو مقتدی کی نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوجائے گی، کراہت اس لئے ہے کہ امام سے قبل افعال نماز میں سبقت کرنے کی ممانعت آئی ہے اور اس پر سخت وعید بھی آئی ہے۔

قال فی "التنویر وشرحه": (ولو ركع) قبل الإمام (فلحقه إمام فيه صح) ركوعه وكره تحريماً. (درمختار مع شامية: باب إدراک الفريضة، ج ا ص ٦١).

نوٹ :- امام صاحب کا اس طرح کھڑا رہنا مکروہ ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

فصلٌ فی السُّننِ والنوَافلِ

سفر میں سنن مؤکدہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا حکم

(۹۳) سوال :- جناب مفتی صاحب! ایک مولانا صاحب نے کہا کہ حالت سفر میں سنن ونوافل نہ پڑھنا ہی سنت ہے، چنانچہ: حضرت حفص بن عاصم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (مشکوۃ

شریف: ج اص ۱۱۸) مگر بعض علماء کو اس بارے میں علم نہیں اب سوال یہ ہے کہ مولانا صاحب کی بات کس قدر درست ہے اور سفر میں سنن مؤکدہ اور عام نوافل کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول و دستور کیا تھا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب۔

سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے سنن مؤکدہ پڑھنے اور نہ پڑھنے میں روایات مختلفہ وارد ہیں یعنی بعض روایتوں سے پڑھنا معلوم ہوتا ہے اور بعض روایتوں سے نہیں۔ چنانچہ:

(۱) عن ابن عمر قال صليت مع النّبی صلّی اللّٰه عليه وسلم الظهر فی السفر ركعتين وبعد ها ركعتين وفی رواية قال صليت مع النّبی صلّی اللّٰه عليه وسلم فی الحضر والسفر فصليت معه فی الحضر الظهر أربعًا وبعد ها ركعتين وصليت م۱۱۸)

(۲) عن حفص بن عاصم قال صحبت ابن عمر فی طريق مكة فصلّی لنا الظهر ركعتين ثم جاء إلی رحله وجلس فرای ناسًا قيامًا فقال مايصنع هؤلاء قلت يسبحون قال لو كنت مسبحًا أتممت صلاتی صحبت رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم فكان لايزيد فی السفر علی ركعتين وأبابكر وعمر وعثمان كذالک متفق عليه. (مشكوة: ج ا ص ۱۱۸)

(۳) حضرت محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

سفر میں جب اطمینان والی حالت ہو تو عام نوافل چاشت، اوابین، تہجد وغیرہ کا پڑھنا بالاتفاق مستحب ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، رواتب یعنی سنن مؤکدہ کے بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ حضرات پڑھنے کے قائل ہیں، خواہ فرض سے پہلے کی سنتیں ہوں یا فرض کے بعد کی اس سلسلہ میں خاص امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی قول سامنے نہیں آیا ہے، البتہ فقہ حنفی کی کتابوں میں مشائخ حنفیہ کے مختلف اقوال منقول ہیں، ان میں سے ایک قول علامہ ہندوانی کا یہ ہے کہ سفر جاری ہو (حالت سفر میں ہو) تو سنتوں کا ترک افضل ہے اور کہیں ٹھہرا ہوا ہو (حالت نزول میں ہو) تو پڑھنا افضل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ بالخصوص فجر کی سنت پڑھنی ہی چاہئے اور بعض نے مغرب کی سنتوں کے بارے میں بھی کہا ہے کہ ان کو پڑھنا

چاہئے۔ (معارف السنن: بحث اداء الرواتب فی السفر ج۴ ص ۴۷۸)

(۴) اور صاحب بذل المجہود فرماتے ہیں:

دفع تعارض کی ایک توجیہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے یہ بیان ہوئی ہے کہ جن روایات سے پڑھنے کی نفی معلوم ہوتی ہے (جیسا کہ حفص بن عاصم کی روایت ہے) وہ غالب احوال پر محمول ہے یعنی زیادہ تر نہیں پڑھتے تھے، اور جن روایات سے پڑھنے کا اثبات ہوتا ہے (جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے) وہ اس پر محمول ہیں کہ بعض اوقات میں بیان استحباب کے لئے پڑھتے ہوں گے اگرچہ حضر کی طرح تاکید واہتمام کے ساتھ نہ پڑھتے تھے۔

مذکورہ بالا کتب حدیث اور اس کی شروح کے حوالجات سے معلوم ہوگیا کہ اہل علم اور فتاوی کی متفقہ رائے یہ ہے کہ حالت سفر میں سنتوں کے ترک کی اجازت ہے اور حالت نزول میں پڑھنے کی تاکید ہے، چنانچہ ہندوانیؒ فرماتے ہیں:

کما قال الهندوانیؒ: الفعل حال النزول والترک حال السیر.

اور مطلقاً سنتوں کو ترک کرنے کو کسی نے سنت نہیں کہا، لہٰذا جناب مولانا صاحب کا قول ایک روایت کے مطابق درست ہے اور دوسری روایت کی رو سے اور اکابرین دین کی تحقیق کے بھی خلاف ہے، اس لئے درست نہیں، پس اس کو قول آخر نہ سمجھا جاوے، تحقیقی بات وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۶ر جمادی الاخری ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۶ر جمادی الاخری ۱۴۲۳ھ

(۹۴) سوال:- جناب مفتی صاحب! سنن کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) فجر کی سنت بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) فجر کی سنت گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب (۱): - بلاعذر فجر کی سنت بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں۔

كما في "خلاصة الفتاوى": أجمعوا أن ركعتي الفجر قاعدًا من غير عذر لايجوز.

(ج ا ص ۶۱ وکذا فی الدر المختار علی رد المحتار : باب الوتر والنوافل. ج ۲ ص ۱۴)

لہٰذا اگر کسی نے سنت فجر کو بلا عذر بیٹھ کر پڑھ لیا ہو تو اُسے دوبارہ پڑھنا ہوگا پہلی والی دو رکعت نفل ہو جائے گی۔

جواب (۲): - تمام سنن ونوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے، جبکہ گھر میں اس کا انتظام ہو نیز فجر کی سنت کی ادائیگی میں مذکورہ ذیل تین امور کا لحاظ کرنا سنت ہیں:

(الف) گھر میں پڑھنا البتہ بعض سہولت یا طمانیت قلب کے لئے اگر مسجد میں پڑھے تب بھی جائز ہے۔

(ب) پہلی رکعت میں "قُلْ يَآاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" اور دوسری رکعت میں "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" کی قراءت پڑھنی"۔

(ج) صبح صادق طلوع ہونے کے بعد اوّل وقت میں پڑھنا۔

كما في "شرح التنوير": وفي الخلاصة والسنة في ركعتي الفجر ثلاثة إحدٰها أنه يقرأ في الركعة الأولى قل ياايها الكافرون وفي الثانية الإخلاص والثانية أنه يأتي بها أوّل الوقت والثالثة أن ياتي بهما في بيته. (ج ا ص ۲۱)

فقط واللّٰہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲/ ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

بلاعذر سنت مؤکدہ جیسے نماز تراویح بیٹھ کر پڑھنا مکروہ تحریمی ہے

(۱) قبل الجمعہ کی چار رکعت سنت گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟

(۲) بلاعذر سنت مؤکدہ جیسے نماز تراویح بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱) :- گھر میں پڑھنا افضل ہے جبکہ گھر میں اچھا انتظام ہو۔

کمافی "الخلاصة": وكذا سائر السنن حتى الجمعة فإنه لوصلىّ الأربع قبل الجمعة فى البيت وصلى الجمعة فى الجامع يكون سنة. (ج ۱ ص ۴۲)

یعنی تمام سنن اور نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے البتہ گھر میں اگر اچھا انتظام نہ رہے یا دوسرے کام میں مشغول ہو جانے کا خوف ہے تو پھر مسجد میں پڑھنا ہی افضل ہے۔

جواب (۲) :- سنت مؤکدہ کو اہتمام کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے، سستی اور غفلت کرنا درست نہیں پس نمازی اگر قیام پر قدرت رکھتا ہے، تو سنن مؤکدہ کو بیٹھ کر پڑھنا مکروہ تحریمی ہے یہی حکم تراویح کا بھی ہے البتہ عذر کے تحت بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے۔

کما فی "الشامية": لوصلى التراويح قاعدًا قيل لايجوز بلاعذر لماروى الحسن عن أبى حنيفة لوصلى سنة الفجر قاعدًابلاعذر لايجوزفكذا التراويح لأن كلامنهما سنة مؤكدة وقيل يجوز وهو الصحيح والفرق أن سنة الفجر سنة مؤكدة بلاخلاف والتراويح دونها فى التاكيد فلا يجوز التسوية بينهما. (ج ۲ ص ۱۵)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

فَصْلٌ فِیْ سُجُوْدِ السَّهْوِ

(۹۵) سوال :- جناب مفتی صاحب! سجدۂ سہو کے متعلق چند مسائل کی تحقیق مطلوب ہے۔

(۱) امام صاحب نے نماز عشاء کی پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ کو تکرار کیا یعنی پہلے خاموشی سے تقریباً پوری سورت پڑھ لی بعد میں جب احساس ہوا تو جہر کے ساتھ مکمل سورۂ فاتحہ پڑھی اور سجدہ سہو سے نماز ختم کی ہے، نماز میں ایک دوسرے عالم صاحب بھی شریک تھے، انہوں نے کہا صورت بالا میں سجدۂ

سہو واجب نہیں ہوا تھا، ہمیں یہ بات اجنبی معلوم ہو رہی ہے، اب سوال یہ ہے کہ جناب عالم صاحب کی بات کہاں تک درست ہے؟

(۲) سری نماز میں سہوا گر ثناء یا تشہد جہراً پڑھ لیا ہے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

(۳) اگر کسی نے درمیانی قعدہ میں تشہد کے بعد "ربّنا لک الحمد" سہوًا پڑھ لیا ہو تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

(۴) امام صاحب نے نماز کے اندر آیت سجدہ پڑھی مگر سجدہ کرنے سے بھول گیا پھر قعدۂ اخیرہ میں اس کو یاد آیا ہے اب اس کو کیا کرنا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- سورۂ فاتحہ کا اس طرح تکرار کرے کہ لگاتار شروع میں پڑھے تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

كما في "سراجية على هامش القاضي خان": إذا قرأ الفاتحة في الأولين مرتين متواليتين يلزمه سجدتا السهو بخلاف ما إذا قرأ الفاتحة ثم السورة ثم الفاتحة وكذا في القاضي خان. (ج ۱ ص ۵۹)

جواب (۲):- واجب نہیں ہوگا۔

كما في "سراجية على هامش القاضي خان" إذا جهر بالثناء أو التشهد ساهيًا لا شيئ عليه. (باب سجود السهو ج ۱ ص ۷۲)

جواب (۳):- سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

كما في "سراجية على هامش قاضي خان": إذا زاد في التشهد الأوّل ربنا لك الحمد سهوًا لا شيئ عليه ولو زاد قوله اللهم صل على محمد لزمته سجدتا السهو. (ج ۱ ص ۷۲)

لیکن تشہد کے بعد اگر "اللّٰھم صل علی محمد" کے برابر کچھ پڑھا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

جواب (۴):- صورت مسئولہ میں امام صاحب کیلئے آیت سجدہ یاد آنے پر اُسے کر لینا چاہئے پھر سجدۂ سہو کرے اور سلام پھیرے ورنہ نماز کراہت کے ساتھ ہو جائیگی توبہ واستغفار کرے۔

كما في "سراجية على هامش القاضي خان": لو تلا آية سجدة في صلوته ونسيها ثم ذكرها فعليه السهو. (كتاب الصلوٰة: ج ۱ ص ۲۳)

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ	۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

(۹۶) سوال :- جناب مفتی صاحب! سجدۂ سہو کے متعلق چند مسائل کی تحقیق مطلوب ہے:

(۱) امام صاحب نماز عصر کے قعدۂ ثانیہ میں بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد سہواً پانچویں رکعت پڑھ چکے ہیں اب امام صاحب کیا کرے یعنی چھٹی رکعت ملائیگا یا پانچویں رکعت پر سلام پھیر لے اور اسی حالت پر سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

(۲) میں نے نماز عشاء کی پہلی رکعت میں ثناء کی جگہ پر سہواً تشہد پڑھ لیا اور سجدۂ سہو سے نماز ختم کی اب میری نماز درست ہوئی یا نہیں؟

(۳) لاحق اور مسبوق اگر اپنی مابقیہ نماز کی ادائیگی میں کسی قسم کی غلطی کرے تو ان پر سجدۂ سہو واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- واضح رہے کہ نماز عصر کے بعد نوافل پڑھنا مکروہ ہے اس لئے کسی کو اگر ایسی حالت پیش آوے تو پانچویں رکعت پر سلام پھیر لینا ضروری ہے اور صورت مسئولہ میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

کما فی "القاضی خان" : إذا صلی العصر خمسًا وقعد فی الرابعة قدر التشهد قالوا لایضیف إلیها أخری لأن التنفل بعد العصر مکروہ ولاسہو علیہ لفوات محلہ لأنہ اٰخر الصلوٰة وقد انتقل من العصر إلی التطوع ولم یتم التطوع.

(کتاب الصلوٰة فصل فیما یوجب السہو وبما لایوجب ج ۱/ص ۶۱)

جواب (۲):- آپکی نماز درست ہوگئی، ایک مسئلہ یاد رکھیں کہ کسی نے اگر ثناء کی جگہ پر تشہد پڑھ لیا ہو تو اس سے سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا جبکہ یہ موضع دعا ہے، ویسا ہی تیسری اور چوتھی رکعت میں بھی سورۂ فاتحہ کے بجائے تشہد یا اور کوئی دعا پڑھ لی تو بھی سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا۔

کمافی "القاضی خان": إن افتتح الصلوٰة فقرأ التشهد فی قیامہ قبل أن یشرع فی قرأة الفاتحة عامدًا أو ساهیا لاسہو علیہ.

(فصل فیما یوجب السہو ومالایوجد ج ۱ ص ۶۰)

البتہ دوسری رکعت کی شروع میں اگر ایسا ہو تو سجدۂ سہو واجب ہوگا کیونکہ یہ موضع دعا نہیں۔

جواب (۳): -لاحق پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوگا البتہ مسبوق پر واجب ہوگا۔

كما فى "سراجية على هامش القاضى خان": فيما يودى المسبوق لو سجد لسهو مع الإمام ثم سها فيما يقضى فإنه يسجد لسهوه. (ج ا ص ۷۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

(۹۷) سوال: -جناب مفتی صاحب! سجدۂ سہو کے متعلق چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) بدون سلام پھیرنے کے اگر سجدۂ سہو کر لیا ہو تو نماز درست ہوگی یا نہیں؟
(۲) اگر کسی نے سہواً کئی واجب چھوڑ دئے تو اس پر کتنے سجدۂ سہو واجب ہوں گے؟
(۳) امام کے پیچھے مقتدی اگر تشہد نہ پڑھے تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں؟
(۴) میں نے سجدۂ سہو کرنے کے بعد پھر سہواً قعدہ میں سورۂ فاتحہ پڑھ لی پھر سجدۂ سہو کیا، اب میری نماز درست ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱): -سجدۂ سہو کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ ثانیہ میں تشہد پڑھنے کے بعد صرف دائیں طرف سلام پھیرے پھر سجدہ سہو کرے، اب اگر کسی نے سہواً قبل السلام سجدۂ سہو کر لیا تو اس کی نماز درست ہو جائے گی البتہ قصداً ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

كمافى "سراجية على هامش القاضى خان". سجد سجدتين للسهو بعد سلام ولو سجد قبله جاز. (ج ا ص ۱۷)

لہٰذا صورت مسئولہ میں نماز درست ہوگئی آئندہ ایسا نہ کرنا چاہئے۔

جواب (۲): -صرف حسب دستور دو سجدۂ سہو واجب ہونگے ہر ایک ترک واجب پر الگ الگ سجدہ کی ضرورت نہیں۔

کمافی ”سراجیۃ علی ھامش القاضی خان“ : من سھا مرارًا کفته سجدتان .
(باب سجود السهو ج ا ص ۱۷)

جواب (۳):- جماعت کی نماز میں مقتدیوں نے اگر واجباتِ نماز میں سے کسی ایک واجب کو ترک کردیا، تو اس پر سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا البتہ قصدًا ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے، نماز کراہت کے ساتھ ہوجائے گی۔

کمافی ”سراجیۃ علی ھامش القاضی خان“: المقتدی لوسھالم یلزمه سجدة السھو (باب سجود السهو ج ا ص ۷۱)

جواب (۴):- سجدۂ سہو کے بعد پھر سہو ہوجائے تو دوسرا سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔

کمافی ”سراجیۃ علی ھامش القاضی خان“: لوسھامرة وسجدثم سھا لاسھو علیه. (باب سجود السهو ج ا ص ۷۲)

لہٰذا صورت مسئولہ میں نماز درست ہوگئی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۳/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۳/محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

(۹۸) سوال :- جناب مفتی صاحب! سجدۂ سہو کے متعلق چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) امام صاحب اگر چار رکعت والی فرض نماز کے اندر قعدۂ اخیرہ میں تشہد پڑھنے کے بعد سہوًا پانچویں رکعت کیلئے کھڑا ہوجاوے تو مقتدی لوگ اس حال میں کیا کریں گے؟

(۲) سجدۂ سہو کی صورت میں قعدہ اخیرہ کے دونوں جلسوں میں درود شریف پڑھنا ہوگا یا نہیں؟

(۳) کس حالت میں سجدۂ سہو ساقط ہوجاتا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- مقتدی کے لقمہ دینے کے باوجود اگر امام صاحب قعدۂ آخیرہ کے بعد کھڑا ہوگیا تو مقتدی حضرات امام صاحب کے لوٹنے تک بیٹھیں بیٹھیں انتظار کریں یعنی امام صاحب اگر پانچویں رکعت مکمل کرنے سے قبل لوٹ آجاوے تو امام صاحب کے ہمراہ سلام پھیریں گے البتہ امام صاحب اگر پانچویں

رکعت کا سجدہ کر چکا تو مقتدی حضرات امام صاحب کے مزید انتظار کے بغیر سلام پھیر دیں۔

کما فی "سراجیة علی هامش القاضیخان": الإمام إذاقام إلی الخامسة ساهیًا بعد ما قعد قدر التشهد فالقوم لایتبعونه بل ینتظرونه إن عاد قبل أن یقید الخامسة بالسجدة فیسلمون معه وإن لم یعد حتی قید الخامسة بالسجدة فإنهم فیسلمون . (باب سجود السهو ج۲ ص۷۵)

جواب (۲): - دونوں جلسوں میں درود شریف پڑھنا افضل ہے۔

کما فی "القاضیخان": من علیه السهو یصلی علی النّبی صلّی اللّٰه علیه وسلم فی القعدة الأولیٰ فی قول أبی حنیفة رحمة اللّٰه علیه وأبی یوسف رحمة اللّٰه علیه وفی قول محمّد رحمة اللّٰه علیه فی القعدة الثانیة والأحوط أن یصلی فی القعدتین ولایلزمه السهو بتکرار التشهد فی القعدة الثانیة. (ج۱ ص۵۹)

جواب (۳) :- جماعت اگر بڑی ہو مثلاً عید کی جماعت اور سجدۂ سہو سے لوگوں کے اندر تشویش پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو سجدۂ سہو ساقط ہو جائے گا، ویسے ہی نماز کا وقت ختم ہونے کا خوف ہو جیسے فجر کی نماز میں طلوع شمس اور عصر کی نماز میں غروب شمس کا خوف ہو تو بھی سجدۂ سہو ساقط ہو جائے گا۔

کما فی "القاضیخان" : من علیه سجود السهو فی صلوٰة الفجر إذا لم یسجد حتی طلعت الشمس بعد ماقعد قدر التشهد سقط عنه سجود السهو کذا لو سهی فی قضاء الفائتة فلم یسجد حتی احمرت الشمس و کذا فی الجمعة إذا خرج وقتها و کل مایمنع البناء إذا وجد بعد السلام یسقط السهو. (ج۱ ص۶۰)

فقط واللّٰه تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

(۹۹) سوال :- جناب مفتی صاحب! سجدۂ سہو کے متعلق چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) ظہر کی چار رکعت سنت میں اگر سہواً درمیانی قعدہ نہیں کیا تو اس کی نماز درست ہوگی یا نہیں اور اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا یا نہیں؟

(۲) ظہر کی چار رکعت سنت کے اندر قعدۂ اولیٰ میں نمازی تشہد کے بعد دعا و درود پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب منہ الصدق والصواب

جواب(۱) :-اس پر قعدۂ اولیٰ واجب تھا ترک کرنے کیوجہ سے اس پر سجدۂ سہو واجب ہے، لہذا اگر سجدہ سہو کرلیا ہے تو اس کی نماز درست ہوگئی ہے ورنہ نہیں۔

کمافی " المحیط "ولو صلیّ سنة الظهر أربعًا ولم يقعد على راس الركعتين أجزاه من الأربعة كذاههنا وكان الفقيه أبوجعفر النهدوانى رحمه اللّٰه يقول يجزيه عن تسليمة واحدة وبه كان يفتى الشيخ الإمام الجليل أبوبكر محمّد بن الفضل رحمة اللّٰه عليه قال القاضى الإمام أبوعلى النسفى قول الفقيه ألى الجعفر والشيخ الإمام أبى بكر محمّد بن الفضل أقرب إلى الاحتياط فكان الأخذ بالاحتياط أولىٰ فهكذااختار الصدر الشهيد حسام الدين رحمة اللّٰه عليه الفتوى. (ج۲ص۱۳ وكذافى الشامية: ج۲ص۱۱)

جواب(۲) :-نہیں پڑھ سکتا ہے اگر پڑھے گا تو سجدۂ سہو واجب ہوگا۔

کمافی "شرح التنوير" (ولايصلى على النّبى صلى اللّٰه عليه وسلم فى القعدة الأولىٰ فى الأربع قبل الظهر والجمعة وبعدها) ولو صلى ناسيًا فعليه السهو وقيل لاشمنى. (درمختارمع الشامية: ج۲ص۱۶).

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۷ھ

تین تسبیح سے کیا مراد ہیں

(۱۰۰) سوال :-جناب مفتی صاحب دامت برکاتھم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
امید ہے کہ مزاج سامی بخیر وعافیت ہونگے اس وقت محققین حضرات کی کمی نہیں، بلکہ بہت ہیں، مگر صحیح مفتی میں ارباب تحقیق بہت ہی کم ہیں بلکہ ندرت ہے اس لئے ایک دو مسئلہ کے بارے میں آنجناب

کوتکلیف دینے پر مجبور ہو رہا ہوں اور تکلیف دینے کا یہ سلسلہ اگر ناگواری نہ ہو تو آئندہ بھی جاری رہیگا براہ کرم دین کی خاطر معاف فرمادیں۔

بلاوجہ نماز کے اندر تین تسبیح کی مقدار تاخیر ہونے سے سجدۂ سہو واجب ہوجاتا ہے، یہاں دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہاں تسبیح سے ”سبحان اللّٰہ“ مراد ہے یا ”سبحان ربی الأعلی“ یا سبحان ربی العظیم“ پورا جملہ اگر ”سبحان اللّٰہ“ مراد ہو تو طحطاوی علی المراقی: (ص۳۸۶) کی عبارت ”وعلی قیاس ماتقدم أن یعتبر الرکن مع سنته وهو مقدر بثلاث تسبیحات“ سے کھٹکا ہو رہا ہے، کیونکہ نماز کے کسی رکن میں عندالاحناف ”سبحان اللّٰہ“ مسنون نہیں۔

آنجناب سے گذارش یہ ہے کہ مسئلہ کے ہر پہلو پر غور وخوض کر کے دلائل اور مصلحت کی روشنی میں راہنمائی فرماویں۔ ولکم جزیل الشکر.

الجواب ومنه الصدق والصواب

تسبیح میں ”سبحان اللّٰہ“ کہنا مراد نہیں بلکہ تین بار ”سبحان ربّی الأعلی“ یا ”سبحان ربّی العظیم“ کہنا مراد ہے۔

قال ابن عابدين في حاشية على البحر (وقدر الكيثر مايؤدى فيه ركن) أى بسنته كماقيده فى المنية قال شارحها ابن أمير حاج أى بماله من السنة بماهو مشروع فيه من الكمال التى كالتسبيحات فى الركوع والسجود مثلا و هو تقييد غريب ووجهه قريب ولم أقف على التقييد بكونه قصيرًا أوطويلًا اه أى تقييد الركن أى هل المراد منه قدر ركن طويل بسنته كالقعود الأخير أو القيام المشتمل على قرأة المسنون أوقدر ركن قصر كالركوع والسجود بسنته أى قدر ثلاث تسبيحات وبالثانى جزم البرهان الحلبى فى شرح المنية حيث قال وذلك مقدار ثلاث تسبيحات اه فأفاد أن المراد قصر ركن و كانه الأحوط والله أعلم. (منحة الخالق على البحر الرائق. وكذا فى حلبى: ص ۲۱۵)

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

بَابُ سُجُوْدِ التِّلَاوَةِ

ریڈیو، ٹی وی، ٹیپ رکارڈ سے تلاوت سجدہ سننے کا حکم

(۱۰۱) سوال :- جناب مفتی صاحب! تلاوت سجدہ کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) ریڈیو، ٹی وی، ٹیپ رکارڈ وغیرہ پر تلاوت سجدہ سننے سے سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟

(۲) ہمارے درجۂ حفظ میں پانچ سات سال کی عمر والے طلبہ بھی ہیں، وہ کبھی کبھی ہمیں سجدۂ تلاوت کی آیت کا سبق سناتے ہیں اب سوال یہ کہ ان پر اور ہم پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ اور بار بار پڑھنے اور سننے پر کتنے سجدے واجب ہوں گے؟

(۳) پاگل آدمی اگر تلاوت کرے اور دوران تلاوت آیت سجدہ بھی پڑھے اس پر تو سجدہ واجب نہیں لیکن سننے والے پر سجدہ واجب ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱) :- سجدۂ تلاوت واجب ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ آیتِ سجدہ کا سماع کسی قاری سے ہونا ضروری ہے ورنہ سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوگا۔

قال فی "شرح التنویر" (لا) تجب (بسماعه من الصدی و الطیر وفی الشامیة (قوله الصدی) هو ما یجیبک مثل صوتک فی الجبال و الصحاری ونحوهما کما فی الصحاح (باب سجود التلاوۃ ج۲ص ۱۰۸)

پس صورت مسئولہ میں سجدہ واجب نہیں ہوگا البتہ قاری تالی اگر براہ راست ریڈیو، ٹی وی میں تلاوت کررہا ہے اور سامع وہیں بیٹھے یا کھڑے سن رہا ہے تو پھر دونوں پر سجدہ واجب ہوگا۔

جواب (۲) :- نابالغ پر سجدۂ تلاوت واجب نہیں ہوتا خواہ خود پڑھے یا دوسرے سے سنے البتہ نابالغ طلباء سے سننے والے بالغین پر سجدۂ تلاوت واجب ہوگا، اگر جگہ ایک ہی ہے کمرہ ایک ہے تو ایک آیت کو بار بار پڑھنے اور سننے سے ایک ہی سجدہ واجب ہوگا۔

قال فی "شرح التنویر" (فلاتجب علی کافر وصبی ومجنون وحائض ونفساء

قرأ وأوسمعوا) لأنهم ليسوا أهلا لها(تجب بتلاوتهم) يعنى المذكورين (خلا المجنون المطبق) فلاتجب بتلاوته لعدم أهليته.

(درالمختار مع الشامية ج۲ص۱۰۷)

نابالغ بچے اور بچیوں کے پڑھنے پر اگر چہ سجدہ واجب نہیں مگر کبھی کبھی استاذ انکو سجدۂ تلاوت کے لئے کہے تو وہ سجدۂ تلاوت کریں گے ان کو سجدۂ نفل کا ثواب ملے گا اور عادت بھی بنے گی۔

جواب (۳) :- صحیح اور راجح قول کے مطابق مجنون خواہ کیسے ہو اور اس سے تلاوت سجدہ سننے والے پر سجدۂ واجب ہوگا۔

قال فی "شرح التنوير": (خلاالمجنون المطبق) فلاتجب بتلاوته لعدم أهليته ،ولو قصر جنونه فكان يوماً وليلةً أوأقل تلزمه تلاأوسمع ، وإن أكثر لاتلزمه بل تلزم من سمعه على ماحرره ملاّ خسرو لكن جزم الشرنبلالي باختلاف الرواية ونقل الوجوب بالسماع من المجنون عن الفتاوىٰ الصغرى والجوهرة قلت به جزم القهستاني. (درمختار مع شامية: ج۲ص۱۰۸)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ	۲۰ محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

نماز کا سجدۂ تلاوت خارج صلوٰۃ میں ادا نہیں ہوگا

(۱۰۲) سوال :- جناب مفتی صاحب! تلاوت سجدہ کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) نمازی اگر نماز کے اندر آیت سجدہ پڑھے اور سجدہ نہ کرے تو اس کا کیا حکم ہے یعنی بعد نماز اس کی ادا کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) رکوع یا سجدہ میں سجدۂ تلاوت کی نیت سے سجدۂ تلاوت ادا ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- کسی نمازی نے اگر ایت سجدہ نماز کے اندر پڑھا تو اس کا سجدہ نماز کے اندر ہی ادا کرنا

واجب ہوگا، خارج صلوٰۃ اسکی ادائیگی درست نہیں ہوگی۔

قال فی ”شرح التنویر“: ولو تلاها فی الصلوٰۃ سجدها فیها لاخارجها لما مروفی البدائع :وإذا لم یسجد أثم فتلزمه التوبة وقال فی الشامیة (قوله إذالم یسجد أثم) أفادأنه لایقضیها قال فی شرح المنیة وکل سجدة وجبت فی الصلوٰۃ ولم تؤدفیها سقطت أی لم یبقی السجود لها مشروعاً لغوا محله اه
(ج۲ص۱۱۰)

پس خارج صلوٰۃ میں اس کوادا کرنادرست نہیں ہوگا، اب ترک واجب پران کے ذمّہ توبہ کرنا ضروری ہے۔

جواب(۲) :-ایت سجدہ پڑھنے کے بعد اگرفوراً رکوع یاسجدہ کرے توسجدۂ تلاوت ادا ہوجائے گا، ورنہ نہیں اور سجدہ میں نیت کرے یانہ کرے فوراً سجدہ کرنے کی وجہ سے سجدۂ تلاوت ادا ہوجائیگا لیکن یہ احتیاط کے خلاف ہے احتیاط یہی ہے کہ مستقل سجدۂ تلاوت ادا کیا جائے۔

قال فی ”شرح التنویر“:(و) تؤدی (برکوع صلوة)إذاکان الرکوع (علی الفور من قرأة اية) أوایتین وکذا الثلاث علی الظاهر کما فی البحر(إن نواه) أی کون الرکوع (لسجود)التلاوة علی الراجح (و) تؤدی (بسجودها کذالک) أی علی الفور (وإن لم ینو) بالإجماع ولونواها فی رکوعه ولم ینوها المؤتم لم تجزه ویسجد إذاسلم الإمام ویعید القعدة ...... نعم لورکع وسجد لهافوراًناب بلانیة . (درمختار مع الشامیة:ج۲ص۱۱۱)

البتہ ایت سجدہ پڑھنے کے بعد فوراً نماز کاسجدہ کرے توبلانیت بھی سجدۂ تلاوت ادا ہوجائے گا، لیکن اگرمزید تلاوت کے بعد رکوع وسجدۂ صلوٰۃ کیا اس سے تلاوت کاسجدہ ادا نہ ہوگا، بلکہ مستقل سجدۂ تلاوت نماز کے اندر واجب ہے۔

فقط واللہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۲۳رمحرم الحرام ۱۴۲۴ھ	۲۳رمحرم الحرام ۱۴۲۴ھ

بابُ فی مایفسدُ الصلوٰۃَ ویکرَہُ فیھا

فجر اور عصر کے علاوہ دیگر فرائض کے بعد امام صاحب کا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھنے کا التزام مکروہ ہے

(۱۰۴۳)سوال :- کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ فرائض کے بعد امام کے لئے انصراف کا ذکر احادیث سے ثابت ہے سوال یہ کہ انصراف سے کیا مراد ہے؟ دیگر یہ کہ اوقات خمسہ میں سے بعد الفجر والعصر امام صاحب کا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھنا اور تسبیح وتہلیل پڑھنا اکثر ائمہ احناف کے یہاں معمول ہے، لیکن آجکل بعض دینی اداروں میں اوقات خمسہ کے بعد بعض ائمہ صاحبان مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھ جاتے ہیں، ایا یہ احادیث پر عمل ہے یا فقہ پر، اس میں صحیح رائے احناف کے نزدیک کیا ہے؟ کتب احادیث اور فقہ وفتاوی کے حوالہ سے جواب عنایت فرمائے۔ بینوا وتوجروا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِیْنَ أَمَّا بَعْدُ

الجواب ومنہ التوفیق والصواب

جواب تحریر کرنے سے قبل از روئے تمہید حدیث وفقہ کی روشنی میں چند اصول وضوابط لکھ دیتے ہیں تا کہ آسانی کے ساتھ جواب سمجھ میں آسکے۔

(۱)اصول:- احادیث صحیحہ میں فرائض کے اختتام اور سلام کے بعد انصراف کا ذکر ملتا ہے، انصراف کا معنی نماز کے اندر جو ہیئت نمازی کی اور امام کی تھی اس کو بدلنا ہے، خواہ دائیں طرف پھیر کر ہیئت کو بدلے یا بائیں طرف یا مقتدیوں کو سامنے لیکر بدلے، یا پھر ضرورت ہو اپنے گھر چلا جاوے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے، اسی کو اصطلاح شرع میں انصراف کہا جاتا ہے اور احادیث میں انصراف فرائض اور اوقات کے اعتبار سے مختلف پائی جاتی ہیں، دلائل کو ذکر کرتے وقت قارئین کرام خود اس کو محسوس کریں گے۔

اور محدثین کرام وفقہائے عظام نے انصراف کی اِن احادیثِ مختلفہ کے درمیان تطبیق دی ہیں اور انہوں نے فرمایا ہے:

(۲) اصول: - کہ جن فرائض کے بعد سنن راتبہ احادیث سے ثابت ہیں انمیں انصراف کی شکل الگ ہے اور وہ یہ کہ امام سلام پھیر کر " اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَاذَالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ " کے بقدر بیٹھ کر فوری طور پر سنن ونوافل کے لئے کھڑے ہو جاوے، سنن ونوافل کے بعد اگر اذکار واوراد پڑھنا چاہے تو پڑھے، یہی سب سے افضل ہے، فرائض کے بعد متصل سنن راتبہ کو چھوڑ کر اذکار واوراد میں لگ جانا اور بیٹھے رہنا خلاف سنت اور خلاف اولیٰ ہے بلکہ مکروہ ہے۔ کما ھو مصرح فی کتب الفقہ والفتاویٰ.

(۳) اصول: - اور یہ کہ جن فرائض کے بعد سنن راتبہ اور نوافل مسنون نہیں ہیں بلکہ مکروہ ہیں، انمیں انصراف کی مختلف صورتیں ہیں۔

(الف) یہ کہ امام صاحب نماز کے بعد مختصر ادعیہ ماثورہ پڑھ کر دائیں طرف پھیر جاوے۔

(ب) یا بائیں طرف پھیر جاوے۔

(ج) یا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھ جاوے اور فرائض کے بعد جو اذکار واوراد مسنونہ احادیث سے ثابت ہیں ان کو یا ان میں سے جس قدر چاہے پڑھے۔

(د) اور اگر ضرورت وحاجت ہو تو چلا جاوے یا مقتدیوں سے کچھ ضروری مسائل بیان کرنا ہوں بیان کریں۔

یہ سب صورتیں انصراف میں داخل ہیں اب ان اصولوں کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے اصول کی دلائل:

(۱) عن أنس رضی اللّٰہ عنہ أنا أکثر ما رأیت رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم ینصرف عن یمینہ. (نسائی)

(۲) عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یشرب قائمًا وقاعدًا ویصلِّی حافیًا ومتنعلا وینصرف عن یمینہ وعن شمالہ. (نسائی)

(۳) وعن عائشة رضی اللّٰہ عنہا کان النساء یصلین مع رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم الفجر فکان إذا سلم انصرفن متلفعات بمروطھن فلا یعرفن من الغلس. (نسائی)

(۴) عن عائشة رضی اللّٰہ عنہا قالت کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم إذا

سلم لم يقعد إلا بقدر يقول "اللّٰهم أنت السلام ومنك السلام تباركت ياذاالجلال والإكرام" (رواه مسلم)

(۵) عن أنس بن مالك رضي اللّٰه عنه قال صليت مع رسول اللّٰه عليه وسلم وكان ساعة يسلم يقوم ثم صليت مع أبي بكر فكان اذاسلم وثب كانه يقوم من رضف. (مجمع الزوائد ج۲ ص۳۴۴)

(٦) عن عبداللّٰه بن مسعود رضي اللّٰه عنه قال لايجعل أحدكم للشيطان شيئًا من صلوته يرى شيئا أن حقاعليه أن لاينصرف إلاعن يمينه لقد رأيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كثيرًا ينصرف عن يساره.

(بخاري ومسلم كذافي الترمذي، والنسائي).

(۷) عن سمرة بن جندب قال كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إذاصلىٰ صلوٰة أقبل علينا بوجهه.

احادیث مذکورہ میں سے پہلی حدیث میں کہا گیا ہے کہ نماز کے سلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دائیں جانب پھر جاتے تھے، دوسری حدیث میں کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ اکثر دائیں بائیں طرف پھر جاتے تھے۔ تیسری حدیث میں کہا گیا ہے کہ عورتیں بھی دائیں بائیں طرف پھر جاتیں اور چلی جاتی تھیں اور بڑی چادروں کو لپیٹنے کی وجہ سے وہ نہیں پہچانی جاتی تھیں۔ چوتھی حدیث میں کہا گیا ہے کہ سلام کے بعد "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَاذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" کہنے کے وقت سے زیادہ نہیں ٹھہرتے تھے پانچویں حدیث میں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ نماز پڑھی یہ حضرات "اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ تَبَارَکْتَ یَاذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" پڑھنے تک بیٹھتے تھے اس سے زیادہ نہیں بیٹھتے تھے پھر اسطرح کھڑے ہوجاتے جیسے گرم پتھر لگنے سے تکلیف میں کھڑے ہوجاتے۔ چھٹی حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں سے کوئی چیز شیطان کے لئے نہ بناوے کہ نمازی کسی غیر ضروری چیز کو ضروری سمجھنے لگے مثلاً سلام کے بعد صرف دائیں طرف پھرنے کو ضروری سمجھے، دوسری طرف پھرنے کو ناجائز سمجھے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکثر بائیں طرف پھرتے بھی دیکھا ہے۔ ساتویں حدیث میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو دائیں بائیں یا مقتدیوں کو

سامنے لیکر بیٹھ جاتے۔

ان سب حدیثوں کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ آپ ﷺ فرائض کے بعد کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں طرف ہوکر بیٹھ جاتے اور کبھی مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھتے اسی چیز کو حدیث کی اصطلاح میں انصراف کہا جاتا ہے، اس طرح کی اور بھی احادیث پائی جاتی ہیں، جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم کبھی سلام کے بعد گھر تشریف لیجاتے وہیں سنن پڑھتے، فجر وعصر میں آپ ﷺ بیٹھ کر کچھ تعلیم کرتے، ان سب احادیث کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے شراح حدیث اور فقہاء کرامؒ نے اصول قائم کئے ہیں، دوسرے اور تیسرے اصول میں بیان کیا ہے اور دلائل بھی دیے ہیں، اب فقہاء کرام کی تصریحات ملاحظہ فرمائیں:

(۱) کمافی "العمدة" قال أبوحنيفة كل صلوة يتنفل بعدها يقوم ولايتنفل بعدها كالعصر فهو مخيّر الخ. "عمدة القارى شرح البخارى"

یعنی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جن فرائض کے بعد سنن ونوافل ہیں امام صاحب انصراف اسطرح کرے کہ بلا تاخیر سنن ونوافل کے لئے کھڑا ہوجائے اور جن نمازوں کے بعد سنن ونوافل مشروع نہیں وہاں پھر امام صاحب مخیّر ومختار ہے چاہے دائیں جانب مڑ جاوے اور بیٹھ کر تسبیح وتہلیل وادعیۂ ماثورہ پڑھے، چاہے بائیں جانب مڑ جاوے اور تسبیح وغیرہ پڑھے یا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھ جاوے تسبیح وتہلیل ودیگر اذکار پڑھے اور اگر کسی چیز کی تعلیم کرنی ہو وہ کرے اور اگر کوئی حاجت ہو تو اس کے لئے چلا جاوے۔

(۲) کما فی "معارف السنن": ولذا يذكر فقهائنا للإمام أربعة أمور بعدالتسليم (۱) الذهاب إلى الحاجة. (۲) واستقبال القوم واستدبار القبلة (۳) أوالتحول إليهم بالتيامن (۴) والتياسر: (ج۳ص ۱۳۶)

(۳) ملک العلماء علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایۂ ناز کتاب "بدائع الصنائع" میں فرماتے ہیں:

وأما مايستحب للإمام أن يفعله عقيب الفراغ من الصلوٰة فنقول إذا فرغ الإمام من الصلوٰة فلايخلو اماان كانت صلوٰة لاتصلى بعد ها سنة او كانت تصلى بعدها سنة فإن كانت صلوة لاتصلى بعدها سنة كالفجر والعصر فإن شاء الإمام قام وإن شاء قعد مكانه يشتغل بالدعاء لأنها لاتطوع بعدها تين الصلاتين فلابأس بالقعود إلاأنه يكره المكث على هيئته مستقبل

القبلة. لماروی عن عائشة رضی اللّٰه عنها أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم کان إذافرغ عن الصلوة لایمکث فی مکانه إلا مقدار أن یقول "اللّٰهم أنت السلام ومنک السلام تبارکت یاذالجلال والإکرام. …… ولوکانت صلوة تصلی بعدها یکره المکث قاعدًا . (ج ۱ ص ۱۵۹، ۱۶۰)

(۴) وکذافی "غنیة المستملی" إذاتمت …… صلوٰة الإمام فهو مخیرإن شاء انحرف عن یساره وإن شاء انحرف عن یمینه وإن شاء ذهب إلی حوائجه …… إن شاء استقبل الناس بوجهه …… هذاإذالم یکن بحذائه مصلٍ …… وهذاالذی ذکرنا من التخییر الانصراف والجلوس مستقبلاً إذالم یکن بعد الصلوٰة المکتوبة التی تطوع کالفجر والعصر قال فی الخلاصة وفی الصلاة التی لاتطوع بعده کالفجر والعصر یکره المکث قاعدًا فی مکانه مستبقل القبلة انتهی وجه الکراهة مخالفة فعله الذی کان علیه الصلوٰة والسلام یداوم کمایفیده لفظ کان فیما تقدم من الحدیث فإن کان بعدالمکتوبة تطوع یقوم إلی التطوع بلافصل إلامقدار مایقول "اللهم انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذالجلال والإکرام الخ . (ص ۳۳۰، ۳۳۱)

(۵) وکذافی "الطحطاوی علی الدر": قوله واستقبال الناس بوجهه هذاالإمام فی صلوة لیس بعدهاصلوة فهو مخیّرإن شاء انحرف عن یمینه وإن شاء انحرف عن یساره إن شاء ذهب الی حوائجه وإن استقبل الناس بوجهه إذالم یکن بحذائه مصلٍ سواء کان المصلی فی الصف الأوّل أوفی الصف الأخیر فإن استقبال المصلّی مکروه .(ج ۱ ص ۲۶۳، وکذا فی "الهندیه": ج ۱ ص ۷۷، وکذا فی "الشامیة" کتاب الصلوة ، باب شروط الصلوة، مطلب فیمالوزاد علی العدد الوارد فی التسبیح عقیب الصلوٰة : ج ۱ ص ۱۳۱)

ان تمام فقہی عبارات سے جو اصول معلوم ہوئے وہ یہ ہیں:

(۱) جن فرائض کے بعد سنن وتطوّع مشروع ہیں جیسے ظہر، مغرب، عشاء، انمیں تو امام صاحب بلا تاخیر سنن وتطوّع کے لئے کھڑا ہوجاوے صرف بمقدار "اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ الخ"

قعود کی اجازت ہے، اس سے زائد قعود مکروہ ہے اور جن فرائض کے بعد متصل سنن وتطوع مشروع نہیں ہیں جیسے فجر وعصر کی نماز، ان میں امام کو چار باتوں کا اختیار ہے:

(۱) دائیں طرف مڑکر بیٹھے اور تسبیح وتہلیل اوراذ کار مسنونہ ادا کرے۔

(۲) یا بائیں جانب مڑکر بیٹھے اور تسبیح وتہلیل اوراذ کار مسنونہ ادا کرے

(۳) یا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھے تسبیح وتہلیل اوراذ کار مسنونہ ادا کرے یا مقتدیوں کو کچھ وعظ ونصیحت بیان کرنا ہو تو بیان کرے۔

(۴) یا پھر اگر اپنی ضرورت وحاجت ہو اس کے لئے چلا جاوے اور اس بارے میں کتب فقہ وفتاویٰ کی عبارات متفق ہیں۔

خلاصہ بحث اور جواب استفتاء

اوران عبارات سے یہ بھی واضح ہوا کہ پانچوں فرائض کے بعد امام صاحب کا مقتدیوں کو سامنے لیکر بیٹھنے کا جو معمول ودستور بعض علاقوں میں اور بعض اداروں میں موجود ہے ان کا یہ معمول خلاف سنت ہے۔

لہذا ان لوگوں کو چاہئے کہ فقہائے کرام کے ان اصولوں کی پابندی کریں اور اپنی طرف سے اجتہاد اور رائے زنی کا سلسلہ شروع نہ کردیں کیونکہ ایسا کرنے سے بے شمار فتنوں کے دروازے کھل سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کا فہم اور سمجھ عطا فرماوے، آمین۔

ایک اہم شبہ اور اس کا جواب

بعض علماء کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ احادیث کثیرہ میں "فی دُبر صلوٰۃ المکتوبۃ" بہت سی ادعیہ ماثورہ اوراذ کار مسنونہ کا ذکر آتا ہے، جن نمازوں کے بعد سنن وتطوع مسنون ہے اگر متصلا ان میں مشغول ہوجاوے اوراذ کار مسنونہ کو تاخیر کرکے بعد میں پڑھا جاوے تو ان کی بعدیت کس طرح باقی رہے گی، اس اعتبار سے ادعیہ اوراذ کار مسنونہ کو بین الفرائض والسنن پڑھ لینا افضل ہونا چاہئے۔

جواب: یہ کہ احادیث مذکورہ میں فرائض کے بعد جن اذ کار مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کا ذکر آتا ہے ان کو اگر سنن ونوافل کے بعد ادا کیا جاوے تو بھی فرائض کے بعد ہونے کا حکم دیا جائیگا، کیونکہ احادیث میں جسطرح "فی دبر صلوۃ مکتوبۃ" اذ کار مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کا ذکر ملتا ہے اسی طرح فرائض

کے بعد سنن وتطوعات کوادا کرنے کا حکم بھی ملتا ہے، تو فقہائے کرام جو دین کے ماہرین ہیں انہوں نے دونوں طرح کی احادیث کو اسطرح تطبیق دی کہ جن فرائض کے بعد سنن وتطوع کا ذکر ہے ان میں سنن راتبہ اور تطوع کو فرائض کے بعد متصلاً پڑھا جاوے، اذکار مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کو سنن وتطوع کے بعد ادا کیا جاوے، کیونکہ سنن وتطوع توابعِ فرائض میں سے ہیں اور من جنس الصلوٰۃ میں سے ہیں تا کہ سنن وتطوع کی تابعیت وجنسیت کی رعایت ہو اور اذکار مسنونہ کو بعد میں ادا کرنے سے اس کی بعدیت پھر بھی باقی رہتی ہے، بعدیت حقیقی کا لزوم احادیث سے ثابت نہیں، لہذا بعدیت اضافی بھی کافی ہو جائے گی۔

(۱) چنانچہ محقق ابن ہمام نے ''فتح القدیر'' کے اندر اسطرح کے شبہات کے جوابات دیئے ہیں:

قال الکمال: ولم یثبت عنه صلی اللّٰه علیه وسلم، الفصل بالاذکار التی یواظب علیها المساجد فی عصرنا من قرأة اٰیة الکرسی والتسبیحات وأخواتها ثلاثا وثلاثین وغیرها وقوم للفقراء المهاجرین تسبحون وتکبرون، وتحمدون دبر کل صلوٰة الخ. لایقتضی وصلها لفرض بل کونها عقیب السنة من اشتغال بمالیس من توابع الصلوٰة فصح کونها دبرها.

(ج ۱ ص ۱۱۶)

(۲) اسطرح کا جواب ابن ہمام کے شاگرد حلبی نے بھی دیا ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں

وأما ماروی من الأحادیث فی الأذکار عقیب الصلوٰة فلادلالة فیها علی الإتیان بها عقیب الفرض قبل السنة بل یحمل علی إتیان بعد السنة ولایخرجها تخلل السنة بینهما وبین الفریضة عن کونها بعدها وعقیبها لأن السنة من لواحق الفریضة وتوابعها مکملاتها فلم تکن أجنبیة منها.

(حلبی کبیر: ص ۳۳)

مذکورہ بالا عبارتوں میں شبہ کرنے والوں کے شبہ کا بہتریں جواب دیا گیا ہے جس کا خلاصہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا ہے کہ فرائض کے بعد سنن وتطوع کوادا کر کے اذکار مسنونہ کو ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس سے اذکار کی بعدیتِ فرض ختم نہیں ہوتی بلکہ پھر بھی بعدیت باقی رہتی ہے اور سنن وتطوع کا تخلل بین الفرض والاذکار تخلل بشیئی اجنبی نہیں ہوتا بلکہ تخلل بشیئ تابع للفرض ہوتا ہے جبکہ وہ مخل نہیں ہے، لیکن اذکار مسنونہ کو اگر سنن وتطوع سے قبل ادا کیا جاوے تو اسی صورت میں فرائض وسنن کے درمیان تخلل بفاصلہ اجنبیہ لازم آتا ہے، کیونکہ اذکار مسنونہ نہ فرائض کی جنس میں سے

ہیں نہ اس کے توابع اور لواحق میں سے ہیں، نیز سنن وتطوع مکملات فرض ہیں، کیونکہ قیامت کے دن فرائض کے نقصانات کو سنن وتطوعات سے پورے کئے جائیں گے کما فی الحدیث نہ کہ اذکار مسنونہ وادعیۂ ماثورہ سے، اِن فروق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

واللّٰہ الهادی وهو یهدی السبیل وصلّی اللہ علی النّبی الأمی وآلہ أصحابه أجمعین إلی یوم الدین.

کتبہ	الجواب صحیح
محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	بندہ محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
معاون مفتی دار الافتاء	رئیس دار الافتاء
۱۷/جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ	۱۷/جمادی الثانی ۱۴۲۵ھ

❀❀❀

فَصْلٌ فِیْ صَلٰوۃِ الْمُسَافِرِ

سفر میں تابع کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے نہ متبوع کی

(۱۰۴)سوال: - کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص باہر ملک سے اپنے ملک میں اپنے خاندان والوں کے ساتھ جاتا ہے اور خاندان والے اسی ملک میں قیام کی نیت سے رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ انکا پیدائشی ملک ہے، مگر ان میں سے ایک بیٹے کو اسی ملک میں رہنے کا کوئی خیال نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ دوسرے ملک واپس آجانے کی فکر میں رہتا ہے یعنی اُسے اپنے ملک میں قیام کی نیت نہیں ہوتی اور اسی ٹال مٹول میں سال دو سال گذر جاتے ہیں، اب سوال یہ کہ اس شخص پر سفر کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ مسائل سفر میں متبوع کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے، نہ تابع کی نیت کا یعنی متبوع اگر کسی جگہ میں اقامت کی نیت کرلے تو تابع بھی متبوع کی نیت کے لحاظ سے مقیم ہوجائے گا، چاہے تابع اقامت کی نیت کرے یا نہ کرے مثلاً ماں باپ کسی ملک سے اپنے ملک میں واپس آتے ہیں اور اس میں اقامت کی نیت سے غیر ملک سے واپس آجاتے ہیں تو ان کے ساتھ جانے والے بال بچے ان کے تابع ہوکر مقیم رہیں گے۔

چنانچہ صاحب بحر فرماتے ہیں:

”قوله وتعتبر فيه الإقامة والسفر من الأصل دون المتبع الخ“ وليس مراد المصنف قصرا لتبع على هولاء الثلاثة بل هو كل من كان تبعًا لإنسان ويلزمه طاعته فيدخل الأجير مع مستاجره والمحمول مع حامله والغريب مع صاحب الدين الخ. (البحر الرائق: ج۲ ص ۱۳۸)

یعنی جس شخص پر دوسرے کی تابعداری اور اطاعت لازم ہے اور وہ خود مختار و مستقل الرای نہیں وہ تابع ہے اور جس کی رائے سے تابع اوقات گذارتا ہے، کسی ملک میں جاتا ہے وہ اس کا متبوع اور سرپرست ہوتا ہے مثلاً عورت شوہر کی تابع ہوتی ہے، غلام مولیٰ کا تابع ہوتا ہے، اجیر مستاجر کا تابع ہوتا ہے، مامور امیر کا تابع ہوتا ہے اولاد والدین کی تابع ہوتی ہے، یعنی والدین اگر اولاد کے نان ونفقہ کا انتظام

کریں تو وہ اولاد والدین کی تابع گی ورنہ نہیں، چنانچہ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

كمافى "الشامية": (قوله وتلميذ) اى إذاكان يرتزق من أستاده رحمتى والمراد به مطلق المتعلم مع معلمه الملازم له لاخصوص طالب العالم مع شيخه قلت : ومثله بالاولىٰ الابن البار البالغ مع أبيه تأمل. (ج ۲ ص ۱۳۴)

فلہٰذا صورت مسئولہ میں وہ شخص اگر خاندان والوں کا تابع ہو کر اپنے ملک میں آیا ہے، تو وہ اپنے سرپرست کا تابع ہے، خاندان والوں کی نیت کا اعتبار ہے، اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، یعنی وہ بھی مقیم رہے گا، جبکہ خاندان والوں نے اپنے ہی ملک میں مستقل اقامت کی نیت کی نیز جس ملک سے آیا ہے وہ اس کا اپنا ملک نہیں، نہ ماں باپ کا ملک ہے اور جس ملک میں آیا ہے وہ ماں باپ کا ملک ہے اور والدین کے تابع بن کر آیا ہے، فلہٰذا تابع بن کر رہے گا البتہ وہ اگر خاندان والوں کا تابع نہیں بلکہ مستقل الرائی ہے یعنی اس کا گھر، کھانا، پینا، کمائی الگ ہے، تو اس کی نیت کا اعتبار ہوگا یعنی وہ جب دوسرے ملک میں جائیگا جس نیت سے جائیگا اس کا اعتبار ہوگا سفر کی نیت سے جائیگا مسافر ہوگا اور اقامت کی نیت سے جائیگا تو مقیم ہوگا۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۲۳/۱۱/۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۳/۱۱/۱۴۲۷ھ

وطن اصلی میں آدمی ہمیشہ مقیم رہے گا

(۹۰) سوال:- میں جہاں رہتا ہوں وہاں سے اپنا وطن اصلی ۷۰ کیلومیٹر دور ہے اور میرے والد صاحب ڈھاکہ میں نوکری کرتے ہیں، میں جب اپنے جائے سکونت سے ڈھاکہ جاتا ہوں تو کبھی کبھی اپنے وطن اصلی میں ایک دو روز اقامت کرتا ہوں اور گھر میں قصر پڑھتا ہوں اور ڈھاکہ میں بھی والد صاحب کے گھر میں قصر پڑھتا ہوں، اب سوال یہ کہ میرا عمل یعنی اپنے گھر اور ڈھاکہ میں قصر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

کتب فقہ وفتاوی میں مذکور ہے کہ اگر کوئی مسافر دوران سفر اپنے وطن اصلی یا وطن اقامت میں قیام

کرے تو وہ وہاں مقیم ہو جاتا ہے۔

قال فی "شرح التنویر": یبطل (وطن الإقامة بمثله و) بالوطن (الأصلی و) إنشاء (السفر) والأصل أن الشیئ یبطل بمثله وبما فوقه لابما دونه ولم یذکر وطن السکنی وهو مانوی فیه أقل من نصف شهر الخ (در مختار مع شامیة: (ج ۲ ص ۱۳۲)

لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ جب اپنے وطن اصلی اور والد کے وطن اقامت میں قیام کریں گے تو وہاں مقیم رہیں گے، یعنی مقیم کی نماز پڑھیں گے، پس آپ نے جن نمازوں کو قصر کیا ان کی قضا آپ پر ضروری ہیں، واضح رہے کہ آپ کے والد صاحب کا ڈھاکہ میں جو وطن اقامت ہے وہ آپ کے لئے بھی وطن اقامت ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲ر شوال ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲ر شوال ۱۴۲۳ھ

تجاوز عمران مصر اور قریہ متصلہ کی شرعی حیثیت

(۱۰۵) سوال:- جناب مفتی صاحب! بعد سلام مسنون عرض یہ کہ موجودہ زمانہ کے بڑے شہر اور قریہ متصلہ میں سے کوئی آدمی اگر سفر کی نیت سے باہر ہووے تو وہ کہاں سے قصر کرے گا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّابَعْدُ

واضح رہے کہ جواب لکھنے سے قبل اس بارے میں چند باتیں قارئین کرام کے واسطے گوش گذار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ مسئلہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو۔

(۱) شرعی بعض احکام ایسے ہیں جن کا تعلق عرف اور لوگوں کی عادت کے ساتھ خاص ہوتے ہیں یعنی عرف اور عادۃ الناس کے لحاظ سے احکام جاری ہوتے ہیں اور عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں۔

✹ چنانچہ علامہ شامی ""عقود رسم المفتی"" میں لکھتے ہیں:

ثم اعلم أن کثیرًا من الأحکام التی نص علیها المجتهد صاحب المذهب بناء

على ما كان فى عرفه وزمانه قد تغيرت بتغير الأزمان بسبب فساد أهل الزمان أو عموم الضرورة كما قدمناه من إفتاء المتاخرين بجواز الاستئجار على تعليم القرآن وعدم الاكتفاء بظاهر العدالة مع أن ذلك مخالف لما نص على أبو حنيفة ...... فهذه كلها قد تغيرت أحكامها لتغير الزمان إما للضرورة وإما للعرف إما لقرائن الأحوال وكل ذلك غير خارج عن المذهب لأن صاحب المذهب لو كان فى الزمان لقال بها ولو حدث هذا التغير فى زمانه لم ينص على خلافه .

ترجمہ: عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں اس کے بعد یہ بات جاننی چاہئے کہ بہت سے وہ احکام ومسائل جو صاحب مذہب مجتہد نے اپنے عرف اور اپنے زمانہ کے احوال پر بنیاد رکھ کر صراحۃ بیان کئے تھے وہ زمانہ بدلنے کی وجہ سے بدل گئے ہیں اور زمانہ کی تبدیلی یا تو لوگوں میں بگاڑ پیدا ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے یا عام ضرورت پیش آجانے کی وجہ سے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ متاخرین نے تعلیم قرآن پر اجارہ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اور متاخرین نے گواہوں میں ظاہری عدالت کافی نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی تصریح کے خلاف ہیں...... اور ان کے علاوہ دیگر وہ مسائل ہیں جن کا عرف پر مدار رکھا گیا ہے اور ''اشباہ'' میں ایسے بہت سے مسائل ذکر کیئے گئے ہیں، یہ سب وہ مسائل ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدل گئے ہیں اور احکام کی تبدیل کی بنیاد یا تو ضرورت ہے یا عرف وعادت یا قرائن احوال ہیں اور یہ سب بدلے ہوئے احکام فقہ حنفی سے خارج نہیں ہیں، کیونکہ صاحب مذہب اگر اس زمانہ میں ہوتے تو وہ بھی ضرور کہتے اور حالات کا یہ تغیر ان کے زمانہ میں رونما ہو چکا ہوتا تو وہ خود ان احکام کے خلاف تصریح نہ کرتے، خلاصہ یہ کہ عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں نیز زمانہ کی تبدیلی سے احکام میں بھی تبدیلی ہوتی ہیں۔

(۲) حالت سفر میں بعض احکام میں سہولت دی گئی تا کہ بندے کو احکام بجالانے میں تکلیف ومشقت نہ ہو اور اصطلاح شرع میں اسی سہولت کو رخصت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حالت سفر میں رخصت پر عمل کرنا ہی شرعاً مطلوب ہے چنانچہ حدیث میں ہے:

أنه صلّى اللّٰه عليه وسلم لما خير بين القصر والإتمام اختار من ذلك على أمته قالت عائشةؓ ما خير رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم فى أمرين قط إلا أخذ

بأيسرهما مالم يكن إثمًا. (شرح ابن بطال: كتاب الحج باب الصلوٰة بمنى: ج۴ ص ۱۷ طبع دار الكتب بيروت)

(۳) سفر کے احکام جاری ہونے کا دارومدار خروج از علاقۂ خود اور دخول در علاقۂ خود ہے یعنی آدمی جب سفر شرعی کی نیت سے اپنے گاؤں یا شہر سے نکل جاوے تو وہ شرعاً مسافر ہو جائیگا پھر جب اپنے علاقہ میں آجاوے تو مقیم ہو جائے گا۔

✵ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وإذا ضربتم في الأرض فليس عليكم جناح أن تقصروا من الصلوٰة.

(نساء: اية، ۱۰۱)

✵ حدیث شریف میں ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال سافرت مع رسول الله عليه وسلم ومع أبي بكر وعمر رضي الله عنهم كلهم صلى من حين يخرج من المدينة إلى أن يرجع إليها ركعتين في المسيرة والقيامة بمكة رواه أبويعلى والطبراني وقال الهيثمي رجال أبي يعلى رجال الصحيح.

(بحواله أوجز المسالك كتاب الصلوة/ ما يجب فيه قصر الصلاة: ج ۳ ص ۱۰۶)

✵ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لاأعلم أن النبي صلّى الله عليه وسلم قصر في سفر من أسفار إلا بعد خروجه من المدينة.

عن ابن عمر أنه كان يقصر الصلوٰة حين يخرج من بيوت المدينة ويقصر إذا رجع حتى يدخل بيوتها.

(باب في كم يقصر الصلاة (مصنف عبدالرزاق. ج ۲ ص ۵۳۰)

مذکورہ بالا دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے احکام جاری ہونے کا دارومدار خروج از علاقۂ خود اور دخول در علاقۂ خود کے ساتھ ہے، ان نصوص میں تجاوز عمران قریہ اور تجاوز فناء شہر وغیرہ کی شرط کا ذکر نہیں، اس لئے بعد میں صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہوا، چنانچہ ان کے چار مذاہب (۱) ہو گئے مگر اس بارے میں مذہب راجح یہ

---

(۱) پہلا مذہب: ـ حضرت ابن عمرؓ، علقمہؒ، اسودؒ، عامرؒ بن میمون، عطاءؒ، سلیمانؒ بن موسیٰ، ابوبصرہ غفاری وغیرہم کا مذہب یہ ہے کہ آدمی جب سفر کی نیت سے اپنے گھروں سے نکل جاوے تو وہ مسافر ہو جائے گا،

چاہے اپنے گاؤں یا شہر سے باہر نکلے یا نہ نکلے۔ چنانچہ:

(۱) عن ثوبان بن أبی فاختة قال خرجت مع أبی وعلقمة والاسود وعمر وبنمیمون فقصروا حین خرجوا من البیوت (مصنف عبدالرزاق ج۲ ص ۵۳۱)

جوکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے اور یہ کہ آدمی جب سفر کی نیت سے نکلے تو اپنے علاقے کے آبادی سے گذرنے کے بعد مسافر ہوگا، اس سے قبل نہیں۔ چنانچہ:

عن علی أنه لما خرج من البصرة یرید الکوفة صلی الظهر أربعًا ثم نظر إلی خص أمامه وقال لوجاوزنا الخص صلینا رکعتین.

---

(۲) عن سلیمان بن موسیٰ قال إذاخرج الرجل من بیته ذاهبًا لوجهه فلم یخرج من القریة حتی حانت الصلوٰة فلیقصر ها وکذالک إذا دخل القریة مراجعًا من سفره ثم حانت الصلوٰة فلیقصر حتی یدخل بیته.

(مصنف عبدالرزاق ج۲ ص ۵۳۲)

(۳) روی عبید ابن جبیر قال رکبت مع أبی بصرة الغفاری فی سفینة من الفسطاط فی شهر رمضان فدفع ثم قرب غذاؤه فلم یجاوز البیوت حتی دعا بالسفرة ثم قال اقترب قلت الست تری البیوت ؟ قال أبوبصرة أترغب عن سنة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فأکل رواه ابوداؤد.

(بحواله مغنی لابن قدامة ج۲ ص ۹۷)

(۴) عن عطا أنه قال إذادخل علیه وقت الصلوٰة بعد خروجه من منزله قبل أن یفارق بیوت المصر یباح له القصر. (باب متی یقصر المسافر، بذل المجهود ج۲ ص ۲۳۱)

دوسرا مذہب: - حارث بن ابی ربیعہ اور بعض تابعین کا مذہب ہے وہ یہ کہ آدمی جب سفر کی نیت کرلیوے تب ہی وہ مسافر ہوجائے گا چاہے اپنے گھر سے نکلے یا نہ نکلے۔ چنانچہ:

(۱) روی عن الحارث بن أبی ربیعة أنه أراد سفرًا فصلی بالجماعة رکعتین فی منزله وفیهم الاسود بن یزد وغیرواحد من أصحاب بن مسعود.

(بحواله تفسیر قرطبی: ج۵ ص ۳۵۶)

(۲) قال بعض التابعین أنه یجوز أن یقصر من منزله. (مرقات: ج۳ ص ۲۲۴)

تیسرا مذہب: حضرت مجاهد (تابعی) رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور یہ کہ آدمی اگر صبح کو سفر کی نیت سے نکلے تو رات سے مسافر ہوگا اور اگر رات کو نکلے تو صبح سے مسافر ہوگا۔

(۱) روی عن مجاهد أنه قال إذا خرجت مسافرًا فلاتقصر الصلوٰة یومک ذلک إلى الليل وإذا رجعت ليلاً فلاتقصر ليلک حتى تصبح.
(بحواله مغنى لابن قدامه. ج۲ص۹۷)

(۲) عن مجاهد أنه كان إذا خرج نهارً...... لم يقصر حتى يدخل الليل وإن خرج ليلا لم يقصر حتى يدخل النهار. (تفسير مظهرى ج ۲ص۲۱۵)

چوتھا مذہب: حضرت علیؓ کا مذہب ہے جو کہ جواب میں بالتفصیل مذکور ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس بارے میں آپ صلّی اللہ علیہ وسلم سے واضح وقطعی قول یا فعل نہ ہونے کی وجہ سے صحابۂ کرام اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے درمیان اختلاف ہوا اور ائمۂ احناف نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث پر بنا کر کے تجاوزِ عمرانِ قریہ اور تجاوزِ فناءِ شہر وغیرہ کی شرط کو معیار قرار دیا ہے۔

چنانچہ صاحب بدائع علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والثالث: الخروج من عمران المصر فلايصير مسافرًا بمجرد نيّة السفر مايخرج من عمران المصر وأصله ماروى عن على رضى الله عنه أنه لماخرج من البصرة يريد الكوفة صلى الظهر أربعًا ثم نظر إلى خص أمامه وقال لوجاوزنا الخص صلينا ركعتين الخ. (فصل فى بيان مايصير به المقيم مسافرًا: ج ۱ص۹۴، وكذفى كبيرى: ص ۵۳۶، وكذافى فتح القدير: ج ۲ص۸، وكذافى البحر: ج۲ص۱۲۸)

بظاہر فقہاء کرام کی عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تجاوزِ عمران مصر سے قبل سفر کے احکام جاری نہیں ہوں گے چاہے مصر بڑا ہو یا چھوٹا اب ملاحظہ فرمائیے کہ تجاوزِ عمرانِ مصر کا اصل مقصد کیا ہے؟

تجاوز عمران مصر کی حقیقت کیا ہے؟

ماقبل میں گذر چکا ہے کہ سفر کا تعلق خروج از علاقۂ خود اور دخول در علاقۂ خود کے ساتھ خاص ہے اور عمران مصر کے ساتھ خروج کا بڑا تعلق ہے کیونکہ اس کے تجاوز کئے بغیر خروج از علاقہ خود کا تحقق نہیں ہوتا ہے، چنانچہ:

✵ صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں:

فيه دلالة ظاهرة على معنى الباب أن القصر ابتداءه من حين يخرج المسافر

من بلده والخروج من البلد إنما يتحقق بمفارقة بيوته وعمرانه .والله تعالىٰ اعلم بالصواب.

(باب القصر إذا فارق البيوت (ج۷ ص۲۹۵)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

ولأن اللّٰه تعالىٰ أباح القصر فى السفر والسفر مشتق من الأسفار وهوالخروج عن الوطن وقيل بل سمى سفرًا لأنه يسفرعن أخلاق السفر والمقيم فى بلده وإن خرج من منزله لايسمىّ مسافرًا لأن المقيم قد يخرج من منزله للتصرف فى أشغاله وإن لم ينو سفرًا فكذالک إذاانتقل من أحد طرفى البلد إلى الطرف الآخر لم يسم مسافرًا لأنه قد نسب إلى البلد بالمقام فى الطرف الذى انتقل إليه كماينسب إليه بالمقام فى الطرف الذى انتقل عنه وإذالم ينطلق اسم السفر عليه قبل مفارقته ببلده لم يجز له القصرلعدم الشرط المبيح له.

(باب صلوة المسافر ، الحاوى الكبير: ج ۲ ص ۳۶۹)

تو تجاوز عمران مصر کی اصل حقیقت یہ ظاہر ہوئی کہ خروج از مصر اور خروج از قریہ ہے یعنی عمران کے تجاوز سے قبل ”الخروج عن المصر و القرية“ کا تحقق نہیں ہوتا، کیونکہ آدمی بسا اوقات اپنی ضرورت کے لئے بھی علاقہ میں گھومتے ہیں لوگ اُسے مسافر نہیں سمجھتے ہیں، البتہ جب آبادی سے نکل جاتے ہیں تو عرف میں اس کو مسافر کہتے ہیں، اور یوں پوچھتے ہیں کہاں کا سفر ہے، اس لئے فقہائے کرام نے اس طرح شرط کو ملحوظ رکھا کہ جب اپنے علاقہ سے نکل جاوے تو مسافر ہوگا اور اس کا معنی یہ نہیں کہ شہر جتنا بڑا ہو اس کے اندر آدمی مسافر نہیں ہوگا بلکہ تجاوزِ عمران کے بعد مسافر ہوگا۔

نیز فقہائے کرام نے جس وقت اس شرط کو عائد کیا اس وقت کی حالت وعرف اور موجودہ حالت و عرف میں بڑا فرق آگیا کہ اس وقت کے گاؤں اور شہروں کی کیفیت اور تھی یعنی لوگوں کی آبادیاں کم تھیں، گاؤں دور دور ہوتے تھے، دونوں گاؤں کے درمیان تھوڑی تھوڑی آبادیاں اور مزارع، زمین حائل ہوتی تھیں اور شہر بھی چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے بخلاف موجودہ زمانہ کے، کیونکہ لوگ روز بروز زیادہ ہوتے رہتے اور گاؤں، بستیاں ایسی گنجان ہوگئیں کہ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے متصل ہوگیا، دو علاقے کے درمیان خالی جگہ بہت کم ہی رہ گئی، ویسے ہی شہر بھی بڑے بڑے ہونے لگے بعض شہر تو طول وعرض میں چالیس و پچاس میل کے یا اس سے بڑا ہوگئے، تو ظاہر بات یہ ہے کہ فقہاء کرام کے زمانہ کے عرف اور

موجودہ عرف میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور اصول فقہ کے قاعدہ کے مطابق عرف کے بدلنے سے احکام بدلتے ہیں پس ایسے حالات میں اتصال بین البلدتین اور انفصال بین البلدتین کے وہی اصول نہ ہوں گے۔

انفصال اور اتصال کا معیار اور ان کا اصول

اس دور کے دوگاؤں اور دوشہروں کے درمیان انفصال اور اتصال کے فرق کی نوعیت بدل گئی، یعنی پہلے زمانہ میں بین القریتین اور بین البلدتین کا فرق مزارع کا ہونا، نالی زمین کا درمیان میں ہونا قرار پاتا تھا، جس وجہ سے فقہاء کرام نے وجود مزرعۃ، قدر غلوہ، طول سکہ وغیرہ کو معیار ٹھہرایا اور بعض نے تو تھوڑے انفصال کا بھی اعتبار کیا ہے۔ چنانچہ:

(۱) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حاوی کبیر میں فرماتے ہیں:

فأماإذا كان فى قرية متصلة بقرية أخرى فإن كان بين القريتين انفصال ولو كان بزراع جازله القصرإذا فارق بنيان قريتة الخ (ج۲ص۳۷۰)

(۲) امام ابومعالیؒ فرماتے ہیں:

انفصاله ولوبزراع ويعتبر فى مساكين القصور والبساتين مفارقة مانسبوا إليه عرفًا. (مبدع شرح المقنع: ج ۲ص۱۱۶)

(۳) حاوی کبیر کی دوسری جگہ میں فرماتے ہیں:

ويعتبر مع مجاوز ة المرافق مجاوز ة عرض الوادى أن سافرفى عرضه ومجاوزة المهبط إن كان فى ربو ة (مرتفع) والمصد إن كان فى وهدة (منخفض)هذا إن كان اعتدلت الثلاثة (الوادى والمهبط والمصعد) فإن اتسعت اكتفى مجاوزة الحِلّة عرفًا. (ج۲ص۳۲۹)

مذکورہ بالاعبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے دوگاؤں اور شہروں کے درمیان فرق وتمیز کرنے والی چیز انفصال بالمزارع والاراضی تھا، مگر موجودہ زمانہ اور عرف میں بین القریتین والبلدتین تمیز کرنے والی چیز اپنے اپنے علاقے کی حدودِ قانونی اور مقررہ نشانات ہیں یعنی ہر علاقے کے الگ الگ سرکاری کاغذات اور احکامات اور عملاء ہوتے ہیں، جن سے علاقے کے احکام عملاء اور مرافقین کے اسامی اور ان کے حقوق اور ان کے وظائف الگ الگ متعین ہوتے ہیں۔

خلاصۂ بحث اور جواب استفتاء

کہ عرف بدلنے سے احکام بدلتے ہیں اور فقہاء کرام کے عرف اور موجودہ عرف میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوگئیں ہیں، پس موجودہ حالات میں انفصال بین القریتین و البلدتین کے لئے نہ مزارع کا ہونا شرط ہے، نہ خالی زمینوں کا ہونا لازم ہے، بلکہ حکومتی سطح میں بلدیاتی حدود قانونی اور اس کی مقرر کردہ علامات اور نشانات کو بین القریتین والبلدتین کا حد فاصل قرار دیا جانے لگا ہے، مثلاً فلاں شہر فلاں علامت تک یا فلاں حدود سے فلاں حدود تک اور فلاں قریہ فلاں حدود سے فلاں حدود تک اور فلاں گاؤں کی انتہاء فلاں نشانی تک ہے۔

لہٰذا آدمی جب بڑے شہر یا قریۂ متصلہ سے سفر کی نیت سے نکلے گا تو وہ اپنے علاقہ کی حدودِ مقررہ سے نکلنے والا کہلائے گا کہ وہ اپنے علاقہ سے نکل چکا ہے یعنی وہ مسافر ہوجائے گا، پھر جب بھی اپنے علاقہ کی حدود مقررہ میں واپس آئے گا تو اپنے علاقہ کی حدودِ مقررہ میں داخل ہوگیا کہا جائے گا یعنی وہ مقیم ہوجائیگا، مثلاً محمد پور ایک علاقہ ہے اور اس سے متصل عظیم پور اور ایک علاقہ ہے، تو محمد پور والے جب سفر کی نیت سے باہر ہوجاوے یعنی محمد پور چھوڑ کر عظیم پور میں داخل ہوجاوے تو وہ مسافر ہوجائے گا، اسی طرح قریۂ متصلہ میں بھی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۷/رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۷/رجب المرجب ۱۴۲۳ھ

* * *

بَابٌ فِی الْجُمُعَةِ

جمعہ کے روز نماز ظہر کی جماعت مکروہ ہے

(۱۰۶) سوال:- جناب گذشتہ جمعہ کو ہم چند افراد کی نماز جمعہ جامع مسجد میں نہ مل سکی اور ہم میں سے ایک حافظ قرآن بھی تھا، تو ہم نے حافظ صاحب سے کہا کہ جناب آپ جامع مسجد کے سوا دوسری جگہ ہمیں جمعہ کی نماز پڑھا دیجئیے اور اس کی امامت فرمائے یعنی خطبہ سمیت جمعہ کی نماز پڑھا دیجئے، پھر حافظ صاحب نے مسجد سے قریب ایک فرقانیہ مدرسہ میں جا کر ہمیں جمعہ کی نماز پڑھادی اور ہم نے ان کی اقتداء میں نمازِ جمعہ ادا کی، اب سوال یہ کہ ہمارا ایسا کرنا از روئے شرع کیسا ہوا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جن کی نماز جمعہ فوت ہو جاوے اگر دوسری جامع مسجد میں جمعہ ملجاوے تو وہاں جا کر ادا کریں اور وہاں تک پہنچنا دشوار ہو، تو فرداً فرداً نماز ظہر ادا کیجاوے، قریبی جگہ میں نماز ظہر کی جماعت ثانیہ مکروہ ہے، البتہ جس جگہ پر نماز جمعہ کے لئے شرائط موجود ہونے کی وجہ سے جمعہ واجب ہے اس علاقہ میں نماز جمعہ کی دوسری جماعت دوسری جگہ میں درست ہے، مسجد میں نماز جمعہ زیادہ ثواب کا باعث ہے، ورنہ میدان یا کسی مکان میں بھی عذر کی بناء پر نماز جمعہ جائز ہے، لہٰذا آپ لوگوں کی نماز جمعہ ہوگئی ہے، بلا عذر ایسا کرنا مکروہ ہے۔

کما فی "الخلاصة" : ویکره لهم أداء الصلوٰة بالجماعة و کذا المسافرون فی المصر و أهل السجن الکل فی الأصل و فی الأجناس و کذا فاتتهم الجمعة یصلون فرادی کالمسافرین فی المصر. (ج ۱ ص ۲۱۰)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۰ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۰ صفر المظفر ۱۴۲۷ھ

جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں

(۱۰۷)سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے خطیب صاحب نے کہا کہ جمعہ کی کل ۱۸ ارکعتیں ہیں یعنی دخول المسجد دو رکعت، تحیۃ المسجد دو رکعت، قبل الجمعہ چار رکعت سنت، خطبہ کے بعد دو رکعت فرض، بعد الجمعہ چار رکعت سنت، آخری ظہر چار رکعت سنت، اب سوال یہ ہے کہ جمعہ کی کل کتنی رکعتیں ہیں اور ان میں سے سنت مؤکدہ کتنی رکعتیں ہیں اور غیرہ مؤکدہ کتنی رکعتیں ہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جمعہ کی کل ۱۲ (بارہ) رکعتیں ہیں یعنی دو رکعت فرض اور باقی دس رکعتیں سنت ہیں اور جمعہ کی سنت مؤکدہ بلا اختلاف آٹھ رکعتیں ہیں یعنی قبل الجمعہ چار رکعتیں اور بعد الجمعہ چار رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعت کے بارے میں شیخین کے درمیان اختلاف ہے کہ امام اعظم صاحب کے نزدیک سنت مؤکدہ نہیں اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، لہٰذا احتیاط یہ ہے کہ بعد الجمعہ چار کے بعد مزید دو رکعت پڑھی جاوے۔

(۱)قال فی الفتح . فهذا البحث يفيد أن السنة بعد الجمعة ست وهو قول أبی يوسف وقيل قولهما وأمّا أبو حنيفة رحمة اللّٰه عليه فالسنة بعدها عنده أربع اخذًا بما روی عن ابن مسعود أنه يصلی قبل الجمعة أربعًا بعدها أربعًا قال الترمذی فی جامعه وإليه ذهب ابن المبارك والثوری . (ج۲ ص۳۹)

(۲) وفی "كبيری": وعندأبی يوسف رحمة اللّٰه عليه السنةبعد الجمعة ست ركعات وهو مروی عن علی رضی اللّٰه عنه والأفضل أن يصلی أربعًا ثم ركعتين للخروج من الخلاف. (ص۳۷۲)

چنانچہ کبیری کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ بعد الجمعہ چھ رکعتیں پڑھنا ہی افضل ہے تاکہ اختلاف سے دور رہے، واضح رہے کہ دخول المسجد اور تحیۃ الوضوء نفلی نمازیں جمعہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جب بھی وضو سے فارغ ہووے (چاہے گھر میں ہو یا مسجد میں) اور مسجد میں داخل ہووے تو دو رکعت نفل پڑھنا احناف کے نزدیک مستحب ہے، بشرطیکہ مکروہ وقت نہ ہو، اس واسطے خطیب صاحب کا کہنا نماز جمعہ ۱۸ رکعتیں ہیں غلط ہے۔

فقط واللہ علم بالصواب

الجواب صحیح کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ معاون مفتی دارالافتاء

۱۲/ذی الحج ۱۴۲۳ھ ۱۲/ذی الحج ۱۴۲۳ھ

خطبۂ جمعہ کے متعلق بعض سوالات

(۱۰۸) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک مولانا صاحب نے کہا: کہ جمعہ کے خطبہ کا حکم نماز کی طرح ہے یعنی اس میں بھی سلام، کلام، کھانا، پینا، وغیرہ تمام چیزیں حرام ہیں جس طرح نماز کے اندر حرام ہیں، اب سوال یہ کہ مولانا صاحب کی بات کہاں تک درست ہے اور مذکورۃ الذیل سوالات کے جوابات فقہ حنفی کی روشنی میں مطلوب ہیں۔

(۱) حالت خطبہ میں سلام اور چھینکنے والے کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) حالت خطبہ میں دینی کتب بینی تسبیح تہلیل وغیرہ امور جائز ہیں یا نہیں؟

ایک مولانا صاحب نے بحوالہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے کہا کہ خطبہ کی آواز اگر مسموع نہ ہو تو، تسبیح تہلیل وغیرہ جائز ہیں، اب سوال یہ کہ ان کی بات کہاں تک درست ہے؟

(۳) خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی سنتے وقت درود شریف پڑھنا واجب ہے یا نہیں؟ اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی سنتے وقت ''رضی اللہ عنہ پڑھنا'' کیسا ہے؟

(۴) حالت خطبہ میں زبانی جواب دیئے بغیر صرف ''سر'' یا ''ہاتھ'' کے اشارہ سے کسی سائل کا جواب دینا جائز ہے یا نہیں؟

(۵) عیدین، نکاح، وعظ وغیرہ کے خطبہ پڑھتے وقت بھی جمعہ کی طرح استماع واجب ہے یا نہیں اور جمعہ کے دونوں خطبہ واجب ہیں یا نہیں؟ ہمارے یہاں رواج ہے کہ خطبہ ثانیہ کے وقت پیسے کا بکس چلایا جاتا اور لوگ اس میں پیسے ڈالتے ہیں، یہ کام کہاں تک درست ہے؟ (۶) ایک آدمی کا خطبہ پڑھنا اور دوسرے کی امامت کرنا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جمعہ کا خطبہ ایک مستقل عبادت ہے اسکا استماع اور انصات (یعنی کان لگا کر اس کو سننا اور خاموش رہنا) واجب ہے، اس وقت دوسرے کسی مشغلہ میں مشغول ہونا حرام ہے، چاہے وہ عبادات ہوں جیسے

نفلی نماز، تلاوت قرآن، تسبیح تہلیل وغیرہ یا امر دنیوی جیسے کھانا، پینا، سلام، کلام وغیرہ سب چیزیں ممنوع ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

إذا خرج الإمام لاصلوٰة ولا كلام الخ.

لہٰذا جناب عالم صاحب کی بات درست اور صواب ہے کہ جمعہ کا خطبہ حکماً نماز کی طرح ہے یعنی اس میں بھی بعض وہ امور حرام ہیں جو نماز کے اندر حرام ہیں۔

چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

(وكل ماحرم في الصلوة حرم فيها) أي في الخطبة خلاصة.

(الدر المختار مع الشامية: ج۲ ص ۱۵۹)

جواب (۱): - حالت خطبہ میں سلام، کلام اور چھینکنے والے کا جواب دینا ناجائز ہے۔

كما في "شرح التنوير": فيحرم أكل وشرب وكلام ولوتسبيحًا أورد سلام أوأمر بمعروف بل يجب عليه أن يستمع ويسكت.

(الدر المختار مع الشامية: ج ۲ ص ۱۵۹)

جواب (۲): - حالت خطبہ میں کھانا، پینا، تسبیح وتہلیل وغیرہ تمام چیزیں ناجائز ہیں، خطبہ کے وقت خاموش رہنا اور کان لگا کر خطبہ کا سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، اس وقت دوسرے مشغلے حرام ہیں، اگرچہ خطبہ کی آواز مسموع نہ ہو۔

كما في "شرح التنوير": بل يستمع ويسكت (بلافرق بين قريب وبعيد) في الأصح محيط الخ. (درمختار مع شامية ۲ ص ۱۵۹)

وفي الشامية: (قوله وكان أبويوسف) هذا مبني على خلاف الأصح المتقدم قال في الفيض ولوكان بعيدًالايسمع الخطبة ففي حرمة الكلام خلاف وكذا في قرأة القرآن والنظر في الكتب وعن أبي يوسف أنه كان ينظر في كتابه ويصحه بالقلم والأحوط السكوت وبه يفتى. (ج۲ ص ۱۵۹)

لہٰذا جناب عالم صاحب کی بات درست نہیں یعنی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول مفتی بہ نہیں۔

جواب (۳): - خطبہ کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی سنتے وقت درود شریف پڑھنے کے جواز وعدم جواز کے متعلق فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے کہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک درود شریف پڑھنا ممنوع ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے لیکن عدم جواز پر فتویٰ ہے یعنی زبان سے درود شریف پڑھنا درست نہیں، البتہ دل دل میں درود شریف پڑھنا درست ہے جب

آپ ﷺ کا اسم گرامی آجاوے یہی افضل ہے۔

اسی طرح خطبہ کے دوران صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اسماء گرامی سنتے وقت بلند آواز سے رضی اللہ عنہ پڑھنا مکروہ ہے۔

(۱) كما ذكره ابن همام في "الفتح" فرع بعضهم قول أبي حنيفة أنه لا يصلي على النبي صلّى الله عليه وسلم عند ذكره في الخطبة وعن أبي يوسف ينبغي أن يصلي في نفسه لأن ذلك لا يشغله عن سماع الخطبة فكان إحرازًا للفضيلتين وهو الصواب. (ج ۲ ص ۳۹ وكذا في الشامية: ج۲ ص ۱۵۹)

(۲) قال الحصكفيؒ: وأما يفعله المؤذنون حال الخطبة من الترضي ونحوه مكروه اتفاقًا تمامه في البحر. (درمختار مع شامية: ج ۲ ص ۱۶۰)

جواب (۴):- خطبہ کی حالت میں ضرورت کے تحت صرف سر یا ہاتھ کے اشارہ سے کسی سائل کا جواب دے سکتا ہے، بلا ضرورت ایسا کرنا جائز ہے۔

كما في "شرح التنوير". والأصح أنه لا بأس بان يشير برأسه أو يده عند رؤية منكر. (درمختار مع شامية: ج۲ ص ۱۵۹)

جواب (۵):- خطبۂ جمعہ کے علاوہ خطبۂ عیدین، خطبۂ نکاح وغیرہ سب کا خطبہ سننا بھی واجب ہے۔

قال في "شرح التنوير": كذا الاستماع لسائر الخطب كخطبة نكاح وخطبة عيد وختم على المعتمد. (درمختار مع شامية: ج۲ ص ۱۵۹)

جواب (٦):- جمعہ کا خطبہ اور اس کی امامت ایک آدمی کا انجام دینا بہتر ہے البتہ ضرورت کے تحت ایک آدمی کا خطبہ دینا اور دوسرے کا امامت کرنا بھی جائز ہے۔

كما في "شرح التنوير مع الشامية:": (لا ينبغي أن يصلي غير الخطيب) لأنها كشيئ واحدٍ فإن فعل بأن خطب صبي بإذن السلطان وصلى بالغ جاز.

(ج۲ ص ۱٦۲)

فقط والله تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذی الحج ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۲/ ذی الحج ۱۴۲۳ھ

بعد الجمعہ چھ رکعتیں سنت ہیں

(۱۰۹) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایک سلفی عالم صاحب نے کہا کہ بعد الجمعہ والی چار رکعت سنت اگر مسجد میں پڑھی جائے تو چار رکعت ہی پڑھنی ہوگی، البتہ گھر جا کر پڑھے تو دو رکعت بھی درست ہے، اب سوال یہ کہ عالم صاحب کی بات کس قدر درست ہے؟

الجواب منہ الصدق والصواب

جناب عالم صاحب کی بات اپنی جگہ پر درست ہے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے لیکن کتب فقہ و فتاویٰ حنفیہ میں صاف لکھا ہے کہ بعد الجمعہ امام صاحب کے نزدیک چار رکعتیں سنت ہیں، یہ بھی حدیثوں سے ثابت ہے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جمعہ کی سنت چھ رکعتیں ہیں، یہ بھی حدیثوں سے ثابت ہے، احناف نے تحقیق کر کے چار اور چھ فرمایا ہے، لہٰذا دو رکعت کافی نہیں ہوگی، گھر جا کر پڑھے تو بھی چار یا چھ رکعتیں پڑھنی ہوگی، حضرت ابن عمر کا عمل چونکہ حضور ﷺ کے عمل کے مخالف اور معارض ہے اس لئے ان کے عمل کی پیروی کرنے سے حضور ﷺ کے عمل پر چلنا اولیٰ و افضل ہوگا۔

كما في "فتح القدير": فهذا البحث يفيد أن السنة بعد هاست وهو قول أبي يوسف وقيل قولهما وأمّا أبو حنيفة فالسنة بعدها عنده أربع أخذًا بما روى عن ابن مسعود أنه كان يصلى قبل الجمعة أربعًا وبعدها أربعًا قاله الترمذى فى جامعه وإليه ذهب ابن المبارك والثورى وفى صحيح مسلم عن أبى هريرة عن النّبى صلى اللّٰه عليه وسلم وإذا صلى أحدكم الجمعة فليصل بعدها أربع ركعات الخ. فقط واللّٰه تعالىٰ أعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۲؍ ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

بَابُ الْعِیْدَیْنِ

عیدگاہ خارج شہر ہونے پر بعض مفتیان کرام کے فتاویٰ اور انکا جواب

(۱۱۰) سوال:- گرامی قدر حضرت مفتی صاحب اطال اللہ بقاءکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعد سلام مسنون خدمت اقدس میں عرض یہ کہ مسئلہ ذیل میں حضرت والا کی رائے گرامی اور قول فیصل کیا ہے، وہ ہم کو مطلوب ہے کیونکہ عبارات کتب فقہیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عید کی نماز کے لئے ”خروج إلی الجبانة“ سنت مؤکدہ ہے اور سب فتاوی کی کتابوں میں جبانہ سے مراد آبادی کے باہر لکھا ہے، کیا اصل میں جبانہ سے شہر یعنی آبادی کے باہر ہی کا مقام مراد ہے؟ اور اگر یہی ہے تو بعض شہر والوں کے لیئے آبادی سے باہر جانا بہت مشکل ہے، کیونکہ آجکل آبادی میں اضافہ کی وجہ سے شہر ہر طرف بہت دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور حدیث میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلّی میں جا کے نماز ادا کرنے کا ذکر ہے اس مصلّی کا فاصلہ مسجد نبوی سے صرف ایک ہزار ذراع کی مقدار تھی جیسا کہ علامہ لکھنوی علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے فتاوی دار العلوم (ج ۵ ص ۱۸۸) میں نقل کیا ہے، اب اس مشکل کا حل کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ عبارات کتب فقہیہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ میں نماز پڑھنے سے شرعاً مسلمانوں کے اجتماع عظیم بھی مطلوب ہے یعنی پوری جمیعت اسلامیہ کے اجتماع سے مسلمانوں کی شوکت ظاہر ہوتی ہے جو کہ شہر میں بکثرت مساجد میں چھوٹی چھوٹی جماعت میں پڑھنے سے نہیں ہوتی۔

اب اگر کسی شہر میں کوئی عیدگاہ نہ ہو بلکہ کھلا میدان ہو، جہاں کبھی کبھی فٹ بال کرکٹ وغیرہ کے کھیل کھیلے جاتے ہیں، مگر دائمًا نہیں کھیلے جاتے، تو حالت مذکورہ میں عید کی نماز چھوٹی چھوٹی جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنا افضل ہے یا اس کھیل کے میدان میں بڑی جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل؟

مفتی عبد الرحیم لاجپوری صاحب مدظلہ نے فتاویٰ رحیمیہ ج ۵ ص ۳۰) میں ایک سوال کے جواب میں کھیل کے میدان سے جامع مسجد میں پڑھنے کو افضل بتایا ہے، اس بارے میں حضرت والے کی رائے گرامی کیا ہے؟ بیان فرمائیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرمائیں کہ اگر کسی شہر میں مستقل کوئی عیدگاہ نہ ہونے کی وجہ سے پورے شہر میں تقریبًا ۷۰/۸۰ جامع مسجدوں میں چھوٹی چھوٹی جماعت میں عید کی نماز ہو، اسی حالت میں اگر مستقل عیدگاہ بنانے کی حتی المقدور کوشش وفکر کرنے کے ساتھ ساتھ شہر کے اندر کسی بڑے میدان میں جہاں کبھی کبھی کھیل وغیرہ اور کبھی کبھی وعظ کی محفل بھی ہوتی ہے، بڑی جماعت کے ساتھ عید کی نماز ادا کریں تو کیا سنت مؤکدہ ادا ہوگی یا نہیں؟

براہ کرم مذکورہ مسائل کو تفصیل اور دلائل وبراہین سے مزین فرما کر عامۃ المسلمین کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔ ولکم الأجر الجزیل.

الجواب ومنه الصدق والصواب

حَامِدًاوَّمُصَلِّيًا وَّمُسَلِّمًا أَمَّابَعْدُ!

احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازیں مصلّٰی (عیدگاہ) میں ادا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ:

(١) فی "البخاری" عن أبی سعید الخدری رضی اللّٰه عنه قال كان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یخرج یوم الفطر والأضحی إلی المصلّی فأوّل شئ یبدأ به الصلاة ثم ینصرف فیقوم مقابل الناس والناس جلوس علی صفوفهم فیعظهم و یوصیهم ویامرهم الخ. (باب الخروج الی المصلّیٰ بغیرمنبر: ج١ ص١٢)

(٢)عن ابن عمر رضی اللّٰه عنه قال إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم كان یغد وإلی المصلّیٰ فی یوم عید والعنزة تحمل بین یدیه فإذابلغ المصلّیٰ نصبت بین یدیه فیصلي إلیها وذلک أن المصلّیٰ كان فضاء لیس فیه بشیستربه. (ابن ماجة: ٩٢ وكذا فی البخاری: ج١ ص١٣٣)

(٣) عن جماعة من الأنصار أن جاؤا إلی النّبی صلّی اللّٰه علیه وسلم یشهدون أنهم رأوا الهلال بالأمس فأمرهم أن یفطروا إذا صبحوا أن یغدوا إلی مصلاهم. (أبوداود: ج١ ص:١٦٤، طحاوی: ص١٨٩).

(٤) فقال أبوسعید فلم یزل الناس علی ذلک حتی خرجت مع مروان وهوأمیر المدینة فی أضحی أوفطر فلما آتینا المصلی إذا منبر بناه كثیر بن الصلت (إلی قوله) فقلت له غیر تم واللّٰه فقال أباسعید قدذهب ماتعلم، فقلت ماأعلم واللّٰه خیرمما لاأعلم فقال إن الناس لم یكونوایجلسون لنا بعد الصلاة فجعلتها قبل الصلاة. (باب الخروج إلی المصلی بغیر منبر بخاری ص١ ج١٣١)

(٥) عن علی رضی اللّٰه عنه قال من السنة أن یمشی الرجل إلی المصلیّ قال والخروج یوم العیدین من السنة ولایخرج إلی المسجد إلاضعیف أو مریض لكن خرجوا إلی المصلیّ رواه البیهقی عن الحارث عن علی (ج٣ص ٣١١) من السنن الكبریٰ وكذافی وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفی. (ج٣ص٧٩٢)

متذکرہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نمازیں مصلیٰ میں ادا کرتے تھے اور عیدگاہ شہر کے باہر ہونے کے بارے میں صراحۃً کوئی بات احادیث میں ذکر نہیں ہے، بلکہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اندر ہی عیدین کی نماز پڑھا کرتے تھے جیسا کہ بخاری شریف وغیرہ میں مذکورہ ہے، چنانچہ:

(۱) فی "البخاری" : عن البراء رضی اللہ عنہ قال خرج النّبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الأضحی إلی البقیع فصلی رکعتین ثم أقبل علینا بوجهه فقال إن أوّل نسکنافی یومنا هنا أن نبدأ بالصلاة ثم نرجع فننحر الخ.

(باب استقبال الإمام الناس فی خطبته ج ۱ ص ۱۳۲)

وقال فی "عمدة القاری" : البقیع هی مقبرة أهل المدینة.

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی کی شرقی جانب جنت البقیع کی قربِ جوار میں کہیں عیدین کی نماز پڑھا کرتے تھے، حالانکہ جنت البقیع داخل مدینہ میں ہے اور مسجد نبوی سے بالکل قریب ہے۔

(۲) عن عبدالرحمن بن عابس قال سمعت ابن عباس قیل أشهدت العید مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال نعم ولو مکانی من الصغر ماشهدته حتی أتی العلم الذی عنددار کثیر بن الصلت فصلی ثم خطب

(بخاری: ج ۱ ص ۱۳۳)

(۳) فی و"فاء الوفاء باخبار دار المصطفی" وقال ابن سعد کانت دار کثیر بن الصلت قبلة المصلی فی العید وهی تطل علی بطحان الوادی فی وسط المدینة انتهی. (ج ۲ ص ۷۸۱) کذافی فتح الباری شرح البخاری: ج۲ ص ۴۴۹ تا ۴۶۵)

ترجمہ: ابن سعدؒ نے فرمایا کہ "کثیر بن الصلت" کا گھر عیدگاہ کی جانب قبلہ میں تھا وادی بطحان جو مدینہ منوّرہ کے بیچ میں ہے اس وادی میں یہ گھر بلند تھا۔

حدیث بالا اور اسکی شرح سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی سے باہر مدینہ کے اندر کسی میدان میں بھی عیدین کی نمازیں ادا فرمایا کرتے تھے۔

(۴) امام بخاری رحمہ اللہ نے "کتاب الحدود" میں "باب الرجم بالمصلیٰ ج ۲ ص ۱۰۰۷" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا، یعنی مصلی میں سنگسار کرنا اس کے ذیل میں حضرت ماعز اسلمی کا واقعہ ذکر کیا جس میں یہ لفظ بھی آیا ہے "فأمر به فرجم بالمصلیٰ" کہ

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سنگسار کیے جانے کا حکم دیا تو اس کو مصلی عیدگاہ میں سنگسار کیا گیا اس کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" المراد بالمكان الذى كان يصلى عنده العيد والجنائز وهو من ناحية بقيع الغرقد".

یعنی اس روایت سے بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کے عیدگاہ کی جگہ داخل مدینہ میں تھی۔

الأماكن التى صلى فيها النّبِى عليه السّلام العيد.

(۱) فی" وفاء الوفاء باخبار دار المصطفى" : قال الواقدى: أوّل عيدصلّى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بالمصلّى لسنة ثنتين من مقدمه المدينة من مكة وحملت له العنزة وهو يومئذ يصلّى إليها فى القضاء وكانت العنزة للزبيربن العوام، أعطاه إيّاهاالنجاشى فوهبها للبنّى صلّى اللّٰه عليه وسلم فكان يخرج بها بين يديه يوم العيد وهى اليوم بالمدينة عند المؤذنين، يعنى يخرجون بها بين يدى الأئمة فى زمانهم . (الباب الخامس ج۲ص ۷۷۹)

(۲) وروى ابن زبالة وابن شيبة عن أبى هريرة رضى اللّٰه عنه أوّل فطروأضحى صلّى فيه رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلم للنّاس بالمدينة بفناء دارحكيم بن العداء عند أصحابة المحامل.

(۳) عن إبراهيم بن أبى أمية عن شيخ من أهل السنن الثقة قال :اوّل عيد صلاه رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه فى حارة الدوس عندبيت ابن أبى الجنوب، ثم صلى العيد الثانى بفناء دارحكيم عنددار حفرة داخلاً فى البيت الذى بفنائه المسجد، ثم صلّى العيد الثالث عنددار عبداللّٰه بن درة المزنى داخلابين الدارين دار معاوية ودار كثير بن الصلت ثم صلى العيد الرابع عند أحجار كانت عند الحناطين بالمصلّى، ثم داخلافى منزل محمد بن عبدالله بن كثير بن الصلت، ثم صلى حيث يصلى الناس اليوم.

(۴) وروى ابن أبى شيبة من طريق إبراهيم بن أبى أمية مولى بنى عامر بن لوئى قال : سمعت ابن باكية يقول صلى رسول اللّٰه صلىّ عليه وسلم العيد عند دارالشفاء ثم صلّى فى حارة الدوس، ثم صلّى فى المصلّى، فثبت يصلى

فیه توفاه الله تعالیٰ.

(۵) وروی أیضًا عن ابن شهاب قال صلّی النّبی الله علیه وسلم العید فی موضع آل درة وهم حي من مزینة ثم صلّی دون ذلک فی مکان أُطُم بنی زریق عند اذنه الیسریٰ. (وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفیٰ: ج۲ ص ۷۸۱)

ان متذکرہ تمام روایات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے اندر کئے مقامات میں عیدین کی نمازیں ادا فرمایا کرتے تھے اور کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپ ﷺ نے عیدین کے لئے کبھی بھی مدینہ شہر چھوڑ کر کہیں باہر جا کر نماز ادا کی ہو۔

لہٰذا یہ کہنا کہ عیدگاہ شہر سے باہر ہونا ہی سنت مؤکدہ ہے شہر کی حدود میں سنت نہیں ہے، شہر سے باہر جا کر عیدین کی نمازیں پڑھنی ہونگی، یہ بات کسی طرح درست نہیں، بلکہ مساجد سے باہر کسی خالی میدان میں نماز پڑھنا سنت ہے البتہ یہ اگر عیدگاہ کے نام سے متعین ہو تو بہتر ہے ورنہ پھر کسی خالی اور وسیع میدان میں عید کی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔

جو حضرات عیدگاہ کے خارج مدینہ ہونے کے قائلین ہیں ان کی پیش کردہ روایات اور ان کے جوابات

(۱) وقد نقل ابن شبة عن شیخه ابن غسان هو الکنائی من أصحاب مالک أنه قال ذرع مابین مسجد رسول الله صلّی الله علیه وسلم الذی عنده دار مروان ابن الحکم وبین المسجد الذی یصلّیٰ فیه العید بالمصلّیٰ الف ذارع.

وفأ الوفاء باخبار دار المصطفیٰ: (ج ۲ ص ۷۸۱)

(۲) فی "الدر المختار": ماشیًا الی الجبانة وهی المصلّٰی العام وفی الشامیة (قوله المصلی العام) ای فی صحراء. بحر عن المغرب.

مذکورہ بالا روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عیدگاہ خارج شہر میں ہونا سنت ہے۔

مذکورہ بالا روایتوں کا جواب

مذکورہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نے جس جگہ پر نمازِ عید ادا کی تھی وہ مقام مدینہ سے ایک ہزار قدم کے فاصلہ پر تھا، ظاہر تو یہ کہ وہ مقام بھی داخل مدینہ ہی میں تھا، کیونکہ ایک ہزار

قدم کے فاصلہ میں زیادہ بعد نہیں ہوتا ہے، نیز یہ حضرات شامی کی عبارت (ماشیًا إلی الجبّانة) سے استدلال کرتے ہیں کہ جبانہ خارج مدینہ مراد لیتے ہیں جیسا کہ احسن الفتاوی: ج۴ص ۱۲۹، فتاویٰ رحیمیہ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج۵ص ۱۸۸ میں ہیں۔

عبارت شامی کا جواب

"جبانة" صحراء کا مترادف لفظ ہے "جبانة" کہا جاتا ہے خالی میدان کو چاہے وہ داخل شہر میں ہو یا خارج شہر میں، جیسا کہ صحاح اور جواھر القاموس میں مذکور ہے۔

(۱) فی الصحاح : والجبّان والجبّانة بالتشديد الصحراهجبن الرجل غلظ.

(ج۵ص ۵۰۶)

(۲) فی "جواھر القاموس" : الصحراء الأرض المستوية فی لِيُنٍ وغِلَظٍ دون القف أوھی الفضاء الواسع زاد ابن سيد لَانبات فيه قال الجوھری الصحراء البرية. (ج۷ص ۷۷)

لہٰذا "جبانہ" سے مراد وہ خالی میدان ہے جس میں نماز عیدین ادا کرنے کی عام اجازت ہو، خواہ آبادی کے اندر ہو یا باہر، پھر نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے مختلف اوقات میں مختلف جگہوں میں جو نماز عید ادا فرمائی تھی، اس کا نقشہ آپ کے سامنے ہے ایسے حالات میں کسی نص شرعی یا روایت فقہیہ سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ عیدگاہ کے لئے خارج شہر اور خارج مصر ہونا ضروری ہے۔

اس واسطے ہم نے کہا عیدین کی نماز عیدگاہ میں ہونا سنت ہے، خواہ وہ جگہ مقررہ عیدگاہ ہو یا کوئی خالی اور وسیع میدان ہو، اس کے لئے وقف شرعی ہو یا نہ ہو، شہر کی حدود کے اندر کوئی خالی جگہ موجود ہو تو وہ جگہ بھی عیدین کی نماز ادا کرنے لئے کافی ہے، اس سے سنت ادا ہو جائیگی، اسی طرح مدرسہ کا احاطہ یا میدان یا افتادہ زمین اور میدان یا رفاہ عام کیلئے مخصوص میدان سب جگہوں میں عیدین کی نماز جائز اور درست ہیں، البتہ ایک بات یاد رہے کہ نماز عید جیسی اہم عبادت کیلئے کوئی ایک مخصوص جگہ بطور وقف ہونا چاہئے، یہ سب سے بہتر اور اولیٰ ہے۔

پس مساجد میں عیدین کی نماز ادا کرنے سے بہتر یہ کہ کسی مدرسہ کے میدان میں ورنہ ویسے کسی میدان میں جمع ہو کر اکٹھا نماز ادا کریں تا کہ سنت بھی ادا ہو جائے ساتھ ساتھ اظہار شوکت اور اظہار شعائر اسلام بھی ہو جائے۔

نیز کتبِ احادیث اور فقہ اسلامی کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات "جبانة" سے

خارج شہر مراد لیتے ہوئے عیدگاہ کا شہر سے باہر ہونے کو سنت کہتے ہیں اور شہر کے کسی میدان میں عیدین کی نماز کو خلاف سنت کہتے ہیں ان کی تحریر کتب حدیث اور فتاوی کی تصریحات کے خلاف ہیں۔

هذا ما ظهر لي ولشيوخنا والله أعلم بالصواب وعلمه أحكم وأتم

کتبہ: محمد کمال حسین مؤ منشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
یکم محرم الحرام ۱۴۲۸ھ	یکم محرم الحرام ۱۴۲۸ھ
الجواب صحیح	الجواب صحیح
جسیم الدین عفا اللہ عنہ	کفایت اللہ عفا اللہ عنہ
مفتی دارالعلوم ہاٹھزاری چاٹگام	مفتی دارالعلوم ہاٹھزاری چاٹگام

الجواب صحیح

مزید وضاحت لفظ ''جبانہ'' کے معنی ائمۂ لغت نے مطلقا صحراء (وسیع میدان) بتائیں ہیں چونکہ وسیع میدان اکثر خارج شہر ہوتا تھا، اکثر اسلامی حکومتوں نے گنجان آبادی کے باہر کسی جگہ کو مصلی عید و جنازہ مقرر کیا ہوا تھا، اس وجہ سے فقہاء کرام نے بھی خارج شہر سے جبانہ کی تفسیر فرمائی ہیں اس سے لازما عیدگاہ کا خارج مصر ہونا پڑیگا انہوں نے بالکل نہیں کہا بلکہ جہاں کہیں وسیع میدان ہو اگرچہ آبادی کی حدود میں کسی بھی خالی جگہ میں ہو عیدین کی نماز پڑھی جاویں جائز ہے، سنت ادا ہو جائے گی، مگر عید کی نماز چونکہ اہم اور شعائر میں سے ہیں کسی ایسی جگہ میں نہ پڑھنا افضل ہے، جو کھیل کود کے لئے مخصوص ہو پھر بھی دوسری جگہ نہ ہونے کی صورت میں کھیل کود کے میدان میں بھی عید کی نماز پڑھی گئی تو نماز ہو جائے گی۔

فقط واللہ تعالیٰ بالصواب۔

کتبہ
بندہ نور احمد عفی عنہ
دارالعلوم ہاٹھزاری

كِتَابُ الْجَنَائِزِ

نماز جنازہ میں کتنی چیزیں فرض ہیں

(۱۱۱) سوال:- مخدومی ومکرمی جناب حضرت مفتی صاحب مدظلہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ عرض گذار ہے کہ آنجناب اگر مسائل مندرجہ ذیل کے جوابات از روئے شریعت مطہّرہ ارقام فرمائیں گے تو احقر مشکور وممنون ہوگا اور آنجناب عنداللہ ماجور ہوں گے۔

کہ امام صاحب نے جنازہ کی نماز میں سہواً تین تکبیر کہہ کر سلام پھیر لیا ہے بعض نے کہا نماز نہیں ہوئی، مگر دوسرے قاری صاحب نے کہا کہ نمازِ جنازہ ادا ہوگئی، اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، پھر اسی بات پر میت کو دفن کر دیا گیا ہو، بعد میں ایک تبلیغی امیر صاحب جو کہ عالم بھی تھے آ کر کہا کہ نمازِ جنازہ درست نہیں ہوئی دوبارہ پڑھنا چاہئے، اب ہمیں چند باتیں معلوم کرنی ہیں۔

(۱) صورت مذکورہ میں نماز جنازہ درست ہوئی یا نہیں؟ (۲) اگر اعادہ ضروری ہے تو قبر سے نعش کو کھود کر نکالنا ہوگا یا نہیں؟ (۳) اگر بدون نکالنے قبر ہی پر نماز پڑھی جائے تو پرانے قبرستان پر نماز کی صف بندی کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ (۴) کب تک یعنی کتنے دن تک قبر پر نمازِ جنازہ درست ہے؟

الجواب وھو الموفّق للصّواب

جواب (۱):- جنازہ کی نماز میں چند امور فرض ہیں (۱) وضو کے بعد نماز جنازہ کی نیت کیجاوے پھر چار تکبیر (یعنی چار مرتبہ اللہ اکبر) کہنا، (۲) قیام فرض ہے، یعنی کھڑے ہو کر جنازہ کی نماز پڑھنا فرض ہے بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں میت کا نمازیوں کے سامنے ہونا شرط ہے اسیطرح میت کا پاک ہونا بھی شرط ہے باقی درمیان میں ثنا' درود شریف' دعائے ماثورہ پڑھنا سنت ہے سلام پھیرنا واجب ہے۔

کمافی "شرح التنویر": وھی أربع تکبیرات کل تکبیر قائم مقام رکعۃ الخ (والقیام) فلم تجز قاعدًا بلاعذر. (درمختار مع شامیۃ: ج۲ ص۲۰۹)

لہٰذا چار تکبیروں میں جب ایک تکبیر رہ گئی تو فرض رہ جانے کیوجہ سے نماز جنازہ صحیح نہیں ہوئی کیونکہ اسکی ہر ایک تکبیر ایک ایک رکعت کی قائم مقام ہے۔

کمافی " الهندیه " : صلوٰة الجنازة أربع تکبیرات ولو ترک واحدةً منها لم تجز صلوٰة هکذا فی الکافی: (ج ۲ ص ۱۶۴)

لہٰذا صورت مسئولہ میں نماز جنازہ کا اعادہ ضروری ہے بشرطیکہ میت گلا ہوا نہ ہو۔

جواب (۲): - قبر کھود کر نعش نکالنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جلد از جلد اس کی قبر پر ہی اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی کیونکہ میت کا دفن آج ہی کر دیا گیا ہے پس سامنے لیکر جسطرح نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے اس طرح قبر کو سامنے لیکر چار تکبیروں سے نماز جنازہ پڑھنے سے نماز صحیح ہو جائے گی۔

کما فی "شرح التنویر ":(وإن دفن) وأهیل علیه التراب (بغیر صلوة أوبها بلاغسل أو ممن لاولایة له (صلی علی قبره)

(درمختار مع شامیة:(ج ۲ ص ۲۲۴)

جواب (۳): - قبر کو روندنا اور اس پر چلنا وغیرہ سب مکروہ ہیں البتہ ضرورت کے تحت جائز ہے۔

قال فی " الشامیة ": عن خزانة الفتاویٰ وعن أبی حنیفة لایطأ القبر إلا لضرورة.

(درمختار مع شامیة: ج ۲ ص ۲۴۵)

لہٰذا پُرانے قبرستان پر نمازِ جنازہ کی صف بندی نہیں کی جائے گی بلکہ قبرستان کی مشرقی جانب اگر خالی جگہ ہو تو وہاں ہی قبرستان کو سامنے لیکر صف بندی کیجائے گی البتہ مشرقی جانب جگہ نہیں ہے تو پُرانے قبرستان پر ہی قطار کر کے نماز ادا کیجائے گی۔

جواب (۴): - اگر کسی مسلمان پر نمازِ جنازہ پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو جب تک اس کی نعش کے پھٹ جانے کا اندیشہ نہ ہو تو قبر پر اس کی نمازِ جنازہ جائز ہے، مگر جب ظن غالب ہو کہ اب نعش پھٹ گئی ہو، تو پھر نماز نہ پڑھی جائے اور نعش پھٹنے کی مدت جگہ کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے، اسکی مدت متعین کرنا مشکل ہے، ہاں بعض نے تین اور بعض نے دس دن اور بعض نے ایک ماہ مدت بیان کی ہے، مگر صحیح یہی ہے کہ نعش پھٹنے کے قبل تک نماز پڑھی جاسکتی ہے اس کے بعد نہیں۔

کمافی شرح " التنویر ": (صلی علی قبره) استحسانًا (مالم یغلب علی الظن تفسخه) من غیر تقدیر هو الأصح وظاهر أنه لوشک فی تفسخه صلی علیه لکن فی النهر عن محمد لاکانه تقدیما للمانع . وفی الشامیة (قول هو الأصح)لأنه یختلف باختلاف الأوقات حرًا بردًا والمیت سمنًا وهزالاو الأمکنة بحر وقیل یقدر بثلاثة أیام وقیل عشره وقیل شهر عن الحموی.

(در مختار مع شامیه ج ۲ ص ۲۲۴)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۳/ شوال ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۳/ شوال ۱۴۲۶ھ

قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنا مستحب ہے

(۱۱۲) سوال:- جناب مفتی صاحب! قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنے کے بارے میں آخری بات کیا ہے؟ ایک دفعہ میں نے حضرت غازی صاحب مدظلہ (شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ پٹیہ) سے پوچھا تو آپ نے کہا کہ بعض اہل علم نے اسکو بدعت کہا ہے اور بعض نے مستحب کہا ہے اور اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ جب بدعت اور مستحب کے درمیان تعارض پیدا ہوتا ہے تو بدعت کو ترجیح ہوتی ہے پس بدعت ہوگی، پھر ہاٹھزاری مدرسہ کے شیخ الحدیث ونائب مفتی، مفتی اعظم حضرت مفتی احمد الحق مدظلہ سے پوچھا تو آپ نے کہا کہ بدعت نہیں مستحب ہے۔

اب جناب عالی سے گذارش ہے کہ دلائل کی روشنی میں بتائیں کہ اس کا فیصلہ کن حکم کیا ہے؟۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنے کے جواز وعدم جواز کے متعلق محدثین کرام کے درمیان کافی اختلاف ہے اکثر محدثین کرام کے بیان، خاص کر کے امام خطابی اوران کے متبعین، امام طرطوشی، قاضی عیاض، ابن حجر عسقلانی، انورشاہ کشمیری، علامہ یوسف بنوری وغیرہم رحمہم اللہ کے نزدیک قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنا بدعت ہے اور وہ حضرات ٹہنی گاڑنے کی حدیث کی توجیہ وتشریح یہ کرتے ہیں: کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا یعنی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی خاص برکت تھی پس یہ عمل امت کے لئے اسوۂ اور قابل اتباع نہیں، چنانچہ:

قال فی "معارف السنن": یقول ابن حجر الحافظ وقد استنکر الخطابی ومن تبعہ وضع الناس الجرید ونحوہ فی القبر عملاً بھذالحدیث وقال الطرطوشی: لأن ذالک خاصة ببرکة یدہ وقال القاضی عیاض لأنہ علل غرزھما علی القبر بأمرمغیب وھو قولہ "لیعذبان" انتھی.

(ج ١ ص ١٦٥، کذا فی فیض الباری: ج ١ ص ٤٨٩، وکذا فتح الباری: ج ٣ ص ٢٢٢)

لیکن بعض محدثین کرام اور بعض دوسرے علماء کرام اس کو مستحب کہتے ہیں جیسا کہ علامہ بدرالدین عینیؒ، ملاعلی قاریؒ، ابن عابدین شامیؒ، اشرف علی تھانویؒ، خلیل احمد سہارنپوریؒ، وغیرہم رحمہم اللہ کے نزدیک قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنا مستحب ہے اور یہ حضرات حدیث مذکور کو عموم پر حمل کرتے ہیں نیز یہ حضرات صحابی رسول حضرت بریدۃ الاسلمی کی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں، چنانچہ: بخاری شریف میں ہے۔

(۱) قال فی "البخاری" باب الجرید علی القبر وأوصی بریدة الأسلمی أن یجعل فی قبره جریدًا إلی قوله ...... عن طاؤس عن ابن عباس رضی اللّٰه عنه قال مر النبی صلی الله علیه وسلم بقبرین یعذبان فقال لیعذبان ومایعذبان فی کبیر اماأحدهما کان لایستتر من البول واما الأخرفکان یمشی بالنمیمةثم أخذ جریدة رطبةفشقها بنصفین ثم غرز فی کل قبر واحدة فقالوایارسول اللّٰه لم صنعت هذا فقال لعله أن یخفف عنهما مالم ییبسا. (ج ۱ ص ۱۸۱، ۱۸۲)

(۲) قال فی بذل المجهود. بل یحتمل أن یکون أمربه قدتأسی بریدة بن الحصیب الصحابی بذالک فأوصی أن یضع علی قبره جریدتان کما سیأتی فی الجنائز من هذا الکتاب هو أولیٰ أن تتبع من غیر انتهی.

(ج ۱ ص ۱۵، وکذافی مرقاة المفاتیح شرح مشکوة المصابیح: ج ۲ ص ۵۹، وکذا فی الشامیة: ج ۲ ص ۲۴۵)

استاد محترم حضرت علامہ مفتی محمد عبدالسلام صاحب چاٹگامی مدظلہ العالی مستحب ہونے کے قائل ہیں، لہٰذا ہمارے دارالافتاء کا فتویٰ یہ ہے کہ قبر پر کھجور کی ٹہنی گاڑنا بدعت نہیں بلکہ مستحب ہے البتہ جہاں اس کا رواج و دستور نہیں وہاں اس کو تاکید کے ساتھ جاری کرنے پر زور دینا غلط ہوگا اور جہاں لوگ اس کو سنت سمجھتے ہیں اور منع کرنے سے فساد ہوگا ان کو نہ روکا جاوے کیونکہ اس کی اصل تو موجود ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۶؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۶؍صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

فَصلٌ فِیْ اِیْصَالِ الثَّوَابِ

تعزیت کے بارے میں بعض سوالات اوران کے جوابات

(۱۱۴)سوال :- مجھے تعزیت کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) تعزیت کسے کہتے اور کب تک تعزیت مشروع ہے؟

(۲) الفاظ تعزیت اور مضمون متعین ہے یا نہیں؟

(۳) تعزیت کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

(۴) تعزیت کے لئے جمع ہوکر قرآن خوانی کرنا کیسا ہے؟

(۵) ایصال ثواب کی غرض سے صلحاء کو جمع کرنا اور قرآن خوانی یعنی دعا یونس، سورۂ انعام، سورۂ اخلاص کا ختم پڑھانا از روئے شرع کیسا ہے؟

الجواب وھوالموفّق للصّواب

جواب(۱):- تعزیت یعنی اہل میت کی غمخواری کرنا ان کو صبر واستقلال کی تلقین کرنا اور میت کے حق میں دعا کے الفاظ کہنا یہ سب امور مسنون ہیں، حدیث شریف میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ چنانچہ:

(۱) عن عبداللّٰہ بن مسعود قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من عزّٰی مصابًا فلہ مثل أجرہ رواہ الترمذی . (مشکوۃ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے مصیبت زدہ کو تسلّی دی (اس کو صبر کی تلقین کی) تو اس تسلی دینے والے کو اتنا ثواب ملتا ہے جتنا مصیبت زدہ کو ملتا ہے۔

(۲) حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم من عزی ثکلیٰ کسی بردًا فی الجنۃ رواہ الترمذی وقال ھذاحدیث غریب (مشکوۃ ص ۱)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اس عورت کو تسلّی (دیا جس کا بیٹا مرگیا ہو تو اس تسلّی دینے والے) کو جنت میں نہایت نفیس واعلی درجہ کا لباس پہنایا جائیگا۔

جواب (۲) :- تعزیت تین دن تک کرنی چاہئے اس کے بعد مکروہ ہے ہاں جس کو اطلاع نہ ہو یا تعزیت کرنے والا یا اہل میت حاضر نہ ہو تو تین دن کے بعد بھی تعزیت کر سکتے ہیں، دفن کے بعد تعزیت کرنا افضل ہے دفن کے قبل سے، جبکہ اس صورت میں جزع فزع زیادہ نہ ہوگی۔

كما فى " الهندية": وقتها من حين يموت إلى ثلاثة أيام ويكره بعدها إلا يكون المعزى أو المعزىٰ إليه غائبا فلاباس بهاوهى بعد الدفن أولى منها قبله وهذا إذا لم ير منهم جزع شديد فإن رأى ذالک قدمت التعزية ويستحب أن يعم بالتعزية جميع أقاريب الميت الكبار والصغار والرجال والنساء إلا أن يكون إمرأة شابة فلايعزيها إلا محارمها: (ج ا ص ۱۶۷)

جواب (۳):- الفاظ تعزیت اور مضمون متعین نہیں جدا جدا ہیں صبر و تسلّی کے لئے جو الفاظ زیادہ مؤثر ہوں تعزیت کیلئے انکو استعمال کرے حدیث شریف کے مذکور و ماثور الفاظ کو بھی استعمال کرے۔ یعنی "اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهُ مَا اَعْطٰى وَكُلٌّ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُسَمًّى فَتَصْبِرُ وَلْتَحْتَسِبْ۔ (یعنی اپنی زبان میں یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ کی امانت اللہ نے لے لی جو دیا تھا وہ بھی اس کا تھا، لہٰذا صبر کرنا چاہئے اور صبر کرنے کو ثواب سمجھنا چاہئے)

عن أسامة بن زيد قال أرسلت ابنة النبى صلّى اللّٰه عليه وسلم إليه أن ابنًا لى قبض فأتينا فأرسل يقرئُ السلام ويقول إن اللّٰه ماأخذ وله ماأعطى وكل عنده بأجل مسمّى فلتصبر ولتحتسب فأرسلت إليه تقسم عليه لياتينها فقام ومعه سعد بن عبادة ومعاذ بن جبل وأُبى بن كعب وزيد بن ثابت ورجال فرفع إلى رسول اللّٰه عليه وسلم الصبى ونفسه تتقعقع ففاضت عيناه فقال هذه رحمة جعلها اللّٰه فى قلوب عباده فإنما يرحم اللّٰه من عباده الرحماء متفق عليه

(مشكوة ص ا)

ترجمہ: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینب) نے کسی کے ذریعہ حضور ﷺ کو کہلا بھیجا کہ میرا بیٹا مرنے کے قریب ہے لہذا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے یہاں تشریف لائیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس کے جواب میں کسی کو) بھیجا اور (کہا کہ زینب کو) میرا اسلام پہنچانا دو اور (اس کی تسلّی کیلئے میری طرف سے) یہ کہنا کہ بیشک اللہ ہی کا تھا

جو اس نے لے لیا اور اللہ ہی کا تھا جو اس نے (اولاد وغیرہ کی صورت میں عطا کیا تھا) اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر ایک کی اجل (اس کی موت وفنا کا وقت) معین ہے، پس تمہارا بیٹا اس دنیا میں جتنی عمر لے کر آیا تھا اس کو پورا کر چکا ہے اب اس کی موت کا وقت معین آ گیا ہے تو) تمہیں چاہئے کہ صبر وعزیمت کا دامن تھامو اور اللہ تعالیٰ سے اس پر اجر وثواب کی خوستگاری کرو، صاحبزادی صاحبہ رضی تعالیٰ عنہا نے پھر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم دے کر کہلایا کہ میرے پاس آپ ضرور تشریف لے آئیں چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (ان کے یہاں جانے کے لئے) کھڑے ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ سلم کے ساتھ سعد بن عبادۃ اور معاذ بن جبل اور ابی بن کعب اور زید بن ثابت اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم بھی تھے (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحبزادی رضی اللہ عنہا کے گھر پہنچے تو) اس بچہؔ (نواسہ) کو اٹھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں دیدیا، اس وقت بچہ کا دم اُکھڑ رہا تھا، (یعنی جان کنی کی حالت میں تھا) حضور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے حضرت سعد نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ یہ کیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) رو رہے ہیں! آپ نے فرمایا یہ رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے انہی بندوں پر رحم (مہربانی) فرماتے ہیں جو رحم دل ہوتے ہیں۔

نیز تعزیت کے دوسرے الفاظ اور ایک حدیث میں یہ ہیں۔

اَعْظَمَ اللّٰہُ أَجْرَکَ وَأَحْسَنَ عَزَاءَکَ وَغَفَرَ لِمَیِّتِکَ (کبیری: ص ۵۶۵)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ تجھے اجر عظیم فرمائے اور تیرے صبر کا بہتر صلہ عنایت فرمائے اور تیری میت کو معاف کر دے اگر غیر مکلّف ہو تو آخری لفظ نہ کہے۔

جواب (۴): ۔تعزیت کا مسنون طریقہ یہ کہ میت کے گھر والوں کے ہاں دعوت کھائے بغیر اجتماع اور دیگر رسوم کے بغیر تنہا چلا جاوے اور ان کو تسلّی دے یہی طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین سے منقول ہے، لہٰذا تعزیت کا وقت مقرر کر کے جمع ہونے اور کھانے، پینے کا انتظام کرنا درست نہیں بلکہ ثواب سمجھے تو بدعت ہے۔

وفی "جامع الرموز". ویکرہ اجتماعهم عند التعزیة. (ج ۱ ص ۱۲۸)

جواب (۵):- تعزیت کے لئے جمع ہوکر ایصال ثواب کی غرض سے قرآن خوانی وغیرہ کرنے کو ضروری قرار دیا جائے تو بدعت اور مکروہ ہے۔

كما في زاد المعاد. ولم يكن من هديه صلى الله عليه وسلم أن يجتمع لعزاء ويقرأ القرآن لاعند قبره ولاغيره وكل هذه بدعة حادثة مكروهة:

(ج ۱ ص ۱۵۰)

جواب (۶):- صلحاء متقین یا قراء کو ختم قرآن یا سورۂ انعام یا سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھنے کی دعوت دینا اور اعلان کرنا کہ فلاں دن قرآن خوانی ہوگی یہ بدعت اور ناجائز ہے۔

كما في "البزازية على هامش الهندية": واتخاذ الدعوة بقرأة القرآن وجمع الصلحاء والقراء للختم أولقرأة سورة الأنعام والإخلاص فالحاصل اتخاذالطعام عند قرأة القرآن لأجل الأكل يكره. (ج ۱ ص ۸)

البتہ جو شخص تعزیت یا تدفین کے لئے جمع ہوگئے ہیں وہ اگر بدون تداعی کے قرآن خوانی کرلیں تو جائز ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

ایصال ثواب کا کھانا غنی کو کھانا اور کھلانا مکروہ تنزیہی ہے

(۱۱۴) سوال:- جناب مفتی صاحب! ایصال ثواب کے لئے جو کھانا پکایا جاتا ہے تو انگرلوگ اس کو کھاسکتے ہیں یا نہیں؟ ان کو کھلانے میں ثواب میت کو ملے گا یا نہیں؟ اس سے متعلق مندرجہ حوالے بعض لوگ دیتے ہیں:

(الف) ایصال ثواب کا کھانا فقراء کو کھلانے میں زیادہ ثواب ہے اور اغنیاء کو کھانا مکروہ تحریمی ہے اگرچہ اغنیاء میّت کے رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ (فتاوی رشیدیہ: ص ۲۶۶)

(ب) ایصال ثواب کا کھانا اغنیاء کو کھانا اور کھلانا مناسب نہیں البتہ ثواب ملے گا،

(کفایت المفتی: ج ۴ ص ۹۴)

تو فتاوی رشیدیہ اور کفایت المفتی میں تعارض معلوم ہوتا ہے اب اس کا صحیح حل کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ایصال ثواب کیلئے جو کھانا پکایا جاتا ہے اس کے مستحق فقراء اور مساکین ہیں ان کو کھلانے میں ثواب زیادہ ہے اغنیاء کو ایسا کھانا کھانا مکروہ تنزیہی ہے۔

کما ھو مصرح فی " فتاوی رشیدیة": ص ۲۵۲، کذا فی " کفایت المفتی": (ج ۴ ص ۱۲۶)

درحقیقت فتاوی رشیدیہ اور کفایت المفتی میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

اب دونوں کتابوں کے حوالے ملاحظہ فرمائے۔

(۱) فتاوی رشیدیہ میں ہے:

جواب:- غنی کو ایسا طعام صدقۂ نفل کا مکروہ تنزیہی ہے اور ثواب پہنچتا ہے مگر فقیر کے کھانے میں جو ثواب ملتا ہے اس سے کم۔ (فتاوی رشیدیہ کتاب جنائز ص ۲۵۲)

(۲) کفایت المفتی میں ہے:

جواب:- ایصال ثواب کیلئے جو کھانا پکایا جاتا ہے اس کو فقراء و مساکین پر صدقہ کر دینا چاہئے اگر خود کھالیا تو ثواب کس چیز کا پہنچے گا۔ (ج ۴ ص ۱۲۶)

نوٹ: سائل نے فتاوی رشیدیہ کے حوالہ نقل کرنے میں غلطی کی یعنی مکروہ تنزیہی کی جگہ تحریمی لکھ دیا جو کہ غلط ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۶ رصفر المظفر ۱۴۲۳ھ	۶ رصفر المظفر ۱۴۲۳ھ

"طعام المیت یمیت القلب" حدیث نہیں

(۱۱۵) سوال:- جناب مفتی صاحب چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) طعام المیت یمیت القلب" یہ حدیث ہے یا نہیں؟

ایک متعین تاریخ پر ایصال ثواب کیلئے محفل کا انتظام کرنا کیسا ہے؟

(۲) ایک متعین تاریخ پر ایصال ثواب کیلئے محفل کا انتظام کرنا کیسا ہے؟ ہمارے یہاں سالانہ ایک تاریخ معین پر ایصال ثواب کی محفل ہوتی ہے اس کے لئے اشتہار چھپایا جاتا ہے اور سرسینہ سے پیر صاحب قبلہ تشریف لاتے ہیں، اب سوال یہ کہ اسطرح ایصال ثواب کرنا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- یہ حدیث نہیں، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ یہ کس کا مقولہ ہے۔

(کما فی امداد الفتاوی، باب الجنائز: ج ۱ ص ۵۴۷)

البتہ رسم کے کھانے میں (جیسے دسویں یا بیسویں وغیرہ کو جو کھانا پکایا جاتا ہے) اس میں اماتت قلب ہے، اس کو نہ کھانا چاہئے خواہ غنی ہو یا فقیر۔

جواب (۲):- ایصال ثواب تو جائز بلکہ مستحسن ہے، مگر اس کے لئے ہر سال ایک ہی تاریخ محفل کیلئے لوگوں کو بلانا اور قران خوانی کرنا بدعت ہے لہٰذا صورت مسئولہ کا طریقہ خلاف سنت اور بدعت ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ	۱۶؍ صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

قبل الدفن میّت کا منہ دیکھنا درست ہے

(۱۱۶) سوال:- جناب مفتی صاحب! نمازِ جنازے کے بعد قبل الدفن میّت کا منہ دیکھنا اور دکھانا از روئے شرع کیسا ہے؟ فتاوی رشیدیہ میں لکھتے ہیں:

جواب:- از مدرسہ لکھنو صورت مسئولہ میں منہ دیکھنا میّت کا گو قبر میں دیکھے یا قبل دفن کے درست ہے۔

قال فی فتاوی عالمگیریة: ولابأس بان یرفع ستر المیت عن وجهه وإنما یکره بعد دفنه انتهی. وفی مدارج النبوة: واضح آن ست که علی وعباس وفضل وقلثم درقبر آمد ند بود قلثم

آخر کسے کہ آمد از قبر داز دی آرند کہ گفت آخر کسیکہ روی مبارک آنحضرت را دید در قبر بودم انتهی

واللہ تعالیٰ اعلم. حررہ محمد عبدالحی عفی عنہ، الجواب صحیح بندہ رشید احمد عفی عنہ گنگوہی ۱۳۰۱ھ

(کتاب جنازے اور میت اور قبروں کے مسائل کا بیان ۲۵۷)

اور احسن الفتاویٰ میں لکھتے ہیں:

آجکل یہ قبیح رسم خواص علماء مشائخ میں بھی عام رائج ہوگئی ہے اسلئے اس سے احتراز کی وصیت کرنا واجب ہے وصیت نہ کرنے کی صورت میں اس کا وبال وعذاب میت پر بھی ہوگا۔

(باب الجنائز: ج۴ ص ۲۲۹)

تو دونوں فتاوی میں تعارض ظاہر ہے اب ان کا صحیح حل کیا ہے؟

جواب از دارالافتاء، چاٹگام۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

دفن سے قبل میّت کا منہ دیکھنا اور دیکھانا جائز ہے چنانچہ فتاوی رشیدیہ میں مع دلائل مذکورہ ہیں، البتہ دیکھنے اور دیکھانے میں کسی منکرات (جیسے تصویر کشی وغیرہ) ودیگر رسومات کے ارتکاب ہونے کا خوف ہو تو نادرست ہے جیسا کہ مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(۱) کہ بعض علاقوں میں میت کا منہ دیکھنے کو باعث اجر وثواب سمجھا جاتا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے لہٰذا اس میں ثواب سمجھنا بدعت ہے اور اگر ثواب نہ بھی سمجھے تو اس بدعت کی ترویج وتائید ہوتی ہے۔

(۲) اگر میت کوئی مشہور شخصیت ہے تو اسکی منہ دکھائی کی رسم میں کئی گھنٹے صرف کئے جاتے ہیں حالانکہ میت کے دفن میں تاخیر جائز نہیں وغیرہ۔

لہٰذا تطبیق کی صورت یہ کہ درحقیقت دونوں فتاوی میں کوئی تعارض نہیں ہے یعنی منہ دیکھانے میں اگر منکرات ورسومات کا خوف ہو اور اُسے باعث اجر وثواب سمجھا جاتا ہے تو نادرست ہے، ورنہ درست ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالی اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۶ر صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

جوتا پہن کر نماز جنازہ پڑھنا

(۱۱۷) **سوال** :- جوتا پہن کر نماز جنازہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ التوفیق والصواب

جوتا اگر پاک ہے تو جوتے پہن کر نماز درست ہے ورنہ درست نہیں، البتہ جس جوتے کے نیچے ناپاکی ہے اور اوپر اس کا پاک ہے تو اس جوتے سے پاؤں کو نکال کر جوتے کے اوپر پاؤں رکھ کر نماز درست ہے۔

كما في "الفتاوىٰ الولوالجية": الاترىٰ أنه لو صلى وقام على النجاسة وفي رجليه نعلان أوجوربان لم تجز صلوته لوفرش نعليه أوجوربيه وقام عليهما جازت صلوته لأنه إذاكان لابسًا صار كبعض جسده ولهذا جرت العادة بين الناس في صلوة الجنازة أنهم يفرشون مكا عبهم ويقومون على المكاعب.

(كتاب الطهارة: الفصل الخامس. ج ۱ ص ۵۷)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲/رجب ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲/رجب ۱۴۲۶ھ

* * *

کِتَابُ الزَّکٰوۃِ

زکوٰۃ کے بارے میں بعض سوالات اور ان کے جوابات

(۱۱۸) سوال:- میرے سسر صاحب نادار آدمی ہیں اکثر اوقات تنگ دستی میں زندگی گذارتے ہیں، کبھی کبھار میں ان کی امداد کرتا ہوں فی الحال میری تجارت میں ایک قسم کی کمزوری ہے، آئندہ ۲۲ دِسمبر کو سالی کا نکاح ہے، بیوی کہہ رہی ہے کہ اس کی شادی میں کم از کم ڈیڑھ تولہ سونے کا ایک ہار دینا ہوگا، میں نے اسی انداز پر ایک ہار بنایا ہے جس کی قیمت اس وقت سترہ ہزار پانچسو روپے ہیں، اب یہ ہار بیوی کے قبضہ میں ہے، ۲۲ رِدسمبر شادی میں جاکر اس کو دیگی، اب سوال یہ کہ اس سال میرے ذمہ میں زکوٰۃ کی ساٹھ ہزار، رقم واجب ہوئیں، چالیس ہزار رقم رمضان میں ادا کر چکا ہوں، بیس ہزار جامعہ حسینیہ اور دوسرے فقراء کی نیت سے گھر میں رکھ دی ہے اور اس سال بندہ حج کو جانے والا ہے آئندہ ۲۸ رِدسمبر کو فلائٹ ہے، نیز میرے ذمہ میں کچھ قرض بھی ہے، جناب میرے نابالغ دو لڑکے ہیں بعض احباب کہہ رہیں کہ قرض رکھ کر حج کرنا درست نہیں حج صحیح نہیں ہوگا، اب میرے چند سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) قرض رکھ کر اگر حج کیا جائے تو حج صحیح ہوگا یا نہیں؟

(۲) سالی کی شادی میں زکوٰۃ کی رقم دینا یا کوئی چیز خرید کر دینا درست ہے یا نہیں؟

(۳) زکوٰۃ کا نام لینے کے بدون ہدیہ کہکر زکوٰۃ کی رقم دینا درست ہے یا نہیں؟

(۴) ہار کی قیمت زکوٰۃ کی رقم سے منہا کر سکتا ہوں یا نہیں؟

(۵) ہار کی قیمت جبکہ نصاب سے زائد ہے تو اس مقدار سالی کو دے سکتا ہوں یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱):- اگر قرض ادا کرنے کے لئے جائداد ہے اور ادائیگی کا معقول انتظام ہے تو ادائیگی کا انتظام کر کے قرض لیکر حج کے لئے جانا درست ہے۔

جواب (۲):- سالی جبکہ مستحق زکوٰۃ ہے تو اس کو زکوٰۃ کی رقم دے سکتے ہیں اور اشیاء بھی خرید کر دے سکتے ہیں۔

جواب (۳):- زکوۃ کے نام لئے بغیر ہدیہ کہہ کر دیا جائے تو بھی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی جبکہ نیت زکوٰۃ کی ہو۔

جواب (۴): - ہار کی قیمت زکوٰۃ کی رقم سے منہا کر سکتے ہیں، لیکن دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت ہونی چاہیئے اور اگر دیتے وقت نیت نہ کی، ہار اپنے پاس موجود ہے پھر بھی نیت کر سکتے ہیں۔

کمافی ”خلاصة الفتاویٰ“ رجل أعطیٰ رجلاً دراهم يتصدق بها تطوّعا أوقال له تصدق عن كفارة أيماني فلم يتصدق بها حتى نوى الموكل أن يكون من زكوٰة ماله ولم يقل شيئا ثم تصدق المامور بها جاز عن زكوٰة ماله ،

(اخر فی التوکل باداء الزکاۃ ج۲ ص۲۴۳)

جواب (۵): - کسی (مستحق زکوٰۃ) فقیر کو نصاب کے برابر یا اس سے زائد زکوٰۃ کی رقم دینا ضرورت کے تحت جائز ہے۔

کمافی ”شرح التنوير“: (ولو كره إعطاء فقير نصابًا) أو أكثر (إلاإذا كان) المدفوع إليه (مديونًا أو) كان (صاحب عيال) بحيث (لوفرقه عليه لايخص كلاً) أولا يفضل بعد دينه (نصابًا) فلا يكره فتح .

(باب المصرف درمختار مع شامية ج۲/ص۳۵۳)

لہٰذا صورت مسئولہ میں پورا ہار سالی کو دینا درست ہوگا، کیونکہ وہ حاجتمند ہے، اس کے نکاح کے لئے ضرورت ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۴/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۴/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

غیر مسلم کو زکوٰۃ دینا درست نہیں ہے

(۱۱۹) سوال: - ہمارا ایک پڑوسی ہندو آدمی ہے فی الحال وہ بیمار ہے ڈاکٹروں نے کہا: کہ اس کا ایک گردہ خراب ہوگیا، اب وہ علاج کیلئے مدراس جانا چاہتا ہے تقریباً دو لاکھ روپیوں کی ضرورت ہے، لوگوں سے مانگ کر وہ ڈیڑھ لاکھ روپے کا انتظام کر چکا ہے، علاقے کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اُسے بقیہ پچاس ہزار روپیوں کا انتظام کردوں، واضح رہے کہ میرے ذمہ میں ایک لاکھ زکوٰۃ کی رقم واجب ہیں، میں چاہتا ہوں ان میں سے پچاس ہزار اس کے علاج کے لئے دیدوں، اب سوال یہ کہ اُسے زکوٰۃ کی رقم دینا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

زکوٰۃ کے پیسے کسی کافر کو دینا درست نہیں ہے، مسلمان فقیر (مستحق زکوٰۃ) کو دینا ضروری ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، البتہ دیگر صدقۂ واجبہ نذر و نیاز کفارہ نفل صدقہ وخیرات دینا جائز ہے۔

کمافی "شرح التنویر": ولاتدفع (إلى ذمی) لحديث معاذ (وجاز) دفع غيرها وغير العشر) والخراج (إليه) أی الذی ولو واجبًا كنذر كفارة فطرة الخ.

(باب المصرف ج۲ص ۳۵۱ وکذا فی الهندية ج۱ ص۱۸۸)

لہٰذا صورت مسئولہ میں اُسے زکوٰۃ کی رقم دینا درست نہیں ہوگا اور دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی،

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۲/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ	۱۲/ذی قعدہ ۱۴۲۶ھ

مالِ حرام میں زکوٰۃ نہیں

(۱۲۰) سوال:- جناب مفتی صاحب! مال حرام کی زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) مالِ رشوت میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ مثلاً کسی کی کمائی میں پانچواں حصّہ جائز ہے اور باقی چار حصے ناجائز ہیں تو کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(۲) ایک عالم صاحب نے کہا کہ مال حرام اگر ثواب کی نیت سے صدقہ کرے تو ایمان کا خطرہ ہے اور فقیر کو مالِ حرام کے علم ہونے کے باوجود معطی کیلئے دعا کرنا درست نہیں ہے، یہ باتیں کہاں تک درست ہیں؟

الجواب ومنہ والصدق والصواب

جواب (۱):- اگر سب مال یا اکثر مال رشوت کا ہے، تو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے رشوت کا مال اپنی ملکیت نہیں کیونکہ زکوٰۃ صرف اپنی مملوکہ چیزوں میں واجب ہوتی ہے، جبکہ وہ مقدار نصاب اور حوائج اصلیہ سے زائد ہو اور رشوت لینے والا مالِ رشوت کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ذمہ واجب ہے کہ مالِ رشوت کو اس کے مالک کو واپس دیدے اگر مالک نہ ہو تو اس کے ورثاء کو واپس دیوے اور اگر ورثاء تک پہنچانا ناممکن ہو، تو پھر مالک کے لئے ثواب کی نیت سے فقراء کو صدقہ کردیوے۔

قال فی "الشامیة" : وفی الفصل العاشر من التتارخانیة عن فتاویٰ الحجة: من ملک أموالاً غیر طیبة أو غصب أموالاً وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنًا وإن لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰة علیه فیها وإن بلغت نصابًا لأنه مدیون ومال المدیون لاینعقد سببًا لوجوب الزکاة عندنا ...... قلت لکن قدمنا عن القنیة والبزازیة أن ما وجب التصدق بکله لایفید التصدق ببعضه لأن المغضوب إن علمت أصحابه أوورثتهم وجب رده علیهم وإلا وجب التصدق به.

(کتاب الزکاة، باب السائمة من قبیل مطلب فی التصدق من المال الحرام. ج۲ص ۲۹۱)

جواب(۲):- علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

إنما یکفر إذا تصدق بالحرام القطعی ، أما إذا أخذ من إنسان مائة ومن آخر مائة وخلطها ثم تصدق لایکفر لأنه لیس بحرام بعینه بالقطع لاستهلاکه بالخلط، و قال فی الشامیة (قوله إذا تصدق بالحرام القطعی) ای مع رجاء الثواب الناشئ من استحلاله کمامر فافهم.

(کتاب الزکاة، باب السائمة درمختار مع شامیة :ج۲ص ۲۹۲)

یعنی مال حرام کے تصدق کو موجب ثواب سمجھنا اور اس میں ثواب کی نیت کرنا کفر ہے، اس سے آدمی بے ایمان ہوجاتا ہے البتہ مال مخلوط میں ثواب کی نیت کرنے سے بے ایمان نہ ہوگا اور فقیر کو مال حرام کے بارے میں اطلاع ہو تو پھر معطی کے لئے دعا کرنے سے فقیر گنہگار ہوگا۔

قال فی "الشامیة" :رجل دفع إلی فقیر من المال الحرام شیئا یرجو به الثواب یکفر ولو علم الفقیر بذلک فدعا له وأمن المعطی کفرًا جمیعًا.

(کتاب الزکوٰة، باب السائمة تحت مطلب فی التصدق من المال الحرام: ج ۲ص ۲۹۱)

لہٰذا جناب عالم صاحب کی بات اپنی جگہ پر ایک طرح درست ہے تفصیل اس طرح ہے جیسا کہ لکھا گیا ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ

مقروض غریب آدمی سے اپنا قرض وصول کرنے کا حیلہ

(۱۲۱) سوال:- ایک نادار آدمی نے مجھ سے -/۵۰۰۰ رقم قرض لی تھی اب وہ ادائے قرض سے عاجز ہے نیز وہ مستحق زکوٰۃ بھی ہے اب اگر میں زکوٰۃ کی نیت سے ان رقم کو اُسے معاف کردوں تو میری زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

زکوٰۃ کی ادائیگی درست ہونے کے لئے چند شرائط ہیں، ان میں سے ایک شرط یہ کہ زکوٰۃ فقراء کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت سے دینا ضروری ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، سوال میں تصریح ہے کہ قرض کی نیت سے رقم دی ہوئی ہیں اور وہ فی الحال موجود ہی نہیں بلکہ خرچ ہوگئی ہے پس اس رقم میں زکوٰۃ کی نیت سے معاف کردینے سے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، البتہ اس کے لئے ایک حیلہ شرعی اختیار کرسکتا ہے اور وہ یہ کہ اُسے زکوٰۃ کی -/۵۰۰۰ (پانچ ہزار) رقم دیکر پھر اس سے اپنا قرض وصول کرسکتا ہے، اگر بخوشی وہ دینے پر راضی نہ ہو تو زکواۃ کی رقم اس کے قبضہ میں دینے کے بعد جبراً بھی اس سے وصول کیا جاسکتا ہے۔

قال فی "شرح التنویر": واعلم أن أداء الدین عن الدین والعین عن العین وعن الدین یجوز وأداء الدین عن العین وعن دین سیقبض لایجوز وحیلة الجواز أن یعطیٰ مدیونه الفقیر زکاته ثم یأخذ ها عن دینه ولو امتنع المدیون مدیده وأخذها لکونه ظفر بجنس حقه فإن مانعه رفعه للقاضی.

(کتاب الزکاة درمختار مع شامیة: ج۲ ص ۷۰

فقط واللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۶؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ

جہیز کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں

(۱۲۲) سوال:- میرے والد صاحب نے شادی کے وقت میری سسرال سے پانچ لاکھ روپے اور دیگر سامان بطور جہیز لئے ہیں اور اس پر ایک سال گذر گیا، ان میں سے کچھ خرچ ہوا اور باقی موجود ہیں اب

سوال یہ کہ ان سامان اور رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

نکاح میں شرط کے ساتھ جہیز لینا حرام وناجائز ہے اور جہیز کے سامان اور رقم دولھے کے ذمہ واجب الرد رہتے ہیں یعنی سسرال کو واپس دینا واجب ہے، سسرال والے اس کے مالک ہیں اگر رقم ہے تو وہ لوگ ان کی زکوٰۃ ادا کریں گے، پس صورت مسئولہ میں دولھے کے ذمہ جہیز کی رقم کی زکوٰۃ واجب نہیں، بلکہ اس کے ذمہ مذکورہ رقم اور سامان واپس دینا واجب ہیں نیز توبہ واستغفار بھی ضروری ہے۔

قال فی "الشامية": (قوله كمالو كان الكل خبيثًا) فی القنية لو كان الخبيث نصابًا لايلزم الزكاة لأن الكل واجب التصدق عليه فلايفيد إيجاب التصدق ببعضه اهـ، ومثله فی البزازية.

(كتاب الزكوٰة باب السائمة قبيل مطلب فی التصدق من المال الحرام ج۲ ص ۲۹۱)

نوٹ:- بطور امداد واعانت اللہ کیواسطے داماد کو کچھ رقم دی ہے، مطالبہ صراحۃً یا دلالت سے نہیں ہے تو اس طرح کا لینا داماد کے لئے جائز ہے، اس میں سے خرچ کے بعد جو بچ جاوے بقدر نصاب ہو یا اپنے مال کے ساتھ ملکر نصاب بنتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ	۱۰ر شعبان المعظم ۱۴۲۶ھ

پراویڈنٹ اور جی پی فنڈ کا حکم اور اس میں زکوٰۃ ہے یا نہیں

(۱۲۳) سوال:- پراویڈنٹ فنڈ اور جی پی فنڈ کی رقم پر حکومت کی طرف سے سود کے نام سے جو زائد رقم دی جاتی ہے اس کو اپنے صرف میں لینا شرعًا جائز ہے یا نہیں؟ نیز ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

گورنمنٹ اگر پراویڈنٹ فنڈ اور جی پی فنڈ میں لازمی طور پر ملازموں کی ماہواری تنخواہ میں سے بعض معین رقم وضع کر لیتی ہے جس میں ملازموں کا اختیار نہیں ہے تو اس صورت میں پراویڈنٹ فنڈ اور جی پی

فنڈ پر جو اضافی رقم حکومت کی طرف سے سود کے نام سے دی جاتی ہے یہ سب رقم لینی جائز ہے اور یہ شرعاً سود نہیں ہے اور ان تمام رقوم پر زکوٰۃ واجب ہوگی جبکہ بقدر نصاب ہو یعنی وصولی رقم کے بعد ان کی زکوٰۃ ادا کی جائے، وصول ہونے سے پہلے ادائیگی زکوٰۃ لازم نہیں۔ **کماھو مصرح فی کفایت المفتی۔**
(ج۸ص۹۴)

نوٹ: - پراویڈنٹ فنڈ اور جی پی فنڈ اگر لازمی نہیں بلکہ ملازمین کو اختیار ہوتا ہے کہ جو اپنی طرف سے رقم جمع کرانا چاہیں تو جمع کرائیں اور جو جمع نہ کرانا چاہیں جمع نہ کراوے، تو اس صورت میں جو زائد رقم ملے گی وہ سود ہے اس کو اپنے تصرف میں لینا درست نہیں، اس پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی البتہ وصولی کے بعد اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی جبکہ بقدر نصاب ہو۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۶؍ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۶؍ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ

عشر اور نصف عشر کا حکم

(۱۲۴) سوال: - کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ نصف عشر کی بنیاد مطلقاً کثرت مؤنت پر ہے یا صرف آبپاشی پر؟ یعنی اگر ایسا ہو کہ زمین کی کاشت میں آبپاشی کی ضرورت نہیں ہوتی، لیکن کھاد وغیرہ استعمال کرنے سے اخراجات پانی کے اخراجات سے زیادہ ہو جاتے ہیں، تو اس صورت میں عشر واجب ہوگا یا نصف عشر؟ اگر کھاد وغیرہ کے اخراجات آبپاشی کے اخراجات سے کم یا برابر ہو تو مسئلہ میں کچھ فرق ہوگا یا نہیں؟ براہ کرم جواب مع حوالہ مرحمت فرما کرامت مرحومہ کی رہنمائی کریں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حدیث شریف میں ہے:

(۱) عن ابن عمر أن النبی صلّی اللّٰہ علیہ وسلم قال فیما سقت السمآء والعیون أو کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر.

(رواہ البخاری: ج ۱ ص ۲۰۱)

(۲) عن أنس قال فرض رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم فیماسقت السمآء

العشر وفيماسقى بالدوانى والسواقى والغرب والناضح نصف العشر.

مذکورہ بالا حدیثوں کی روشنی میں امت کا اجماع ہے کہ سینچائی کے قدرتی ذرائع سے جو پیداوار ہوگی اس میں عشر نکالا جائے گا اور سینچائی اگر چشمے وغیرہ کے پانی سے ہو تو یہ نصف عشر میں بدل جائے گا، یہی حکم آبپاشی کے ان تمام ذرائع کا ہے جن میں پانی پر مختلف مشقت اور اضافی اخراجات ہیں۔ چنانچہ صاحب بدائع علامہ کاسانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> **فماسقى بماء السمآء أوسقى سيحا فيه عشر كامل وماسقى بغرب أودالية أوسانية ففيه نصف العشر والأصل فيه ماروى عن رسول الله صلّى الله عليه وسلم أنه قال فيماسقته السمآء ففيه العشر و ما سقى بغرب أودالية أوساقية فيه نصف العشروعن أنس عن رسول الله صلّى الله عليه وسلم أنه قال فيما سقته السمآء أوالعين أوكان بعلا العشر وماسقى بالرشاء ففيه نصف العشرولأن العشروجب مؤنة الأرض فيختلف الواجب بقلة المؤنة وكثرتها ولوسقى الزرع فى بعض السنة سيحًا فى بعضها بالية يعتبر فى ذلك الغالب لأن للأكثر حكم الكل كمافى السوم فى باب الزكاة على مامر ولايحتسب لصاحب الأرض أنفق على الغلة من سقى أوعمارة أوأجر الحافظ أو أجر العمال أونفقة البقرة لقوله صلى الله عليه وسلم ماسقته السمآء فيه العشر الخ......**

(كتاب الزكاة بيان مقدار الواجب ج ۲ ص ۶۲، وكذا فى فى فتح القدير ج ۲ ص ۱۲۴)

لہٰذا فقہاء کرام کے تمام دلائل کو دیکھنے کے بعد یہی بات واضح ہوتی ہے کہ عشر سے نصف میں بدلنے کا جو حکم ہے، وہ اس بات پر ہے کہ زمین کی سیرابی کس پانی سے ہوتی ہے، یعنی جس زمین میں آبپاشی کی ضرورت نہ ہو اس میں عشر واجب ہوگا، اگرچہ دوسرے اخراجات آبپاشی کے اخراجات کے برابر یا اس سے زیادہ بھی ہو جائے، اسی طرح جو زمین آبپاشی سے سیراب کی جاتی ہے اس میں نصف عشر واجب ہوگا اگرچہ اس میں دوسرے اخراجات بھی ہوں نصف عشر میں کوئی کمی وبیشی نہ ہوگی۔

فقط والله سبحانه و اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

مال مستفاد کی زکوٰۃ میں حولان حول شرط نہیں

(۱۲۵) سوال: - مجھے زکوٰۃ کے بارے میں چند سوالات معروض ہیں امید کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) میں نے ایک لاکھ رقم سے تجارت شروع کی اور سال کی آخیر میں پچیس ہزار منافع ہوئے اب اصل رقم کے ساتھ پچیس ہزار رقم کی زکوٰۃ دینا ہوگی یا نہیں؟

(۲) میری کمپیوٹر کی تجارت ہے فی الحال دکان میں تقریبًا بیس کمپیوٹرز موجود ہیں فی کمپیوٹر کی قیمت چالیس ہزار رقم ہیں، بعض کمپیوٹرز دوسال سے دکان میں پڑے ہوئے ہیں اور موجودہ بازار میں اس پُرانے فی کمپیوٹر کی قیمت پچیس ہزار ہے اب سوال یہ کہ ان کمپیوٹرز پر ہر ہر سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں۔

(۳) نیز پُرانے فی کمپیوٹر کی اصل قیمت چالیس ہزار ہے اور موجودہ قیمت پچیس ہزار ہے اب اداءِ زکوٰۃ میں کس قیمت کا اعتبار ہوگا۔

(۴) میں لوگوں کو کمپیوٹر کی تعلیم دیتا ہوں میری دکان میں برائے تعلیم دس کمپیوٹرز ہیں اور دیگر اسباب جیسے کرسی وغیرہ ہیں اب ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱): - مال مستفاد جس کی جنس ایک ہو اصل مال کی تابع ہوتے ہیں اس لئے ان پر سال گذرنا شرط نہیں بلکہ اصل مال پر سال گذرنا کافی ہے۔

> قال فی "شرح الوقاية": يضم المستفاد وسط الحول فی حكمه إلى نصاب من جنسه أی إذا كان له مئتا درهم وحال عليه الحول وقد حصل فی وسط الحول مأة درهم يضم المأة إلى المئتين وقوله فی حكمه أن فی حكم المستفاد وهو وجوب الزكوٰة يعنی يعتبر فی المستفاد والحول الذی مر علی الأصل. (ج ۱ ص ۲۲۳)

لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک لاکھ پر سال گذرنے کے بعد کل رقم یعنی ایک لاکھ پچیس ہزار کی زکوٰۃ دینا واجب ہے۔

جواب (۲): - زکوٰۃ صرف مال نامی (جیسے سونے چاندی وغیرہ) میں واجب ہوتی ہے دیگر آلات و

اسباب (جیسے کپڑے، ہانڈی، دکان، کمپیوٹر وغیرہ) میں واجب نہیں ہوتی ہے، مگر یہ اسباب اگر تجارت کے لئے ہوں تو ان کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی یعنی جب ان کی قیمت مقدار نصاب ہووے اور ان پر سال بھی گذر جاوے۔

كمافي "الهنديه". الزكاة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت إذا بلغت قيمتها نصابًا من الورق أو الذهب الخ (كتاب الزكاة باب ثالث فصل دوم. ج ۱ ص ۱۷۹)

پس جو کمپیوٹر فروخت اور تجارت کے لئے نہیں بلکہ تعلیم کے لئے رکھے ہیں ان میں زکوٰۃ نہیں، البتہ تجارت کے کمپیوٹر میں زکوٰۃ واجب ہے، جبکہ انکی قیمت مقدار نصاب ہووے اور سال بھی گزر جاوے اور حوائج اصلیہ سے بھی زائد ہووے۔

جواب (۳): - مال تجارت میں جس دن زکوٰۃ ادا کرے گا اسی دن کے بازار کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ چنانچہ:

قال في "الشامية": (قول مقوما باحد هما) تكرار مع قوله من ذهب أو ورق لأن أو معناها التخيير ومحل التخيير إذا استويافقط اما إذا اختلفا قوّم بالأنفع اهـ وقدم الشارح عند قوله وجاز دفع القيمة أنها تعتبر يوم الوجوب وقالا يوم الأداء كمافي السوائم ويقوم في البلد الذي المال فيه.

(باب الزكاة المال: ج ۲ ص ۲۹۹)

لہٰذا صورت مسئولہ میں بھی جب زکوٰۃ ادا کی جائے تب ادائے زکوٰۃ کے وقت بازار کی قیمت کا اعتبار ہوگا، چاہے اس وقت کمپیوٹر کی قیمت چالیس ہزار ہو یا پچیس ہزار البتہ اصل قیمت سے بازار کی قیمت کم ہو تو اصلی قیمت کا اعتبار کرنا بہتر ہے جبکہ زکوٰۃ کے مسئلہ میں انفع للفقراء کا اعتبار زیادہ ہوتا ہے۔

جواب (۴): - صورت مسئولہ کی اشیاء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی البتہ ان کی آمدنی اور منافع پر واجب ہوگی، جبکہ وہ حوائج اصلیہ سے زائد اور بقدر نصاب ہووے اور ان پر سال بھی گذر جاوے۔

كمافي "الهندية": لو اشترى قدورًا من صفر يمسكها ولو اجرها لاتجب فيها الزكاة كمالا تجب في بيوت الغلة كذافي فتاوى قاضيخان وكذ الك العطار لو اشترى القوارير أو اشترى جوالق ليواجرها من الناس فلا زكوٰة عليها لأنه اشتريها للغلة ولامبايعة كذافي المحيط السرخسي. فصل ثاني في العروض.

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
یکم ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ	یکم ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ

ضمانت کی رقم میں زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی یا کرایہ دار پر؟

(۱۲۶) سوال:- کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کرایہ دار سے مدت کرایہ ختم ہونے پر واپس کر دینے کی شرط پر جو رقم لی جاتی ہے، مالک مکان کا اس میں تصرف کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟ اس پر اگر زکوٰۃ واجب ہو تو مالک مکان پر ہوگی یا کرایہ دار پر ہوگی؟

ملاحظہ: براہ کرام جواب مع حوالہ مرحمت فرما کرامت مرحومہ کی رہنمائی کریں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

کرایہ دار کی جانب سے جو رقم بطور ضمانت دیجاتی ہے اگر اس میں امین اور مالک کو تصرف کی اجازت نہ ہو تو امانت ہے، کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ واجب ہے، اس طرح اگر تصرف کی اجازت دیجائے تو بھی مالک مکان یا دکان کے ذمہ قرض ہونے کی وجہ سے کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ واجب ہے، اس رقم پر کرایہ دار کی ملک تام حاصل ہے مگر قبضہ نہیں ہے اور یہ دین متوسط کے حکم میں ہوگا، اس لئے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی اور یہ زکوٰۃ وصولی رقم پر ادا ہوگی، البتہ کرایہ دار نے اگر مالک مکان کو یک مشت بطور اجرت معجلہ یہ رقم دی ہے تو اس رقم کی زکوٰۃ صرف مالک مکان پر واجب ہوگی، اگر اجرت معجلہ کی صورت ایسی ہو کہ ہر ماہ کا کرایہ اور اجرت اس سے منہا کیا جائے تو اس صورت میں کرایہ پر وصول شدہ رقم پر مالک مکان کو زکوٰۃ دینا پڑے گی اور بقیہ رقم کی زکوٰۃ کرایہ دار پر آئے گی کیونکہ بقیہ رقم اس کی ہے اور وہ رقم مالک مکان کے پاس امانت کے طور پر جمع ہیں۔

قال فی خلاصة الفتاویٰ. الإجارة الطويلة التی يفعلها الناس فی زماننا مع اشراط الخيار ثلاثة أيام فی كل راس سنة فزكوٰة الاجرة المعجلة فی هذه الإجارة الطويلة تحب علی الأجر واما علی المستاجر فيجب أيضا ذكره شيخ الإسلام مجد الأئمة السرخسی فی الجامع الكبير وعلی هذا فی البيع الذی

اعتاده أهل هذاعلى الديار هو البيع الذى. وعد فيه الوفاء ان زكوٰة ذلك على البائع ان بقى فى يده يجب ان يلزم المشترى أيضًا وفى الجامع لليسد الامام ابى شجاع لازكوٰة على المستاجر والاحتياط ان يزكي كل واحد منهما:

(خلاصة الفتاویٰ ج ۱ ص ۲۳۹)

فقط واللّٰه تعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۴؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۳ھ

◆

كِتَابُ الْحَجِّ

حج کی مقدار مال ہے مگر مکان کی ضرورت ہے

(۱۲۷)سوال:- جناب مفتی صاحب! میرا اصلی گھر نواکھالی ہے میں چاٹگام میں نوکری کرتا ہوں بیوی سمیت ایک کرایہ کے مکان میں رہتا ہوں چونکہ نواکھالی کے گھر میں دینی ماحول نہیں اور میرے حقیقی بھائی بہن کوئی نہیں سوتیلے بھائی بہن ہیں ان سے ہمارے تعلقات اچھے نہیں، خلاصہ یہ کہ بیوی کو میرے علاوہ گھر میں رکھنا مشکل ہے، فی الحال میرے ہاتھ میں حج کی مقدار مال ہے، میں حج کرنا چاہتا ہوں اور بیوی کہتی ہے کہ چاٹگام شہر میں تھوڑی جگہ خرید کر رہائش کا ایک مکان تعمیر کرنے کو، صورت حال میں مجھے کیا کرنا ہے یعنی مجھ پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

حج فرض ہونے کیلئے چند شرائط ہیں ان میں سے ایک شرط یہ کہ اپنے حوائج اصلیہ (جیسے رہائش کا مکان، حج سے واپس آنے تک بیوی، نابالغ بال بچے اور جن لوگوں کا نان ونفقہ ذمہ میں واجب ہے ان کو نکالنے کے بعد) اگر حج کرنے کی مقدار مال ہے تو حج فرض ہے ورنہ نہیں۔

(۱) كما في "الكنز": يشرط حرية وبلوغ وصحة وقدرة زاد وراحلة فضلت عن مسكنه مالابدله منه نفقة ذهابه وايابه وعياله.

(۲) وفي "البحر": في قوله ومالابد منه إشارة ألى أن المسكن لابدأن يكون محتاجًا إليه للسكنىٰ فلاتثبت الاستطاعة بدار يسكنها وعبد يستخدمه ثياب يلبسها ومتاع يحتاج إليه تثبت الاستطاعة بدار لايسكنها وعبد لايستخدمه فعليه أن يبيعه ويحج بخلاف ماإذا كان يسكنه هو كبير يفضل عنه حتى يمكنه بيعه والاكتفاء بمادونه ببعض ثمنه ويحج بالفضل فإنه لايجب بيعه كمالايجب بيع سكنة. (ج ۲ ص ۳۶۲)

اگر آپ کے پاس رہائشی مکان ہے یا اس کے لئے جائیداد ہے تو موجودہ رقم کے ساتھ حج کرنا لازم ہے اور اگر رہائش کا مکان بالکل نہیں نہ ملکیۃ نہ کرایۃ تو پہلے مکان بنایا جاوے پھر دوسرے کام۔

نوٹ:- نوا کھالی میں بیوی کو حسنِ انتظام کے ساتھ رکھنا ممکن ہو تو پھر صورت حال میں حج فرض ہے کیونکہ اس مکان میں آپ کا حصہ ہے لہٰذا چاٹگام الگ مکان میں رہنے کی ضرورت نہیں،

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم،

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵؍شوال ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۵؍شوال ۱۴۲۳ھ

(۱۲۸) سوال:- مالدار اندھے پر حج فرض ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اندھے کو حج پر لے جانے والے کوئی آدمی ہو تو فرض ہے ورنہ خود کا ادا کرنا فرض نہیں، البتہ حج بدل کرا سکتا ہے۔

کما فی "خلاصة الفتاویٰ": اما الأعمى إذا وجد الزاد والراحلة أجمعوا أنه لا يلزمه إذا لم يجد قائدًا يقوده وهل يلزمه الإحجاج بالمال عند أبى حنيفة لا يلزمه وعندهما لزمه وان وجد القايد ومؤنة القايد عند أبى حنيفة لا يلزمه وهما يقولان باللزوم وهو فرع مسئلة الجملة وهى معروفة ،

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵؍شوال ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۵؍شوال ۱۴۲۳ھ

حج بدل میں آمر کے ذمہ مامور کے بال بچوں کے خرچہ دینے کا حکم

(۱۲۹) سوال:- یہ کہ حج کے لئے جانے والے کو واپسی تک گھر کے بال بچوں کے خرچہ کا بندوبست کر کے جانا چاہئے سو حج بدل میں مذکورہ خرچہ آمر کے ذمہ ہوگا یا مامور کے ذمہ؟ مامور کے غنی یا فقیر ہونے

سے مسئلہ میں فرق ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

آمر کے ذمہ مامور کی واپسی تک اس کے اہل وعیال کا خرچہ دینا لازم ہے کفایت المفتی میں یہی لکھا ہے۔ نیز اس میں امیر وغریب کا فرق معلوم نہیں ہوتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۵؍ شوال ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۵؍ شوال ۱۴۲۳ھ

* * *

كِتَابُ النِّكَاحِ

مہر اور مہر مثل کی تعریف اور ان کے احکام

(۱۳۰) سوال:- مہر اور مہر مثل کی تعریف اور ان کے احکام کیا ہیں؟ اور مہر مثل کب واجب ہوتا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

مہر کی تعریف: اصطلاح شرع میں عقد نکاح کے وقت شوہر پر جو مال ''ملک نکاح'' کے عوض میں واجب ہوتا ہے اسی کو مہر کہا جاتا ہے، کتب فقہ وفتاویٰ میں مہر کی اقسام یہ ہیں: (۱) مہر مسمّٰی (۲) مہر مثل (۳) مہر فاطمی۔

✸ **مہر مسمّٰی:** کہ فریقین عندالنکاح جو مقدار رقم کی طے کرتے ہیں بشرطیکہ وہ دس درہم سے کم نہ ہو، اسی کو مہر مُسمّٰی کہا جاتا ہے، اگر اس میں سے کچھ نقد اور کچھ اُدھار ہوتا ہے اور سب کو نقد بھی دیدیا جاتا ہے، تو جو نقد دیا جاتا ہے اس کو مہر معجّل اور جو ادھار رہتا ہے اس کو مؤجل کہا جاتا ہے۔

✸ **مہر مثل:** کہ جب فریقین بلا ذکر مہر نکاح کر لیتے ہیں تو بوقت تفریق یا موت یا عورت کے مطالبہ پر شوہر کے ذمہ میں مہر مثل واجب ہوتا ہے اور وہ عورت کی بہن یا پھوپھی وغیرہ کا جو مہر ہوتا ہے اس کے برابر مہر دیئے جانے کو مہر مثل کہا جاتا ہے (یعنی عورت کے ابائی رشتہ دار عورتوں کے مہر کے برابر مہر ہو)

✸ **مہر فاطمی:** یہ وہ مقدار ہے جو حضرت سیدۃ فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر تھا یعنی ''پانچسو درھم'' اسی مقدار مہر رکھنے کو مہر فاطمی کہلاتے ہیں۔

غرض مہر مسمّٰی ہو یا مہر مثل ہو یا مہر فاطمی یہ تین قسم کے مہر ہوتے ہیں ان میں سے افضل مہر فاطمی ہے جو ڈیڑھ سو تولے کی چاندی کے برابر ہوتے ہیں۔

مہر کے احکام

✸ عقد نکاح کرتے ہی نصف مہر شوہر پر واجب ہوجاتا ہے البتہ نکاح کے بعد اگر بیوی سے شوہر کا تعلق ہوجاتا ہے، تو پورا مہر کا ادا کرنا شوہر پر واجب ہوجاتا ہے لیکن عقد نکاح کے بعد دخول سے پہلے اگر طلاق ہوجاتی ہے تو بیوی کو نصف مہر ملتا ہے، لہٰذا مہر کے نقد اور ادھار کے بارے میں جسطرح

عندالنکاح فریقین کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے اسی کے مطابق مہر ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، پس شوہر نے اگر اپنی حیات میں مہر ادا نہیں کیا تو وہ گنہگار ہوگا، عورت کا حقِ مہر ان کے ذمہ میں بطور قرض رہ جائے گا، اس لئے شوہر کے انتقال کے بعد اس کے ترکہ میں سے پہلا کام کہ عورت کے مہر کو منہا کیا جائیگا اور اسی طرح قرض ہو تو ان کو منہا کرنے کے بعد بقیہ ترکہ کو وارثین کے مابین تقسیم کیا جائے گا۔

✸ مہر مثل اس وقت واجب ہوتا ہے جبکہ عندالنکاح مہر کا ذکر نہ ہوا ہو یا تو ایسی چیز کو مہر بنایا جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہو، جیسے شراب، خنزیر وغیرہ، تو اس صورت میں بھی مہر مثل واجب ہوتا ہے اور مہر مثل کا اعتبار عورت کے باپ کی قوم والی عورتوں کے لحاظ سے ہوتا ہے جیسے باپ شریک بہنیں اور پھوپھیں وغیرہن اور مماثلت اٹھ اوصاف میں معتبر ہے، عمر میں، حسن میں، جمال میں، مال میں، شہری ہونے میں، ہمعصر ہونے میں، عقل میں، دیانت میں، باکرہ یا ثیبہ ہونے میں اور صاحب تبیین نے علم وآداب اور پاکیزہ اخلاق اور عدم ولد اور چار کا اضافہ کیا ہے، ہر رشتہ دار کی جس دو عورتوں میں مماثلت ہوگی انکا مہر ایک ہی مقدار ہوگا۔

(۱) قال فی "الشامیة": عن العناية : بأنه اسم للمال الذی یجب فی عقد النکاح علی الزوج فی مقا بلة البضع إما بالتسمیة أو العقد ......

(ج ۳ص ۱۰۰)

(۲) و فی "البحر": المهر واجب شرعًا إبانة لشرف المحل الخ.

(ج ۳ص ۱۴۲)

(۳) وفی "شرح التنویر" : (مهرمثلها) الشرعی (مهر مثلها) اللغوی أی مهر امرأة تماثلها (من قوم أبیها) لاأمها ان لم تکن من قومه کبنت عمه وفی الخلاصة یعتبر بأخواتها وعما تها فإن لم یکن فبنت الشقیقة وبنت العم انتهی ومفاده اعتبار الترتیب فلیحفظ وتعتبر المماثلة فی الأوصاف (وقت العقد سنًا وجمالاً ومالاًوبلدًا عصراً وعقلًا ودینًا وبکارةً وثیوبة وعفة وعلمًا وأدابًا وکمال خلق) وعدم ولد...... فإن لم یوجد من قبیلة أبیها فمنالأجانب.

(درمختار مع شامیة. ج۳ص۱۳۷ــ۱۴۰)

(۴) وفی "البحر". قوله وعلی ثوب أوخمر ...... فإذا هویجب مهر المثل) بیان لثلاث مسائل الحکم فیها واحدوهو وجوب مهر المثل الفساد لتسمیة

الاولیٰ إذا کان المسمیٰ مجهولاً. (ج۳ص۱۶۴)

فقط و اللّٰه سبحانه و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ معاون مفتی دارالافتاء
۳؍شوال المکرم ۱۴۲۶ھ ۳؍شوال المکرم ۱۴۲۶ھ

مہر فاطمی کی تعریف اور اس کی تفصیل

(۱۳۱) سوال: مہر فاطمی کس کو کہتے ہیں اور اس کی مقدار کیا ہے؟ ذرا مزید تفصیل سے بیان فرمائے مہربانی ہوگی۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات اور بیٹیوں کے لئے جو مہر باندھا تھا خاص کر کے جگر گوشۂ رسول صاحبزادی سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ رضی اللہ عنہا کا جو مہر باندھا تھا اُسے علماء کرام مہر فاطمی کہتے ہیں اور اس کی مقدار کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

(۱) فزوجها النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم علی أربع مأة وثمانین درهمًا ثم إن اللّٰه تعالیٰ أمرنی أن .أزوّج فاطمة من علیّ وقد زوجته علی أربع مأة مثقال فضة

(تاریخ الخمیس. ص ۳۶۲)

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو چارسواسی درہم کے مہر میں نکاح دیا ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں فاطمہ کی علی سے نکاح دوں، پس میں نے چارسو مثقال چاندی کے مہر میں فاطمۃ کو علی سے شادی کر دی۔

(۲) عن عمر بن الخطاب قال ...... ماعلمت رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم نکح شیئا من نسائه ولا أنکح شیئا من بناته علی أکثر من اثنتی عشرة أوقیّة رواه أحمد والترمذی أبو داود. والنسائی وابن ماجة والدرامی.

(مشکوۃ ج۲ص۲۷۷)

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر اپنی ازواج مطہرات سے کسی کا نکاح کیا ہو یا اس سے زیادہ مہر پر

اپنی صاحبزدیوں میں سے کسی کا نکاح کیا ہو۔

(۳) عن أبی سلمة سالت عائشة رضی اللّٰه عنها کم کان صداق النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم قالت کان صداقه لأزواجه ثنتی عشرة أوقیة ونش قالت أتدری ماالنش قلت لاقالت نصف أوقیة فتلک خمسمأة درهم روه مسلم.

(مشکوۃ ج۲ص ۲۷۷)

ترجمہ: حضرت ابوسلمہ رضی اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنی ازواج مطہرات کا) کتنا مہر مقرر کیا تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج کیلئے بارہ اوقیہ اور ایک نش کا مہر مقرر فرمایا تھا پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کیا جانتے ہو نش کسے کہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، انہوں نے فرمایا کہ ایک نش آدھے اوقیہ کے برابر ہوتا ہے اسطرح بارہ اوقیہ ایک نش کی مجموعی مقدار پانچ سو درہم کے برابر ہوئی۔

مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوا کہ حضرت امہات المؤمنین اور فاطمہ رضی اللہ عنہن کے مہر کے بارے میں تین قسم کی روایتیں ہیں یعنی امہات المؤمنین اور دوسری صاحب زادیوں کا مہر پانچسو درہم تھا، اس سے زائد نہیں تھا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مہر کے بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک ۴۸۰ درہم کی اور دوسری روایت ۴۰۰ مثقال کی، البتہ ۴۸۰ درہم والی روایت پر اکابر دین کا تعامل جاری نہیں ہے بلکہ ۴۰۰ مثقال اور ۵۰۰ درہم والی روایات مشہور و معمول بہا ہیں۔

۵۰۰/ درہم چاندی کے حساب کے بارے میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایت منقول ہیں، چنانچہ:

(۱) مہر فاطمی جس کی مقدار منقول پانچسو درہم اس کی مقدار تولہ کے حساب سے ایک سو اکتیس تولہ تین ماشہ چاندی ہوتی ہیں۔

(۲) مہر فاطمی کی مقدار پانچسو درہم ہے جس کا وزن رائج الوقت ایک سو پینتالیس تولہ دس ماشہ ہوا (امداد المفتین بحوالۂ فتاوی رحیمیہ: ج۶ص ۴۴۴)

اور واضح رہے کہ چاندی اعلی اوسط اور ادنی ہونے کے اعتبار سے قیمت میں بھی تفاوت ہوتا ہے مثلا اعلی درجہ کی چاندی مہنگی ہوتی ہے یعنی چار سو روپے فی تولہ ہوتی ہے اور درمیانی درجہ کی چاندی تین سو روپے فی تولہ ہوتی ہے اور ہم نے مندرجہ جواب میں اعلی درجہ کی چاندی کی (موجودہ) قیمت (۴۰۰

روپے) کے اعتبار سے حساب کیا ہے۔

پس مہر فاطمی کی مقدار میں تین اقوال ہوئے ہیں اب تولہ اور بنگلہ دیشی ٹاکا کے اعتبار سے ہر ایک کا حساب ملاحظہ کیا جاوے:

(۱) چار سو مثقال چاندی (ایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہوتا ہے لہٰذا چار سو مثقال چاندی کی مقدار ایک سو پچاس تولہ۔ ۱۵۰×۴۰۰ روپے =/۶,۰۰۰۰

(۲) دوسرا قول ایک سو پینتالیس تولہ دس ماشہ۔ ۱۴۵×۴۰۰ روپے =/۵۸,۰۰۰

(۳) تیسرا قول ایک سو اکتیس تولہ تین ماشہ۔ ۱۳۱×۴۰۰ روپے =/۵۲,۰۰۰

پس ان تین اقوال میں سے جس پر عمل کرنا چاہے کرسکتا ہے مگر بہتر اور احتیاط اس میں یہ ہے کہ ایک سو پچاس تولہ چاندی مہر مقرر کی جائے یاد رہے کہ مہر میں اگر روپے مقرر کرنا چاہے تو چونکہ چاندی کے دام بازار میں کم وبیش ہوتے رہتے ہیں اس لئے جس روز مہر مقرر کیا جائے اسی روز بازار میں چاندی کا جو دام ہوگا اس کا حساب کر کے ایک سو پچاس تولہ خالص اعلی درجہ کی چاندی کی جتنی قیمت ہو، اتنے روپے مقرر کئے جائیں۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۳؍ شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۳؍ شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ

❖ ❖ ❖

مقدار مہر کی شرعی حیثیت

(۱۳۲) سوال: ۔ مہر کی اکثر مقدار کتنی ہے اور اقل مقدار کیا ہے اور معتدل مقدار کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار کی کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی اس کو شوہر کے مقدور پر منحصر رکھا ہے پھر افضل اور اَوْلیٰ یہ ہے کہ مہر کم ہی باندھا جائے یعنی مہر فاطمی ہو جس کی مسنون مقدار بارہ اوقیہ یعنی چار سو اسی درہم سے پانسو درہم ہیں، البتہ حنفیہ کے نزدیک مہر کی کمتر مقدار دس درہم ہے اس سے کم مہر باندھنا شرعاً جائز نہیں، اور ایک درہم = ۳٫۴۰۲ تو ۳٫۴۰۲ × ۱۰ = ۳۴٫۰۲ گرام چاندی ہے خواہ خود چاندی ہو یا اس کی قیمت کے بقدر سونا یا روپیہ وغیرہ ہو، جو دس درہم چاندی کی قیمت کے برابر ہو دس درہم سے کم مہر نہیں ہو سکتا ہے پس کوئی شخص اگر عورت کی رضامندی سے دس درہم سے کم کا مہر باندھے تو عورت کیلئے شوہر کے ذمہ دس درہم واجب ہوں گے۔

كمافی "شرح التنوير" : (أقله عشرة دراهم) لحديث البيهقی وغيره "لامهر أقل من عشرة دراهم" ورواية الأقل تحمل على المعجل (فضة وزن سبعة مثاقيل كمافی الزكاة (مضروبة كانت أولا) فلو دينًا أوعرضاً قيمته عشرة وقت العقد أمّا فی ضمانها بطلاق قبل الوطاء فيوم القبض (وتجب) العشرة (إن سماها أو دونها) يجب (الأكثر منها إن سمى) الأكثر ويتاكد:

(درمختا مع شامية: ج۳ص۱۰۱)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۳؍شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۳؍شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ

کن صورتوں میں مہر ساقط ہو جاتا ہے

(۱۳۳) سوال: ۔ مہر کس کا حق ہے اور کن صورتوں میں مہر ساقط ہو جاتا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

مہر، عورتوں کیلئے شوہر کے ذمّہ ایک خاص حق ہے عورت چاہے تو شوہر کو معاف کرسکتی ہے، چاھے دوسرے کو ہبہ و وصیت وغیرہ بھی کرسکتی ہے مگر شوہر اگر حیلہ سازی کر کے یا فریب دیکر یا زبردستی معاف کرانے کی کوشش کر کے معاف کرالے تو از روئے دیانت مہر معاف نہ ہوگا، مہر نہ دینے سے شوہر گنہگار ہوگا۔

قال فی "الشامیة": من الخلاصة . خوّفها بضرب حتی وهبت مهرها لم یصح لو قادرًا علی الضرب ، (ج۳ص ۱۱۳)

مہر ساقط ہونے کی بعض صورتیں

(۱) عورت نے شوہر کو معاف کر دیا یا قبل الدخول وہ مرتدہ ہوکر چلی گئی تو مہر ساقط ہوجاتا ہے۔

(۲) یا فریقین ملکر خلع کرنے سے مہر معاف ہوجاتا ہے۔

(۳) یا خلوت سے قبل فسخ نکاح کی درخواست دیکر تفریق حاصل کرنے سے بھی مہر ساقط ہوجاتا ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

کتبہ	الجواب صحیح
کتبہ : محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۳؍شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ	۳؍شوال المکرّم ۱۴۲۶ھ

مہر معجّل میں عورت کو کیا کیا اختیار رہے گا

۱۳۴) سوال:- مہر معجّل میں عورت کو کیا کیا اختیار رہے گا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جتنا مہر پیشگی دینے کا طے یا معاہدہ ہوا ہے اس کو ادا نہ کیا تو بیوی کو یہ اختیارات ہوں گے:

(۱) کہ جب تک عہد کے مطابق مہر نہ دیوے تب تک عورت مرد کو ہمبستر نہ ہونے دیوے اور اگر ایک دفعہ صحبت کی اجازت دیدی تب بھی اختیار رہے گا کہ دوسری دفعہ یا تیسری دفعہ موقع نہ دے۔

(۲) شوہر اگر عورت کو اپنے ساتھ پردیس لیجانا چاہے اور شروع میں کوئی معاہدہ نہیں تھا تو عورت کو اختیار رہے گا کہ چاہے جاوے، یا چاہے نہ جاوے مرد کو جبر کرنے کا حق نہیں رہے گا، لیکن اگر شروع میں طے تھا تو پھر جانا ضروری ہے۔

(۳) عورت اگر اسی حالت میں کسی عذر سے اپنے کسی محرم عزیز کے ساتھ پردیس جانا چاہے تو شوہر کی اجازت کے بغیر بھی جاسکتی ہے اور اپنے میکے میں بھی چلی جاسکتی ہے مرد اسکو روک نہیں سکتا، ہاں شوہر جب عہد کے مطابق کچھ مہر دے دیے تو اب عورت شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کرسکتی، شوہر کی رضامندی کے بغیر آزادی سے جہاں جی چاہے چلی جاوے درست نہیں، البتہ شوہر کو حق ہوگا کہ جہاں چاہے لیجاوے جہاں چاہے رکھے اور خود بھی وہاں رہے گا۔

قال فی "شرح التنویر": (و) ولها (النفقة) بعد المنع (و) لها (السفر والخروج من بيت زوجها للحاجة و) لها زيارة أهلها بلاإذنه مالم تقبضه) المعجل فلاتخرج إلاالحق لها أو عليها ...... ويسافر بعد أداء مؤجلاً ومعجلاً الخ: ۱۴۵/۳) فقط واللہ أعلم

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۳؍شوال المکرم سنہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۳؍شوال المکرم سنہ ۱۴۲۶ھ

مہر معجّل کتنا ہونا ضروری ہے

(۱۳۵) سوال:- پورا مہر معجّل ہونا ضروری ہے یا نہیں اور اگر سب کا معجّل ہونا ضروری نہیں تو کتنا معجّل ہونا ضروری ہے؟

الجواب باسمہ تعالیٰ

عقد نکاح ہوتے ہی شوہر پر مہر کی ادائیگی واجب ہوجاتی ہے البتہ پورے مہر کا معجّل ہونا ضروری نہیں، بلکہ اپنے علاقہ کے عرف اور شوہر کی حیثیت کو دیکھ کر مہر معجّل یا مؤجل میں سے جس قدر معجّل ادا کرنے کی بات ہوئی ہے بوقت نکاح اس کو دیدینا ہوتا ہے مابقیہ کو شوہر حسب معاہدہ ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے، برضائے عورت کل مہر بھی مؤجل ہوسکتا ہے مگر یہ مکروہ ہے۔

کما فی "شرح التنویر": (أو) أخذ (قدر ما یعجل لمثلها عرفًا) به یفتیٰ لأن المعروف کالمشروط. (درمختار مع شامیة: ج۲ ص۱۴۴)

نوٹ: - مجبوری کے تحت اگر کل مہر مؤجل ہو تو اس صورت میں بھی بحسب طاقت مقرر شدہ مہر میں سے کچھ حصہ دیکر جماع کرنا مستحب ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس وقت تک جانے سے ممانعت کردی کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو انکا مہر ادا کردیا جائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم فاطمہ کو مہر کے عوض میں اپنے حصہ میں حاصل ہونے والا درہم دیدو چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی زرہ فروخت کر کے حق مہر ادا کیا، اور سامان وغیرہ کا انتظام کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رخصت کردیا جس کا ذکر کتب احادیث وتاریخ میں موجود ہے؛

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۳؍شوال المکرم ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۳؍شوال المکرم ۱۴۲۶ھ

جہیز کا مال شوہر پر واجب الرد ہے

(۱۳۶) سوال: - جناب میں بوقت شادی سسرال سے بطور شرط جہیز لایا تھا الحمد للہ فی الحال تبلیغی جماعت میں تین چلّے لگایا ہوں اور جہیز کی بُرائی کے متعلق علماء کے بیان سے مجھے علم ہوا اب سوال یہ کہ جہیز کا سامان واپس دینا ہوگا یا نہیں؟ اگر واپس دینا ہو تو کس کو دوں گا، نیز سسرال اگر مجھے معاف کردے تو معافی ہوجائے گی یا نہیں؟

نوٹ: - میری شادی کے وقت سسر اور ان کے دیگر بھائی لوگ ایک ساتھ رہتے تھے اب سب جدا جدا ہوگئے ہیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

کتب فقہ وفتاوی میں مذکور ہے کہ بوقت شادی زوج، زوجہ یا اس کے سرپرستوں سے بطور شرط جو مال وسامان لیتے ہیں وہ رشوت کے تحت داخل ہیں جو کہ حرام وناجائز ہے اور وہ مال جہیز دولہا کے ذمہ واجب الرد رہتا ہے یعنی سسرال کو واپس دینا واجب ہے۔

کما فی "الهندية": ولو أخذ من أهل المرأة شيئاً عند التسليم فللزوج أن يسترده لأنه رشوة. (كتاب النكاح، الفصل السادس عشر فی جهاز البنت: ج ۱ ص ۳۲۷)

لہٰذا صورت مسئولہ میں شوہر پر جہیز کا مال واپس دینا واجب ہے، آپ نے جس سے لایا اس کو (یعنی سسر کو) مال دیدے اس (سسر) نے اگر اپنے بھائیوں کے اجتماعی مال سے جہیز دیا ہے تو وہ اپنے بھائیوں کا حصہ تقسیم کر کے دے دیگا، اس کی مسئولیت آپ پر نہیں ہوگی، سسرال اگر آپکو معاف کردے تو معاف ہو جائے گا۔

واضح رہے کہ سسرال اگر دولہن کو بغیر شرط ہدیۃً کچھ دینا چاہے تو دے سکتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی میں کچھ سامان دیا تھا جسکا ذکر کتب حدیث وتاریخ میں موجود ہے۔

فقط واللہ اعلم.

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۶ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ	۶ ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

* * *

بابُ المُحرَمات

بیوی اپنے مردہ شوہر کو اور شوہر اپنی مردہ بیوی کو دیکھ سکتا ہے

(۱۳۷) **سوال:** - ایک مولانا صاحب نے کہا کہ زوجین میں سے کسی ایک کے انتقال کے بعد، ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور ضرورت کے موقع پر عورت اپنے شوہر کو غسل بھی دے سکتی ہے، مگر شوہر اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا۔

اب سوال یہ کہ جناب مولانا صاحب کی بات کہاں تک درست ہے اور شوہر اپنی بیوی کو غسل کیوں نہیں دے سکتا اور اس کی وجہ کیا ہے؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

جی ہاں! زوجین مرنے کے بعد ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں اور ضرورت کے موقع پر بیوی اپنے شوہر کو غسل بھی دے سکتی ہے، یعنی غسل کے لئے کوئی مرد نہ ملے یا شوہر نے وصیت کی وغیرہ مگر شوہر کسی بھی صورت میں اپنی بیوی کو غسل نہیں دے سکتا البتہ غسل دینے والی عورتوں کو طریقے بتلا سکتے ہیں اور اگر غسل کے لئے کوئی عورت نہ ملے تو شوہر اپنے ہاتھ میں کپڑے لپیٹ کر مردہ بیوی کو تیمم کرا سکتا ہے۔

کما فی "شرح التنویر": (ویمنع زوجها من غسلها ومسها لامن النظر إليها على الأصح) منية وقال فی الشامية (قوله لامن النظر إليهما على الأصح) عزاه فی المنح إلى القنية ونقل عن الخانية أنه إذا كان للمرأة محرم يممها بيده وأما الأجنبی فبخرقة على يده ويغض بصره عن ذراعها وكذا الرجل فی امرأته إلافی غض البصراھ ولعل وجهه أن النظر أخف من المس فجاز لشبهة الاختلاف. والله أعلم. (كتاب الجنائز در مختار مع شامية: ج۲ ص۱۹۸)

عدم جواز کی وجہ یہ کہ عورت (بیوی) انتقال کے بعد دنیا کے اعتبار سے اپنے شوہر کے عقد نکاح سے فوراً نکل جاتی ہے یعنی عورت شوہر کے لئے اجنبی ہو جاتی ہے، اس لئے اجنبی عورت کو مس کرنا جسطرح حرام و ناجائز ہوتا ہے، اسی طرح اپنی مردہ بیوی کو بھی۔

چنانچہ فقہ حنفیہ کی مایۂ ناز کتاب "بدائع وصنائع" میں ہے۔

...... ولأن إباحة الغسل مستفادة بالنكاح فتبقى مابقى النكاح والنكاح بعدالموت باق إلى وقت انقطاع العدة بخلاف ماإذاماتت المرأة حيث لايغسلها الزوج لأن هنالانعدام المحل فصار الزوج أجنبيًا فلايحل له غسلها...... (ج٢ص ٣٠٢، وكذافى الشامية : ج٢ص ١٩٩)

بخلاف شوہر کے یعنی شوہر کے انتقال کے بعد بیوی اس کے عقد نکاح سے فوراً نہیں نکلتی، بلکہ عدت تک شوہر کی بیوی کی حیثیت سے رہتی ہے، اس لئے عورت کے لئے شوہر کی عدت کے اندر شادی کرنا حرام وناجائز ہے پس عورت جبکہ عدت تک مردہ شوہر کی بیوی ہے اس لئے ضرورت کے موقع پر وہ اپنے شوہر کو غسل دے سکتی ہے۔

نوٹ:- کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مردہ بیوی جبکہ شوہر کے لئے اجنبی عورت کی طرح ہے تو اس کو دیکھنا کسطرح جائز ہوگا؟ اس کے جواب میں علامہ ابن عابد بن شامیؒ فرماتے ہیں کہ مس سے نظر اخف ہے اور آخرت کے حق میں نکاح باقی ہے تو دیکھنا اس جہت سے جائز ہے۔

فقط اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۶/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ	۶/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ

سالی کے ساتھ زنا سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوتی

(۱۳۸) سوال:- جناب ایک آدمی نے اپنے بیوی کی حقیقی بہن یعنی سالی سے زنا کیا اب سوال یہ کہ اسکی بیوی پر طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسؤلہ میں سالی کے ساتھ زنا کرنے کی وجہ سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گذرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں البتہ سالی کو ایک حیض آنے تک خاوند اپنی بیوی سے مجامعت کرنے سے باز رہے، اور اگر سالی کو حمل ٹھہر گیا تو وضع حمل تک بیوی سے مجامعت نہ کرے۔

كما فى "شرح التنوير" : وفى الخلاصة : وطئ أخت امرأته لاتحرم عليه

امرأته. و قال فى الشامية: قال : فى البحر لووطئ أخت امرأته بشبهة تحرم امرأته مالم تنقض عدة ذات الشبهة وفى الدراية من الكامل لوزنى بإحدى الأختين لايقرب الأخرى حتى تحيض الأخرىٰ حيضة واشتكله فى الفتح ووجهه أنه لااعتبار لماء الزانى لذا لوزنت امرأة رجل لم تحرم عليه وجاز له وطؤها عقب الزنا (فصل فى المحرمات: ج ۳/ ۳۴)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۲/ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

وطی فی الدبر سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی

(۱۳۹) سوال:- ایک شخص نے ایک اجنبیہ بالغہ عورت سے صرف وطی فی الدبر کی یعنی حیض کی حالت میں اسکے پیچھے کے راستہ سے جماع کیا اب سوال یہ کہ اس عورت کی لڑکی سے اس شخص کا نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالی وعونہ

وطی فی الدبر سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی لہٰذا صورت مسئولہ میں موطوۃ فی الدبر کی لڑکی سے اسکی شادی درست ہے۔

قال فى شرح التنوير: (فلا) تثبت الحرمة بها أصلاً كوطء دبر مطلقًا كمالو أفضاها لعدم تيقن كونه فى الفرج مالم تحبل منه بلافرق بين زنا ونكاح. وقال فى الشامية (قوله مطلقًا) أى سواء كان بصبى لوامرأة كمافى غاية البيان وعليه الفتوىٰ كمافى الواقعات عن البحر وفى الولوالجية اتى رجل رجلاً له أن يتزوج ابنته لأن هذا الفعل لو كان فى الأناث لايوجب حرمة المصاهرة ففى الذكر أولىٰ. فصل فى المحرمات : (ج ۳ص ۳۴)

نوٹ: وطی فی الدبر سے عورت اگر اتفاق سے حاملہ ہوگئی تو موطوۃ فی الدبر کی بیٹی سے شادی درست نہیں

یعنی حرمت مصاہرت ثابت ہوگئی ہے مذکورہ مرد سے عورت بالا کے اصول وفروع کی شادی درست نہیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۶؍ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ	۲۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

اپنی مشتہاۃ لڑکی کو تقبیل کرنے سے حرمت مصاہرت ثابت ہوگی

(۱۴۰) سوال: - جناب ایک شخص رات دو بجے باہر سے گھر آیا اور اپنے کمرہ میں چلا گیا چراغ نہیں جلایا سو گیا اسی کمرہ میں صرف اپنے میاں بیوی رہتے تھے وہ سمجھا کہ اپنے بستر پر بیوی ہے اس گمان سے فرش میں سوئی ہوئی کو مع شہوت مس وتقبیل کی پھر جب فرش والی بیدار ہو کر چیخ ماری تو موصوف کو پتہ چلا کہ وہ اپنی بیوی نہیں تھی بلکہ اپنی جوان لڑکی تھی، اب سوال یہ کہ اس کی بیوی اس کے لئے حرام ہوگئی یا نہیں؟

الجواب باسمہ تعالیٰ

حرمت مصاہرت ثابت ہونے کیلئے عورت کا مشتھاۃ ہونا شرط ہے وہ پائی گئی لہٰذا اس سے بیوی حرام ہوگئی۔

قال فی "شرح التنویر" : وكذالو فزعت فدخلت فراش أبيها عريانة فانتشرلها أبوهاتحرم عليه أمها (وبنت) سنها (دون تسع ليست بمشتها ة) به يفتى.

وقال فی الشامية (قوله ليست بمشتهاة به يفتى) كذا فى البحر عن الخانية ثم قال أفادا أنه لافرق بين أن يكون سمينة أولا ولذا قال فى المعراج بنت خمس لاتكون مشتها ة اتفاقًا بنت تسع فصاعداً مشتهاة اتفاقاً وبنت تسع فصاعداً مشتها ة اتفاقاً فى مابين الخمس والتسع اختلاف الرواية والمشايخ والأصح أنها لاتثبت الحرمة. (كتاب النكاح فصل فى المحرمات : ج ۳ ص ۳۷)

فقط واللہ اعلم۔

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ	۲۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

کسی کی منکوحہ کے ساتھ زنا سے نکاح ٹوٹتا نہیں اور اس کی عدت بھی نہیں

(۱۲۴) سوال: - ایک شخص نے دوسرے کی منکوحہ سے زنا کیا اب سوال یہ کہ زانیہ عورت کا نکاح اپنے شوہر سے باقی ہے یا نہیں؟ اور عورت کو زنا کی عدت گذارنا ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں زانیہ عورت کا نکاح اپنے شوہر سے بحال ہے، عورت کو زنا کی عدت گذارنے کی ضرورت نہیں، شوہر اپنی بیوی سے بدون عدت مجامعت کر سکتا ہے البتہ عورت کو خالص دل سے توبہ کرنا ضروری ہے اسی طرح زانی پر بھی توبہ لازم ہے ورنہ قیامت کے روز سخت سزا ہوگی، اور سب کے سامنے رسوائی ہوگی۔

قال فی الشامیة: قال فی البحر: لوتزوج بامرأة الغیر عالمًا بذلک ودخل بها لاتجب العدة علیها حتی لایحرم علی الزوج وطؤها وبه یفتی لأنه زنی والمزنی بها لاتحرم علی زوجها نعم لو وطئها بشبهة وجب علیها العدة وحرم علی الزوج وطئوها.

(فصل فی المحرمات، مطلب فیما لوزوج المولی امته درمختار مع شامیة: ج۳ص ۵۰)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۲۲؍رمضان ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہٗ
معاون مفتی دار الافتاء
۲۲؍رمضان ۱۴۲۳ھ

كِتَابُ الرَّضَاعِ

رضاعی بیٹے سے سوتیلی بہن کے نکاح کرنے کا حکم

(۱۲۵) سوال: - میں (نور محمد) نے اپنی بیٹی کو میری سوتیلی بہن کے تیسرے بیٹے سے نکاح دیا ہے، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، لڑکی کی عمر پانچ سال ہے واضح رہے، کہ میری سوتیلی بہن نے مجھے بچپن میں چند روز دودھ پلایا، یہ بات ہمیں معلوم ہوئی ہے اور شادی کے بعد سے ابتک میاں بیوی کے درمیان میل و محبت بھی نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ ایک عالم صاحب نے کہا کہ میری لڑکی کا نکاح درست نہیں ہوا، کیونکہ وہ لڑکا میرے رضاعی بھائی ہے، اب سوال یہ کہ عالم صاحب کی بات کہاں تک درست ہے؟ اگر شادی نادرست ہے، تو اب میاں بیوی کو کیا کرنا ہے؟ اور ان سے پیدا ہونے والی لڑکی حلالی ہے یا حرامی؟ لڑکی کی پرورش کون کرے گا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں بڑی بہن نے اگر چھوٹے بھائی کو بچپن میں دودھ پلایا تھا اور اس پر گواہ ہیں یا یہ بات سب رشتہ دار جانتے ہیں تو اس صورت میں بھائی بہن کے درمیان رضاعت کا رشتہ قائم ہو گیا اب نور محمد جو رضاعی بیٹا ہے سوتیلی بہن کا، اس نور محمد کی بیٹی کا نکاح نور محمد کی سوتیلی بہن اور رضاعی ماں کے بیٹے سے ناجائز و حرام ہے، کیونکہ لڑکا اور لڑکی کے درمیان رضاعی چچا بھتیجی کی نسبت ہے اور شریعت کے نزدیک جیسے حقیقی چچا بھتیجی کے درمیان نکاح ناجائز ہے اسی طرح رضاعی چچا بھتیجی کے درمیان بھی نکاح ناجائز و حرام ہے۔

لقوله عليه الصلوٰة والسلام إن الله حرّم من الرضاعة ماحرّم من النسب رواه مسلم (مشكوٰة)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جو رشتہ دار نسب سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں۔

لہٰذا جلد از جلد میاں بیوی کے درمیان تفریق کر دینی چاہئے ازدواجی حیثیت سے دونوں کا ایک ساتھ رہنا ناجائز و حرام ہے اور ساتھ ساتھ میاں بیوی اور ان کے ماں باپ سب کو اللہ تعالیٰ سے اس ناجائز رشتہ کرنے کی وجہ سے توبہ و استغفار کریں اور یہ نکاح چونکہ غلطی کی بنا پر ہوا ہے، تو میاں بیوی کے درمیان جو

وطیٔ ہوئی اُسے شریعت کی اصطلاح میں وطی بالشبہ کہا جاتا ہے اور اس کے تحت جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ حلال زادہ ہوتا ہے، باپ سے اس کا نسب ثابت ہوتا ہے۔

پس صورت مسئولہ کی پیدا شدہ لڑکی حلالی ہے اور اس کا نسب باپ سے ثابت ہوگا، بلا تحقیق نکاح ہونے کی وجہ سے زنا کا گناہ نہیں ہوگا لیکن ضروری تحقیق نہ کرنے سے گناہ ہوگا توبہ کرے، اب اگر مسئلہ معلوم کرنے کے بعد بھی تعلق قائم رکھا تو زنا کا گناہ ہوگا اور شوہر کے ذمہ میں عورت کا حق مہر باقی ہے تو اُسے ادا کر دینا لازم ہے اور عورت اگر دوسری شادی کرتی ہے تو عدت کے بعد شادی کرنی ہوگی اور اس کی عدت بھی مطلّقہ عورت کی عدت کی طرح ہے۔

كمافی "شرح التنوير" (وتجب العدة بعد دخول الوطاء) لاخلوة للطلاق لاللموت من وقت التفريق) أومتاركة الزوج. (درمختار مع الشامیہ ج۳ص۱۳۳)

وفی موضع اٰخر (ويثبت النسب) احتياطًا بلادعوة.

(د رمختار مع شامیہ ج۳ص ۱۳۴)

لڑکی کی ماں دوسری شادی نہیں کریگی تو لڑکی ماں کی پرورش میں رہے گی اور شادی کی صورت میں نانی کی پرورش میں رہے گی یعنی نو سال تک لڑکی اس کی ماں یا نانی کی پرورش میں رہے گی اور خرچہ باپ دیگا اور لڑکی کی عمر جب نو سال ہوگی تو وہ باپ کے پاس رہے گی تعلیم و تربیت کا خرچ باپ دیگا اور اگر ماں باپ رضامندی سے ننھیال میں تعلیم و تربیت جاری رکھنا چاہیں گے یہ بھی کر سکتے ہیں۔

كما فی "شرح التنوير": (الحاضنة) اما أوغيره (أحق به) أى بالغلام حتى يستغنى عن النساء وقدربسبع وبه يفتى لأنه الغالب ...... (والأم والجدة) لأم أ ولأب وفى الشامية (قوله وبه يفتى) وقيل بتسع سنين الخ. ج۳ص ۵۶۶)

واللّٰه اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ — ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ

رضاعی بھائی سے رضاعی بہن کی حقیقی بہن کا نکاح درست ہے

(۱۲۶) سوال:- زید اور عائشہ دونوں نے حالت صغر میں آمنہ نامی ایک عورت سے دودھ پیا اور عائشہ کی

عابدہ نامی ایک حقیقی بہن ہے اب سوال یہ کہ عابدہ کا نکاح زید سے درست ہے یا نہیں؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

رضاعی لڑکے، لڑکی کیلئے رضاعی ماں کے اصول وفروع سے نکاح کرنا حرام ہے اور صورت مسئولہ میں عابدہ نہ آمنہ کے اصول وفروع میں داخل ہے، نہ اس نے آمنہ کا دودھ پیا، پس زید سے عابدہ کا نکاح درست ہے۔

قال فی "شرح التنویر": وتحل أخت اخيه رضاعًا.

(باب الرضاع درمختار مع شامية: ج ۳ص۲۱۷)

فقط واللہ أعلم.

الجواب صحیح | کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ | معاون مفتی دار الافتاء
یکم ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ | یکم ربیع الاوّل ۱۴۲۴ھ

رضاعی لڑکے سے رضاعی بہن کے نسبی اصول وفروع کا نکاح درست ہے

(۱۲۷) سوال: - رضاعی بہن کی حقیقی ماں، نانی، دادی، خالہ، پھوپھی، بھانجی وغیرہ عورتوں کو لڑکی کے رضاعی بھائی سے پردہ کرنا ہوگا یا نہیں؟ اور رضاعی لڑکے سے ان عورتوں کی شادی درست ہے یا نہیں؟ ویسا ہی رضاعی بھائی کے نسبی باپ، دادا، نانا، بھائی، ماموں، چاچا وغیرہ مردوں سے لڑکے کی رضاعی بہن کو پردہ کرنا ہوگا یا نہیں؟ اور ان مردوں سے رضاعی لڑکی کا نکاح درست ہے یا نہیں؟ مثلاً رضاعی ماں عالیہ تو عالیہ کا رضاعی لڑکا زید ہے اور عائشہ اس کی رضاعی لڑکی ہے اب زید اور عائشہ کے نسبی اصول وفروع کے درمیان نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ کی عورتوں کو رضاعی لڑکے زید سے پردہ کرنا ضروری ہے چونکہ ایک دوسرے کے درمیان محرمات کا تعلق نہیں اور انکا نکاح بھی زید سے درست ہے، ویسا ہی رضاعی لڑکی عائشہ کو بھی اپنے رضاعی بھائی زید کے نسبی باپ، داد، نانا، بھائی، ماموں، چاچا وغیرہ مردوں سے پردہ کرنا لازم ہے اور ان مردوں سے عائشہ کا نکاح درست ہے۔

قال فی "شرح التنویر": (فیحرم منه) بسببه (مایحرم من النسب) رواه الشیخان واستثنٰی بعضهم إحدی وعشرین صورة وجمعها فی قوله: یفارق النسب الرضاع فی صورة کأم نافلة أوجدة الولد، وأم أخت وأخت وأم أخ وأم خال وعمة ابن اعتمد .... فان حرمة أم اخته وأخیه وأخیه نسبًا لکونهاأمه أوموطؤة أبیه وهذا المعنی مفقود فی الرضاع لا) قس علیه (أخت إبنه) وبنته (وجدة ابنه) وبنته (وأم عمه وعمته وأم خاله وخالته، وکذاعمة ولده وبنت عمته وبنت أخت ولده وأم أولاد ه فهؤلاء من الرضاع حلال للرجل.

(درمختار مع شامیه: ۴/۲۱۳)

فقط اللّٰہ تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ	۱۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

رضاعی ماموں سے رضاعی بھانجی کا نکاح نادرست ہے

(۱۲۸) سوال: -رضاعی بھانجی سے رضاعی لڑکے کی شادی درست ہے یانہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب۔

حدیث شریف میں ہے: یحرم من الرضاعة مایحرم من الولادة، رواه البخاری.

یعنی جو رشتے نسب کی وجہ سے ایک دوسرے کیلئے حرام ہیں وہی رشتے دودھ پینے کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کے لئے حرام ہوجاتے ہیں یعنی رضاعی ماں کے اصول وفروع رضاعی لڑکے، لڑکی کے لئے حرام ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں رضاعی بھانجی کا نکاح رضاعی ماموں سے درست نہیں ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب،

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
یکم ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ	یکم ربیع الثانی ۱۴۲۲ھ

کِتَابُ الطَّلَاقِ

فلاں علاقہ سے نکاح نہیں کروں گا پھر نکاح کی صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہوگی

(۱۲۹) سوال: - کسی نے یہ کہا کہ میں اگر فلاں علاقہ سے نکاح کروں تو میری بیوی پر طلاق ہے، اب اگر اس نے فلاں علاقہ سے نکاح کرلیا تو اس کی بیوی پر طلاق ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں حالف اگر اسی علاقے سے شادی کریگا تو اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوگی پھر میاں بیوی اگر رہنا چاہے تو تجدید نکاح کر کے زندگی گذار سکتے ہیں، حیلہ شرعی کی ضرورت نہیں، مگر یاد رہے کہ شوہر کو آیندہ صرف دو طلاقوں کا حق رہے گا یعنی مزید دو طلاقوں سے بیوی شوہر کے لئے حرام ہو جائے گی، پہلے والی طلاق پڑی رہی ہے اور مزید دو طلاقوں سے حرمت مغلظہ آئے گی۔

قال في "الهداية": وإذا أضاف الطلاق إلى النكاح وقع عقيب النكاح مثل أن يقول لامرأة إن تزوجتك فأنت طالق أو كل امرأة اتزوجها فهي طالق.

(باب الايمان في الطلاق: ج ۲ ص ۳۸۵)

واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۵ جمادی الاوّل ۱۴۲۵ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۵ جمادی الاوّل ۱۴۲۵ھ

طلاق کے بارے میں میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہونا

(۱۳۰) سوال: - عورت کا دعویٰ ہے کہ اس کے شوہر نے اُسے تین طلاقیں دیدی ہیں جس میں ذرہ برابر شبہ نہیں، مگر شوہر اسکا منکر ہے عورت کو اس پر کوئی گواہ نہیں، اب سوال یہ کہ عورت کیلئے اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی زندگی گذارنا درست ہوگا یا نہیں، نیز عورت کو عدت کے بعد دوسری جگہ شادی کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں جب عورت نے خود شوہر کی تین طلاقیں دینے کو سن لیا ہے اور اس کو پورا یقین بھی ہے تو شرعاً عورت پر تین طلاقیں واقع ہونے کا حکم دیا جائیگا پس بدون حیلہ شرعی کے عورت کو شوہر کے ساتھ رہنا درست نہ ہوگا اور عورت عدت گذارنے کے بعد دوسری جگہ شادی بھی کرسکتی ہے۔

قال فی " الشامية": والمرأة كالقاضی إذا سمعته أو أخبرها عدل لايحل لها تمكينه.

البتہ شوہر جب کہ طلاق کا منکر ہے اس لئے جب تک دونوں کے درمیان علیحدہ گی کا فیصلہ نہ ہوگا تب تک عورت دوسری جگہ شادی کرنے سے احتراز کرے گی۔

نوٹ: شوہر اگر عورت کو نہ چھوڑے تو عورت پنچائت میں مسئلہ پیش کرے گی تا کہ پنچائت علماء کرام سے تحقیق کر کے اس کا شرعی حل کریں اور اگر پنچائت بھی کچھ فیصلہ نہ کرسکیں تو بالآخر عورت اپنے مہر سے کچھ حصہ شوہر کو دیکر اس سے خلاصی کی کوشش کرے چونکہ عورت کو کسی حالت میں بھی اس کے ساتھ رہنا درست نہیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ	۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

تین طلاق مغلظہ کا حکم

(۱۳۱) سوال: -جناب مفتی صاحب! میرا چچا میرے اور دو چچا زاد بھائیوں سے جھگڑا کرتے رہے پھر جب جھگڑا ختم ہو چکا تو چچا صاحب نے اپنی بیوی کا نام لیکر تین طلاق کہدیں، اسکے بعد کہا ایک طلاق دو طلاق، تین طلاق، یہ سب باتیں میں نے خود قریب سے سنیں پھر چچا نے چچی کے بھائی کو جو وہاں پر موجود تھا مخاطب ہو کر کہا کہ اپنی بہن کو لے جاؤ، میں نے اس کو صاف طلاق دے ڈالی، اب سوال یہ کہ عورت پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں اور ان کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں میاں بیوی ایک دوسرے کیلئے حرام ہوگئے ہیں، ان کے لئے بلا تحلیل شرعی دوبارہ ایک ساتھ رہنا ناجائز و حرام ہیں، البتہ عورت اگر بعد عدت دوسری جگہ شادی کرے اور زوج ثانی سے صحبت کے بعد اس نے طلاق دیدی یا اس کا انتقال ہوگیا تو پھر عورت طلاق یا شوہر ثانی کی موت کے عدت گذارنے کے بعد زوج اوّل سے شادی کرسکتی ہے۔

قال فی "الهداية": إن كان الطلاق ثلاثًا فی الحرة وثنتين فی الأمة لم تحل له حتى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلقها أويموت عنها.

(كتاب الطلاق ، باب الرجعة ، فصل فيما تحل به المطلقة)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ

محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء

یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۲۷ھ — یکم جمادی الاخریٰ ۱۴۲۷ھ

(۱۳۲) سوال: - جناب مفتی صاحب! ہمارے میاں بیوی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا پھر میں نے بیوی کو اس کی ماں کا نام لیکر کہا کہ فلاں کی بیٹی تجھے ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق، دیدی، اب سوال یہ کہ صورت حال میں میری بیوی پر طلاق واقع ہوئی ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں ہوگئیں، اب میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حرام ہوگئے ہیں، یعنی دونوں کے درمیان ازدواجی زندگی جائز نہیں ہے، نہ تجدید نکاح درست ہے، عورت کا حق مہر اگر شوہر نے ادا کردیا تو بہتر، ورنہ اس کا حق مہر ادا کردینا شوہر پر لازم ہے۔

نوٹ: - عورت اگر بعد عدت دوسری جگہ شادی کرئے اور زوج ثانی سے صحبت کے بعد اس نے اس کو طلاق دیدیا یا اسکا انتقال ہوگیا تو پھر عورت طلاق یا موت کی عدت گذارنے کے بعد زوج اوّل سے نکاح کرسکتی ہے، اسکے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

قال فی "الهداية": إن كان الطلاق ثلاثا فی الحرة أوثنتين فی الأمة لم تحل له

حتی تنکح زوجاً غیرہ نکاحاً صحیحاً ویدخل بھا ثم یطلقھا و یموت عنھا

(کتاب الطلاق، باب الرجعة ، فصل فیما تحل به المطلقة)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۸ر رجب ۱۴۲۳ھ	۱۸ر رجب ۱۴۲۳ھ

(۱۳۳) سوال: -جناب مفتی صاحب! میاں بیوی کے درمیان اختلاف ہوا نیز چند سال گذر گئے بیوی سے کوئی بچہ نہیں ہوا اس لئے شوہر نے گواہوں کے سامنے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدیا اور یہ کہا کہ آج سے وہ میری بیوی نہیں میں اسکا شوہر نہیں۔ اب میاں بیوی پھر زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو ان کا شرعاً حکم کیا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حرام ہوگئے ہیں، اب دونوں کے درمیان ازدواجی زندگی جائز نہیں ہے، نہ تجدید نکاح درست ہے، عورت کا حق مہر شوہر نے ادا کردیا تو بہتر ورنہ اس کا حق مہر ادا کردینا شوہر پر لازم ہے، زوج اوّل کے لئے بیوی حلال ہونے کا حیلہ یہ ہے کہ عورت اگر بعد عدت دوسری جگہ شادی بیٹھے گی اور زوج ثانی سے صحبت کے بعد اس نے اُس کو طلاق دیدیا یا اس کا انتقال ہوگیا تو پھر عورت طلاق یا موت کی عدت گذارنے کے بعد زوج اوّل سے نکاح کرسکتی ہے، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

قال فی "الھدایہ": إن کا ن الطلاق ثلاثًافی الحرة أوثنتین فی الأمة لم تحل له حتی تنکح زوجًا غیرہ نکاحًا صحیحًا ویدخل بھا ثم یطلقھا أویموت عنھا.

(کتاب الطلاق، باب الرجعة فصل فیما تحل به المطلقه)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۵ر رجب المرجب ۱۴۲۷ھ	۵ر رجب المرجب ۱۴۲۷ھ

عورت کا شوہر کو طلاق دینا

(۱۳۴) سوال: - گذشتہ ۴ رفروری ۲۰۰۲ھ کو بیوی نے اپنے شوہر کو کابین نامہ کی شرائط کے مطابق سٹی کارپوریشن کے ذریعہ طلاق دیدیا ہے، طلاق دینے میں عورت کے الفاظ یہ ہیں: کہ عورت کی جانب سے وکیل نوٹش نامہ میں لکھتے ہیں کہ میری موکلہ اپنے شوہر نجم الشہادت کو کابین نامہ کی شرائط کے مطابق آج مؤرخہ ۴/۲/۲۰۰۲ھ طلاق دیتی ہے اور تعلق کو ختم کرتی ہے سٹی کارپوریشن کے تحت ۹۰ (نوے) دن گذرنے کے بعد طلاق واقع کردی گئی، اب بیوی شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے اور شوہر بھی اس کو رکھنا چاہتا ہے، اب شرعاً انکا کیا حکم ہوگا؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شریعت نے طلاق دینے کا حق شوہر کو دیا ہے عورت کو نہیں چنانچہ حدیث شریف میں ہے: ”اَلطَّلَاقُ لِمَنْ اَخَذَ بِالسَّاقِ“ یعنی طلاق شوہر دے سکتا ہے عورت نہیں، البتہ عند النکاح شوہر نے اگر عورت کو اپنے نفس پر مع شرائط طلاق دینے کا حق دیدیا، تو شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں عورت شوہر کی جانب سے اپنے نفس پر طلاق واقع کرسکتی ہے، اس سے وہ مطلقہ ہوجائیگی اور طلاق کے الفاظ اس طرح کہنا ہوگا:

”کہ میں اپنے نفس پر تین طلاقیں واقع کرتی ہوں“ واضح رہے کہ تفویض طلاق کی صورت میں بھی عورت اگر اپنے نفس پر طلاق واقع کرنے کے بجائے شوہر کو طلاق دیوے تو اس سے عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں عورت پر طلاق واقع نہیں ہوئی، اب اگر میاں بیوی ایک ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو رہ سکتے ہیں حیلہ شرعی وغیرہ کی ضرورت نہیں۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالی اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۹ ربیع الاوّل ۱۴۲۳ھ

ابھی چلی جا طلاق دوں گا

(۱۳۵) سوال: -میاں بیوی کے درمیان جب جھگڑا شروع ہوا تو بیوی نے کہا کہ حالت تو ایسی معلوم ہوتی ہے کہ مجھے ابھی چلے جانا ہوگا، پھر شوہر نے کہا ''چلی جا'' میں تجھے ایک طلاق دو طلاق، تین طلاق، بائن طلاق دوں گا جھگڑے کے دوران بات یہاں تک ہوئی اب انکا شرعی فیصلہ کیا ہوگا؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

صورت مسئولہ میں ''ابھی چلی جا'' یہ الفاظ کنایہ میں سے ہیں، شوہر نے اگر طلاق کی نیت سے کہا تو ایک طلاق بائن واقع ہوئی، اب میاں بیوی ازدواجی زندگی گذارنا چاہیں تو تجدید نکاح ضروری ہے، نیز شوہر آئندہ صرف دو طلاقوں کا مالک رہے گا یعنی دو طلاق دینے سے عورت شوہر پر حرام ہو جائے گی، البتہ تین طلاقوں کی نیت سے کہا تو بیوی حرام ہوگئی ہے بدون حیلہ شرعی عورت حلال نہیں ہوگی۔

قال في "الهداية". وبقية الكنايات إذانوى بها الطلاق كانت واحدة بائنة وإن نوى ثلاثا كان ثلاثا.......... واخرجي واذهبي وقومي وابتغي الأزواج لأنها تحتمل الطلاق وغيره فلابد من النية.

(باب إيقاع الطلاق تحت فصل في الطلاق قبل الدخول . ج ۲ ص ۳۷۴)

(نوٹ):- ''ایک طلاق، دو طلاق، تین طلاق، بائن طلاق دوں گا'' مذکورہ الفاظ سے طلاق واقع نہیں ہوتی چونکہ یہ طلاق کا وعدہ ہے اور وعدۂ طلاق سے طلاق نہیں ہوتی۔

قال في "الحامدية: صيغة المضارع لايقع بهاالطلاق إلا إذاغلب في الحال كماصرح به الكمال ابن الهمام (حامدية ج ۱ ص ۳۸، وكذافي الشامية تحت (قوله وبمعناها من الصريح) وكذاالمضارع إذاغلب في الحال مثل أطلقك كمافي البحر.

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
یکم ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ	یکم ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ

تین طلاق مغلظہ کا حکم

(۱۳۶)سوال: - جناب مفتی صاحب! میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوا تو شوہر نے جب بیوی کو مارنا شروع کیا تو بیوی نے بھی شوہر کو مارا پھر شوہر نے کہا تجھے ایک طلاق دو طلاق تین طلاق، اب اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب بتوفیق اللہ تعالیٰ وعونہ

صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاق مغلظہ واقع ہوگئیں، اب ایک دوسرے کے لئے حرام ہوگئے، یعنی دونوں کے درمیان بلا تحلیل شرعی نکاح درست نہیں، البتہ عورت عدت گذارنے کے بعد اگر دوسری جگہ شادی کرے اور دوسرے شوہر سے مجامعت کے بعد شوہر کا انتقال ہوگیا یا اس نے اسے طلاق دیدی اور عورت نے بھی موت یا طلاق کی عدت گذار لی تو پھر زوج اوّل سے اس کی شادی درست ہوگی ورنہ نہیں۔

قال في "الهداية": وإن كان الطلاق ثلاثًا في الحرة أوثنتين في الأمةلم تحل له حتى تنكح زوجاً غيره نكاحاً صحيحًا ويدخل بها ثم يطلقها أويموت عنها.

(باب الرجعة تحت فصل فيما تحل به المطلقة. ج ۲ ص ۳۹۹)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۱۷/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ	۱۷/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ

عورت کا شوہر کو طلاق دینا

(۱۳۷)سوال: - جناب مفتی صاحب! ایک عورت نے شوہر کے ساتھ جھگڑا کرنے کے بعد عدالت میں جا کر اپنے شوہر کو تین طلاقیں دیدی ہیں اب سوال یہ کہ میاں بیوی کو ازدواجی زندگی گذارنا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

شریعت نے طلاق دینے کا حق خاوند کو دیا ہے عورت کو نہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے اَلطَّلَاقُ

لِمَنْ أَخَذَ بِالسَّاقِ یعنی طلاق شوہر ہی دے سکتا ہے، عورت نہیں البتہ عند النکاح شوہر اگر عورت کو اپنے نفس پر مع شرائط طلاق دینے کا حق دے دیا ہے تو شرائط کی خلاف ورزی کی صورت میں عورت شوہر کی طرف سے اپنے نفس پر طلاق واقع کر سکتی ہے، اس سے وہ مطلقہ ہو جائیگی اور طلاق کے الفاظ اس طرح کہنا ہونگے کہ میں اپنے نفس پر تین طلاق واقع کرتی ہوں واضح رہے کہ تفویض طلاق کی صورت میں بھی عورت اگر اپنے نفس پر طلاق واقع کرنے کے بجائے شوہر کو طلاق دیوے تو اس سے عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی۔

فقط و اللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲؍محرم الحرام ۱۴۲ھ	۲؍محرم الحرام ۱۴۲ھ

شوہر کا طلاق نامہ بغیر پڑھے دستخط کرنا

(۱۳۸) سوال: - کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ: زید نے اپنی بیوی سے ناراضگی کی بنا پر اس کو مارا پیٹا بیوی نے تکرار و بحث کے بعد الماری کی چابی نکال کر الماری سے سارا ضروری سامان لیکر شوہر کی غیر موجودگی میں میکہ چلی گئی، رابطہ کرنے پر جواب دیا کہ بیوی میکہ میں ہے ان کے ہمراہ ایک دو سالہ بچہ بھی ہے، زوجین کے سرپرستوں نے معاملہ کو سلجھانے کی جگہ پیچیدہ بنا دیا، درمیان میں دو سال گذر گئے، جس سے پریشان ہو کر بیوی کے والدین اپنے عزیزوں سے مشورہ کر کے شوہر کے خلاف ظلم و تشدد کی بنا پر علیحدگی کا کیس کیا اور اپنے جملہ حقوق کو واپس کرنے کا مطالبہ بھی کیا، شوہر والوں کو جب اس کا پتہ چلا تو انہوں نے وکیل سے مشورہ کر کے ایک طلاق نامہ بطور نوٹس کیس سے ایک ماہ قبل کی تاریخ دیکر عورت کے نام پر بھیجدیا، اور طلاق نامہ میں تین طلاقیں لکھدی گئیں، وکیل اور شوہر کا کہنا ہے کہ اس نے طلاق نامہ کو پڑھا نہیں، بغیر پڑھے دستخط کیا اور بھیجدیا، طلاق نامہ کے بارے میں جب سوال کیا گیا تو عدالت میں اور اس سے باہر شوہر نے اقرار کیا کہ ان پر کیس لاگو نہیں، ہوگا کیونکہ طلاق نامہ بنام نوٹس پہلے سے بھیجدیا، فیملی جج نے جب شوہر سے پوچھا، تو اس نے بتایا کہ طلاق نامہ اُسے بھیجا ہے اور اس کی طرف سے جج صاحب نے ڈگری دیدی ہے، کیونکہ عرضی پیش ہونے میں مراجعت کی تاریخ تین ماہ گزر گئے بیوی نے مہر وغیرہ کا دعوی کیا، اب شوہر اپنی بیوی اور بچہ کو واپس لانا چاہتا ہے جبکہ کیس کے بعد مہر

کا تیسرا حصہ بیوی نے وصول کیا ہے قسطوں میں شوہر ادا کررہا ہے اس طلاق نامہ کے بارے میں مدرسۂ ہاٹہزاری سے فتویٰ لیا گیا ہے جس میں بیوی کے سوال میں بتایا گیا نکاح ختم ہوچکا ہے تین طلاقیں ہوگئیں رجوع جائز نہیں اور شوہر والوں نے مدرسۂ ہاٹہزاری میں ایک سوال نامہ بھیج کر اور ایک فتویٰ حاصل کیا ہے اس میں لکھا گیا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی رجوع جائز ہے، لہٰذا آپ لوگوں سے شرعی فیصلہ مطلوب ہے کہ ان دونوں فتاویٰ میں سے کونسا فتویٰ اور جواب درست ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

فتاویٰ شامیہ میں ہے:

ولو استکتب من اٰخر کتابا بطلاقها وقرأ علی الزوج فأخذه الزوج وختمه و عنونه وبعث به إلیها فأتاها وقع أن أقرّ الزوج أنه کتابه أوقال للرجل ابعث به إلیها أو قال له اکتب نسخة وابعث بها إلیها وإن لم یقر أنه کتابه ولم تقم بینة لکنه وصف الأمر علی وجهه لاتطلق قضاء وإلادیانة وکذا کل کتاب لم یکتبه بخطه ولم یمله بنفسه لایقع الطلاق مالم یقر أنه کتابه ملخصًا.

(کتاب الطلاق مطلب فی الطلاق بالکتاب: ج۳ص ۲۴۶)

یعنی شوہر اگر عورت کی جانب سے مقدمہ میں ماخوذیت سے بچنے کے لئے وکیل سے کہدے کہ تین طلاق پر مبنی طلاق کا نوٹس عورت کی طرف بھیجدے تاکہ مقدمہ اس پر لاگو ہی نہ ہو، یہ شوہر کی طرف سے تین طلاقیں صریح ہیں۔ لہٰذا عورت پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اس میں شوہر طلاق کی نیت کرے یا نہ کرے کیونکہ صریح طلاق نامہ میں نیت کی حاجت نہیں ہوتی نیز سوال میں مذکور ہے کہ شوہر نے عدالت میں جج کے سامنے طلاق نامہ بھیجنے اور اس کی جانب سے بھیجے جانے کا اقرار کیا ہے اور جج نے اسی بناپر ڈگری بھی دیدی ہے پھر اس کے بعد وکیل اور شوہر کا کہنا کہ ”بدون پڑھے طلاق نامہ میں دستخط کیا ہے“ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوگا۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں مغلظہ ہوگئیں، میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حرام ہوگئے ہیں، اب بدون حیلہ شرعی کے شوہر کے لئے رجوع کرنا درست نہیں ہوگا اور ہاٹہزاری کا پہلا فتویٰ جو بیوی کے سوال کے جواب میں دیا گیا وہ درست اور قابل عمل ہے اور دوسرا فتویٰ جو عدم طلاق کا حاصل کیا گیا ہے وہ قابل غور اور نا قابل عمل ہے۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح	محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ کتبہ:
محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۳/ جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ	۳/ جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ

(۱۳۹) سوال:- مخدومی ومحترمی جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، بعد سلام مسنون عرض یہ کہ شوہر نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی کو ایک طلاق دو طلاق، تین طلاق کہا اس پر گواہ ہیں۔

(۱) بیوی کی گواہی: وہ کہتی ہے کہ اس (شوہر) نے طلاق کہی ہے مگر کتنی بار کہا مجھے یاد نہیں۔

(۲) ماں کی گواہی: وہ کہتی ہے کہ اس نے ایک طلاق دو طلاق تین طلاق کہی ہے۔

(۳) چچی کی گواہی: وہ کہتی ہے کہ اس نے کہا کہ ایک طلاق دو طلاق تین طلاق دیدی، اب قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا صحیح جواب مطلوب ہے۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں عورت پر تین طلاقیں واقع ہوگئیں، اب میاں بیوی ایک دوسرے کیلئے حرام ہوگئے، یعنی دونوں کے درمیان ازدواجی زندگی جائز نہیں اور بدون حیلہ شرعی کے تجدید نکاح درست نہیں، لہٰذا اگر شوہر کے گھر میں عورت پردہ کے ساتھ عدت گذار سکتی ہے تو تین حیض تک رہے، عدت گذارنے کا خرچہ شوہر پر ہوگا اور شوہر نے حق مہر ادا کردیا ہے تو بہتر، ورنہ اس کا حق مہر ادا کردینا شوہر پر لازم ہے اور ان کے چھوٹے بچے ماں کی پرورش میں رہیں گے اگر ماں کی دوسری جگہ شادی ہوگئی تو نانی کی پرورش میں رہیں گے یعنی لڑکا سات سال تک اور لڑکی نو سال تک رہے گی اور اس مدت میں بچوں کے نان ونفقہ کا ذمہ دار باپ رہیگا۔

نوٹ:- عورت اگر بعد عدت دوسری جگہ شادی کرے گی اور زوج ثانی سے صحبت کے بعد زوج ثانی نے اسے طلاق دیدی یا اس کا انتقال ہوگیا، تو پھر عورت طلاق یا موت کی عدت گذارنے کے بعد زوج اوّل سے نکاح کرنا چاہے اور زوج اوّل بھی راضی ہو تو نکاح جائز ہوگا۔

قال فی " الهدایه ": إن کان الطلاق ثلاثا فی الحرة أوثنتین فی الأمة لم تحل له

حتى تنكح زوجًا غيره نكاحًا صحيحًا ويدخل بها ثم يطلقها أو يموت عنها (كتاب الطلاق فصل فيما تحل به المطلقة) وقال في شرح التنوير (والحاضنة) إما أو غيرها (أحق به) بالغلام حتى يستغني عن النساء وقدر بتسع وبه يفتى لأنه الغالب الخ.

فقط والله أعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۳؍جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۳؍جمادی الاخری ۱۴۲۷ھ

……

* * *

بَابٌ فِی الْعِدَّةِ

عورت کو کرایہ کے گھر میں عدت گذارنے کا حکم

(۱۴۰) سوال: - ایک شخص نوکری کرتا تھا اور بیوی بچے لیکر سرکاری کوارٹر میں رہتے تھے، اب اس کا انتقال ہوگیا، بیوی چاہتی ہے کہ شوہر کے گاؤں کے گھر میں عدت گذارے کیونکہ وہ کہتی ہے کہ جب میں اس گھر میں داخل ہوتی ہوں تو مجھے اپنے شوہر کی بات یاد آتی ہے اور میرا دل پریشان ہوجاتا ہے اس حالت میں عورت کو گاؤں کے گھر میں عدت گذارنا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

قال فی "التنویروشرحه" (تعتدان) أی معتدة طلاق وموت (فی بیت وجبت فیه) ولا تخرجان منه) (إلا أن تخرج أو ینهدم المنزل أو تخاف) انهدامه أو (تلف مالها أولا تجد کراء البیت) ونحو ذلک من الضرورات فتخرج لأقرب موضع إلیه. (درمختار مع شامیه فصل الحداد: ج ۳ ص ۵۳۶)

یعنی شوہر کے انتقال کے وقت عورت جس گھر میں رہتی تھی اسی گھر میں اس کو عدت گذارنا ضروری ہے بلا عذر وہاں سے نکلنا اور دوسری جگہ جانا درست نہیں خواہ یہ گھر شوہر کا مملوکہ ہو یا کرایہ کا۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں عورت کو کوارٹر میں عدت گذارنا ضروری ہے گاؤں میں جا کر عدت گذارنا درست نہیں ہے۔

نوٹ: - شوہر کے انتقال کے وقت عورت اگر دوسرے کسی کے گھر میں ہو جہاں اس کے کھانے، پینے کا انتظام نہ ہو یا کوئی محرم نہ ہو یا چور یا ڈاکو وغیرہ کا خوف ہو، یا مالکِ مکان کرایہ کے گھر میں رہنے نہ دے تو مذکورہ بالا صورتوں میں عورت دوسری کسی قریبی جگہ جا کر عدت گذار سکتی ہے۔

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
یکم صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
یکم صفر المظفر ۱۴۲۳ھ

كتابُ الأيمان

(۱۴۱) سوال: - جناب مفتی صاحب! کفارۂ قسم کے متعلق بعض سوالات معروض ہیں امید ہے کہ جوابات سے نوازیں گے۔

(۱) قسم کے کفارہ میں بیس مساکین کو اگر ایک وقت کھانا کھلایا جاوے تو کفارہ ادا ہوگا یا نہیں؟

(۲) قسم کے کفارہ میں کتنی مقدار کپڑا دینا چاہئے؟

(۳) قسم کے کفارہ میں نیا کپڑا دینا ضروری ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب (۱): - ایک وقت میں بیس محتاجوں کو کھانا کھلانے سے کفارا ادا نہیں ہوگا، بلکہ دس محتاجوں کو دووقتہ یعنی صبح وشام کھانا کھلانا ہوگا یا ایک محتاج کو دس روز دووقتہ کھانا کھلائے تو بھی درست ہوگا۔

قال فی "الشامية": (قوله عشر مساكين) تحقيقًا أو تقديرًا حتى لو أعطى مسكينًا واحدًا في عشرة أيام كل يوم نصف صاع يجوز ولو أعطاه في يوم واحد بدفعات عشر ساعات قيل يجزى وقيل لا وهو الصحيح.

(مطلب كفارة اليمين: ج۳ص۷۲۵)

جواب (۲): - اتنی مقدار کپڑا دینا جس سے اپنے بدن کا اکثر حصہ ڈھانپ سکے اور اس میں نماز بھی درست ہو، مسکین اگر مرد ہے تو اُسے ایک جوڑا یعنی ایک لنگی اور ایک قمیص دینا ہوگا اور عورت کو دیوے تو تین کپڑے دیوے یعنی قمیص شلوار اور دوپٹہ یا ایک موٹی قسم کی ساڑی بڑی اور ایک بلاوز۔

قال فی "الشامية": (قوله ويستر عامة البدن) أى أكثره.

(مطلب كفارة اليمين: ج۳ص۷۲۶)

جواب (۳): - نیا کپڑا دینا بہتر ہے البتہ کپڑا اس قدر پُرانا ہو کہ صرف چند روز استعمال کیا آئندہ ایک خاص مدت تک اس کو استعمال کیا جاسکے گا تو اس قسم کے پُرانے کپڑے سے کفارہ ادا ہوجائے گا اور اگر زیادہ استعمال ہوا ہے اور آئندہ دیر تک استعمال نہیں کر سکے گا، پھر اس کا دینا کفارہ میں درست نہ ہوگا۔

قال فی "الشامية" (قوله بما يصح للأوساط) وقيل يعتبر في الثوب حال القابض إن كان يصلح له يجوز وإلا فلا قال السرخسي: والأوّل أشبه بالصواب

بزازية (قوله وينتفع به فوق ثلاثة أشهر) لأنها أكثر نصف مدة الثوب الجديد كمافى الخلاصة فلايشترط كونه جديدًا والظاهر أنه لو كان جديدًا رقيقًا لايبقى هذه المدة لايجزى. (مطلب كفارة اليمين : ج۳ص ۷۲۶)

فقط واللہ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۵/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

نذر کا وہی کفارہ ہے جو قسم کا کفارہ ہے

(۱۴۲) سوال:- میں نے منت مانی تھی کہ ایک ختم قرآن پڑھوں گا اور دو جمعہ روزہ رکھوں گا مگر اب میں بیمار ہو گیا ہوں، روزہ اور ختم قرآن کی طاقت مجھے نہیں، مریض ہونے کے ساتھ ساتھ، بوڑھا بھی ہوں، لہٰذا آئندہ بھی امید نہیں کہ تلاوت قرآن کر سکوں، اب سوال یہ کہ دوسرے کسی آدمی کے ذریعہ سے ان چیزوں کی نذر ادا کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بصورت مسئولہ یہ منتیں عبادت بدنی کے قبیل سے ہیں اور عبادت بدنی میں نیابت نہیں چلتی یعنی نذر ماننے والے پر اسکی ادائیگی لازم ہوتی ہے دوسرے کے ادا کرنے سے ادا نہیں ہوتیں۔

قال فی "شرح التنویر": (والبدنية) كصلاة وصوم (لا) تقبلها مطلقًا.

پس مذکورہ منتوں کو دوسرے کے ذریعہ ادا کرانا درست نہیں ہوگا تندرست ہونے کے بعد خود ہی ادا کرنا ہوگا، البتہ ناذر اگر شیخ فانی ہے یا ایسا مریض ہے کہ افاقہ ممکن نظر نہیں آتا تو اس کی ادائیگی کا طریقہ یہ ہوگا کہ ہر روزہ کے بدلہ میں پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت کسی فقیر کو دیوے اور ختم قرآن کے بدلہ میں ایک قسم کا کفارہ دینا ہوگا یعنی دس محتاجوں کو دو وقتہ کھانا کھلاوے یا ہر ایک فقیر کو ایک صدقۂ فطرہ کی قیمت دیدیوے اور توبہ واستغفار کرے۔

قال فی "الهندیه": ولو أخر القضاء حتى صار شيخًا فانيا أو كان النذر بصيام الأبد فعجز لذلك أو باشتغاله بالمعيشة لكون صناعته شاقةً فله أن يفطر

ویطعم لکل یوم مسکیناً علی ما تقدم وإن لم یقدر علی ذلک لعسرته یستغفر اللّٰه إنه هو الغفور الرحیم ولو لم یقدر لشدة الزمان کالحر فله أن یفطر وینتظر الشتاء فیقضی کذا فی فتح القدیر. (الباب السادس فی النذر: ج ۱ ص ۲۰۹)

و قال علیه الصلاة والسلام: کفارة النذر کفارة یمین (رواه أحمد ومسلم وأبو داود والترمذی والنسائی عن عقبة بن عامر بلفظ کفارة النذر کفارة یمین هو حدیث صحیح.

فقط واللّٰه تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ	۲۶؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

کلمۂ طیبہ سے قسم کھانا

(۱۴۳) سوال:- میں نے غصہ کی حالت میں کلمۂ طیبہ پڑھ کر قسم کھائی اور اپنے شوہر سے کہا کہ آپ میرے شوہر نہیں، میں آپ کی بیوی نہیں ہوں، آج سے میں آپ سے بات نہیں کروں گی، مگر دو دن کے بعد میں نے ان سے بات کی اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

کلمۂ طیبہ الفاظ یمین میں سے نہیں البتہ کسی نے قسم کی نیت سے کلمۂ طیبہ پڑھ کر قسم کھائی تو قسم منعقد ہوجائے گی، اور جس علاقے میں کلمۂ طیبہ سے قسم کھانے کا رواج ہے وہاں بدون نیت بھی قسم منعقد ہوجائے گی۔

قال فی "الشامیة": (قوله وسبحان اللّٰه الخ) قال فی البحر ولو قال لا إله إلا اللّٰه لا أفعل کذا لا یکون یمیناً إلا أن ینوی وکذا قوله سبحان اللّٰه و أکبر لا أفعل کذا لعدم العادة قلت ولو قال اللّٰه الوکیل لا أفعل کذا ینبغی أن یکون یمیناً فی زماننا لأنه مثل اللّٰه أکبر لکنه متعارف.

پس صورت مسئولہ میں قسم کا کفارہ واجب ہے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم:

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دار الافتاء
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — ۲۷؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

قرآن مجید سے قسم کھانے کا حکم ہے

(۱۴۴) سوال: - میں کسی ایک واقعہ پر اپنے بیٹے سے جھگڑا کر رہا تھا اتفاق سے غصہ کی حالت میں میں نے کہا کہ قرآن کی قسم میں تیری کمائی سے نہیں کھاؤں گا، پھر امام صاحب سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا، انہوں نے کہا کہ غیر اللہ کے نام سے قسم منعقد نہیں ہوتی، آپ کی قسم منعقد نہیں ہوئی، بیٹے کی کمائی سے کھانے میں کوئی حرج نہیں یعنی کفارہ واجب نہیں ہوگا، مگر ایک اور عالم صاحب نے کہا کہ صورت حال میں قسم منعقد ہوگئی، بیٹے کی کمائی کھانے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا، اب سوال یہ کہ کس کی بات درست ہے اور جناب امام صاحب نے جو کہا کہ غیر اللہ کے نام پر قسم منعقد نہیں ہوتی، اس کا کیا جواب ہوگا۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ یمین کے بنیادی اصول یہ کہ قسم اللہ تعالیٰ کے نام سے اور اس کی صفات سے جن کا لوگوں میں رواج ہے قسم منعقد ہو جاتی ہے۔

"درمختار" میں ہے: **الأصل أن الأيمان مبنية ...... على العرف إذا يحتمله اللفظ .**

یعنی یمین کے مسئلہ کا دارومدار عرف پر ہے کہ جن الفاظ کو عرف میں یمین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور لوگ ان کو الفاظِ یمین جانتے ہیں، اس قسم کے الفاظ سے یمین منعقد ہو جاتی ہے، نیت کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اور قرآن بھی عرفاً الفاظ یمین میں سے ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

فما تعورف الحلف به فيمين وما لا فلا (لا) يقسم (بغير اللّٰه تعالىٰ كالنّبى والقرآن والكعبة) قال الكمال : ولا يخفىٰ أن الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينًا وأما الحلف بكلام اللّٰه فيدور مع العرف وقال العيني : وعندى

أن المصحف يمين لاسيما فى زماننا وعند الثلاثة المصحف والقرآن وكلام اللّٰه يمين الخ. (درمختار مع شامية: ج ۳ص ۷۱۲)

نیز غیر اللہ سے قسم نہیں ہوتی مگر جو الفاظ نہ عین اللہ میں ہیں نہ غیر اللہ میں اور اللہ کی صفات میں سے ہیں ان سے قسم منعقد ہو جائے گی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں قسم منعقد ہوگئی اب حنث کی صورت (یعنی بیٹے کی کمائی سے کھانے) میں کفارہ واجب ہوگا، یہی بات درست ہے لہٰذا جناب امام صاحب کی بات اس جگہ درست نہیں۔

قسم کا کفارہ یہ ہیں: (۱) دس محتاجوں کو دو وقتہ کھانا کھلا دیوے یا ہر مسکین کو پونے دو سیر (احتیاطًا دو سیر) گیہوں یا اس کی قیمت دیدیوے۔

(۲) یا دس محتاجوں کو ایک ایک جوڑا کپڑے پہنا دیوے یعنی ہر ایک فقیر کو ایک لنگی اور کرتا یا ایک شلوار اور ایک کرتا دیوے۔

نوٹ: اگر کوئی مذکورہ کفارہ ادا کرنے سے عاجز ہو تو وہ لگاتار تین روزے رکھے تو بھی کفارہ ادا ہو جائے گا۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۷؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ	۲۷؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

(۱۴۵) سوال:- کفارہ کے بارے میں بعض سوالات کے جوابات مطلوب ہیں۔

(۱) نابالغ مسکین کو کفارہ کا کھانا کھلائے تو کفارہ درست ہوگا یا نہیں؟

(۲) پانچ مسکین کو کھانا کھلائے اور پانچ مسکین کو کپڑے دیدیوے تو کفارہ درست ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

جواب:- (۱) درست نہیں ہوگا، البتہ کھانے کی قیمت اسکو دیجاوے تو درست ہے، ویسا ہی کھانا ان کی تملیک میں دیدیوے تو بھی درست ہے۔

قال فی "التنویر وشرحه":(أطعم)أی ملک (ستین مسکینا) ولو حکمًا ولایجزی غیر المراهق بدائع ...... وقال فی الشامیة: واما إطعام الصغیر عن الکفارة فجائز بطریق التملیک لاالإباحة. (باب الکفارة : ج۳ص۴۷۸)

جواب:- (۲) درست ہے یعنی پانچ محتاجوں کو دووقتہ کھانا کھلائے اور پانچ محتاجوں کو کپڑا دیدیوے۔

قال فی "الشامیة" : ولو أطعم خمسة وکساخمسة أجزاه ذلک عن الطعام إن کان أرخص من الکسوة وعلی العکس لایجوز هذا فی إطعام الإباحة اما إذاملکه فیجوز ویقام مقام الکسوة. (مطلب کفارة الیمین: ج۳ص۷۲۶)

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۷/ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۷/ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

متعدد قسموں کے کفارہ کا حکم

(۱۴۶) سوال:- ایک آدمی کو ایک بدعمل کی عادت تھی پھر اس نے قسم کھائی کہ یہ کام اور کبھی نہیں کریگا مگر ابتک اس نے یہ کام دس مرتبہ کئے ہیں اب اس پر کتنے کفارے واجب ہوں گے؟

الجواب باسمہ تعالیٰ وعونہ

صورت مسئولہ میں اگر پہلی قسم کا کفارہ ادا نہیں کیا تھا تو اب سب قسموں کا ایک ہی کفارہ کافی ہے اور آئندہ یہ کام نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے اور توبہ واستغفار کرے، کفارہ یہ ہے کہ دس محتاجوں کو دووقتہ پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو دس جوڑے کپڑے دیوے اور اگر یہ نہ ہوسکے تو تین روز لگا تار روزے رکھے البتہ ادائے کفارہ کے بعد پھر یہ کام کرے تو پھر کفارہ واجب ہوگا۔

قال فی "الشامیة" : (قوله وتتعدد الکفارة لتعدد الیمین) وفی البغیة کفارات الأیمان إذا کثرت تداخلت ویخرج بالکفارة الواحدة عن عهدة الجمیع وقال شهاب الأئمة : هذا قول محمّد قال صاحب الأصل : هو المختار عندی اه.

مقدسی، ومثله فی القهستانی عن المنية (مطلب تعدد الكفارة لتعدد واليمين:

(ج۳ص۷۱۴)

فقط واللّٰہ سبحانه و تعالیٰ اعلم بالصواب.

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ	الجواب صحیح
معاون مفتی دارالافتاء	محمد عبدالسلام عفااللہ عنہ
۹ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ	۹ر محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

* * *

كِتَابُ الْوَقْفِ

مسجد کی زائد رقم عیدگاہ میں صرف کرنا جائز نہیں

(۱۴۷) سوال: -(۱) مسجد کی ضرورت سے زائد اور فاضل رقم عیدگاہ کی ضرورت میں صرف کرنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) بندہ بارہ سال سے ایک مسجد کا امام ہے کمیٹی نے مجھے جو رہائشی مکان دیا وہ مسجد کے پیچھے محراب سے اتر جانب میں ہے، تقریباً آٹھ سال سے بندہ اسی مکان میں اپنی بیوی بچے لیکر رہتا ہے، گذشتہ جمعہ کی تقریر میں جناب خطیب صاحب نے کہا کہ مسجد سے متصل مکان میں اہل وعیال لیکر رہنا درست نہیں، اب سوال یہ کہ خطیب صاحب کی بات کہاں تک درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب(۱): -مسجد کی رقم عیدگاہ کی ضرورت میں لگانا درست نہیں البتہ زائد رقم مصالحِ مسجد میں ضرورت کے تحت صرف کرسکتا ہے جیسا کہ مسجد کے منافع کے واسطے کرایہ کی دکان خریدنا، امام، مؤذن کیلئے رہائش کا مکان تعمیر کرنا وغیرہ وغیرہ مسجد کے متعلق امور میں صرف کرنا درست ہے۔

جواب(۲): -مسجد کے آداب واحترام بجالا کر اور نمازیوں کی نماز میں خلل نہ ہونے کی صورت میں مسجد کے پیچھے یا دائیں اور بائیں جانب اہل وعیال لیکر رہنا درست ہے جبکہ دروازہ بھی باہر کی جانب ہو، مسجد کی جانب نہ ہو۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حجرات مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر اور مسجد سے متصل تھے۔

بخاری شریف میں ہے:

عن عائشة رضی اللّٰہ عنها كانت ترجل النبی صلی اللہ علیه وسلم وهی حائض وهو معتكف فی المسجد وهی فی حجر تها يناولها رأسه. (كتاب الصوم، من أراد أن يعتكف ثم بدأله أن يخرج (ج ا ص ۲۷۴) قال فی العمدة وكان باب الحجرة إلی المسجد وكانت عائشة تقعد فی حجر تها من وراء

القبة ويقعد رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد خارج الحجرة فيميل رأسه إليها. (ج ۱۱ ص ۱۵۸)

پس خطیب صاحب نے جو فرمایا ہمیں اس کی وجہ معلوم نہیں، قرآن وحدیث کی رو سے مسجد سے باہر متصل گھر بنانے میں شرعاً کچھ حرج نہیں۔

فقط واللہ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

متولی کو مسجد کا حق معاف کرنے کا اختیار نہیں

(۱۴۸) سوال: - اگر مسجد کا کوئی حق جیسے پیسے، جگہ، زمین، وغیرہ دوسرے کے پاس ہیں تو اس پر اس کی ادائیگی لازم ہے یا نہیں، متولی مسجد یا کمیٹی کو اس بات کا حق ہے کہ اُسے معاف کردیں یا حق کا مطالبہ نہ کریں اور چھوڑ دیں اگر متولی ایسا کرتے ہیں تو اس پر ضمان آئیگا یا نہیں؟

الجواب وهو الموفّق للصّواب

کتبِ فقہ اور فتاویٰ میں مذکور ہے کہ جب زمین شرعی حیثیت سے وقف ہو جاتی ہے تو اس کو بیچنا، رہن دینا اور کسی کو بطور ہبہ وغیرہ دیدینا ناجائز ہے۔

چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

فإذا تم ولزم لايملك ولايملك ولايعار ولايرهن) وقال فى الشامية (قوله لايملك) أى لايكون مملوكاً لصاحبه ولايملك أى لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالة تمليك الخارج عن ملكه ولايعار ولايرهن لاقتضائهما الملك درر. (در المختار مع الشامية كتاب الوقف ج ۴ ص ۳۵۱)

پس متولی مسجد یا کمیٹی کو اس بات کا اختیار نہیں کہ کسی پر عائد حق واجبی کو معاف کردے، کمیٹی کے معاف کرنے سے شرعاً معاف نہیں ہوگا، کیونکہ یہ وقف کے ساتھ خیانت ہے، بلکہ جس کے پاس حق ہے اس کے ذمہ واجب الاداء ہے گا اور واضح رہے کہ وقف میں ناجائز تصرف کرنے والا خائن متولی واجب العزل ہے۔

قال فی "التنویر وشرحه" : وينزع وجوبًا بزازيه (لو)الواقف درر فغيره بالأولىٰ (غير مامون)وفی الشامية مقتضاه أثم القاضی بتركه والإثم بتولية الخائن لاشک فيه أيضا فيها بحر، وكذا لوباع الوقف أوبعضه أوتصرف تصرفًا غير جائز عالمًا به. (كتاب الوقف، مطلب يأثم بتولية الخائن: ج۴ص ۳۸۰)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
(۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

موقوفہ زمین بیچنے اور عوض بدل کرنے کے احکام

(۱۴۹) سوال:- مسجد کی موقوفہ زمین کے چاروں طرف لوگوں کے بڑے بڑے درخت ہیں اور درختوں کا سایہ ہمیشہ اسی جگہ پر رہتا ہے اس لئے کھیتی وغیرہ بالکل نہیں ہوتی، کمیٹی اسکو فروخت کر کے دوسری زمین خریدنا چاہتی ہے۔ شرعاً یہ جائز ہوگا یا نہیں، نیز دوسری جگہ سے اس کا عوض میں تبدیل کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

سوال کا بیان اگر درست ہے (یعنی بالکل کھیتی نہیں ہوتی) تو اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے بہترین جگہ خریدنا ویسا ہی بہترین زمین کے ساتھ اس کا تبدیل کرنا درست ہوگا واضح رہے کہ درخت لگا کر اگر اس زمین سے مسجد کا انتفاع حاصل کرنا ممکن ہو تو پھر اس کی خرید وفروخت درست نہیں ہوگی۔

قال فی "الشامية": والثانی أن لايشرطه سواء شرط عدمه أوسكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شئ أصلا ولايفی مؤنته فهو أيضًا جائز علی الأصح ...... والثالث أن لا يشرطه أيضًا لكن فيه نفع فی الجملة وبدله خيرمنه ريعًاونفعًا وهذالا يجوز استبداله علی الأصح.

(مطلب فی استبدال الوقف: ج۴ص ۳۸۴)

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دارالافتاء
۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — ۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

مسجد شرعی کیلئے جگہ کا موقوفہ ہونا شرط ہے

(۱۵۰) **سوال:** - ایک سرکاری کالج کی جگہ میں طلبہ اور ملازمین کی نماز کیواسطے بدون وقف کے عارضی طور پر ایک کچی مسجد بنائی گئی، اس میں جمعہ سمیت پنجگانہ نمازیں پڑھی جارہی ہیں اب انتظامیہ کمیٹی کالج کی دوسری ایک اور جگہ میں ایک مرکزی مسجد تعمیر کرنا چاہتی ہے، واضح رہے کہ عارضی مسجد کی جگہ میں اسکی تعمیر مشکل ہے چونکہ جگہ کی تنگی اور قسم بقسم کے موانع بھی ہیں، اب سوال یہ ہے کہ عارضی مسجد ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا اور اس کی پُرانی جگہ کو دوسرے کام میں استعمال کرنا شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ مسجد، کے شرعی ہونے کے لئے اس کی جگہ کا موقوفہ ہونا شرط ہے ورنہ مسجد شرعی نہ ہوگی یعنی اس میں مسجد شرعی کے احکام جاری نہیں ہوں گے اور اس میں مسجد شرعی کا ثواب نہیں ملے گا اور اعتکاف بھی درست نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ، البتہ نماز پنجگانہ اور جمعہ کی نماز اس میں درست ہوگی، ہاں سرکاری جگہ میں سرکاری لوگوں کی اجازت سے اگر مسجد بنائی گئی ہے تو یہ مسجد مسجد شرعی ہوجائیگی، اس کو دوسری جگہ منتقل کرنا اور تبدیل کرنا درست نہ ہوگا، نیز سوال میں تصریح ہے کہ ”بدون وقف صرف عارضی طور پر نماز پڑھنے کے لئے مسجد بنائی گئی“ پس یہ مذکورہ مسجد مسجد شرعی نہیں ہوئی، اس لئے اس مسجد کا انتقال اور اس کی جگہ کو دوسرے کام میں استعمال کرنا درست ہے۔

کما فی ”شرح التنویر“: (ویزول ملکه عن المسجد والمصلی) بالفعل و(بقوله جعلته مسجداً) عندالثانی:

(وشرط محمّد) والإمام (الصلوٰة فیه) بجماعة وقیل یکفی واحد وجعله فی الخانیه ظاهر الروایة . (کتاب الوقف، درمختار مع شامیة (۴/۳۵۵)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح　　　　کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ　　　　معاون مفتی دارالافتاء
۲۳؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ　　　　۲۳؍محرم الحرام ۱۴۲۳ھ

قبرستان کی موقوفہ زمین پر مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا

(۱۵۱) سوال: - ایک صاحب نے قبرستان کے واسطے ایک بیگھا زمین وقف کی موقوفہ زمین بڑی ہونے کیوجہ سے علاقہ کے لوگ چاہتے ہیں کہ آدھے بیگھے زمین پر ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کریں چونکہ آدھا بیگھا زمین ہی قبرستان کیلئے کافی ہے، اب سوال یہ کہ ایسا کرنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

وقف کے متعلق شرعی اصول یہ ہے کہ ''شَرْطُ الْوَاقِفِ كَنَصِّ الشَّارِعِ'' یعنی واقف زمین کو جس جہت کے لئے وقف کرتے ہیں اس کا صرف اسی جہت میں کرنا ضروری ہے، اس کے غیر میں اس کا تصرف کرنا ناجائز وحرام ہے۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں قبرستان کی جگہ پر مسجد و مدرسہ تعمیر کرنا درست نہیں ہوگا، البتہ زائد زمین میں عارضی طور پر مسجد و مدرسہ تعمیر کر سکتے ہیں، پھر جب قبرستان کی ضرورت پڑے گی تو جگہ خالی کر کے دیدیوے، واضح رہے کہ صورت حال میں مسجد شرعی نہ ہوگی اس میں مسجد شرعی کا ثواب نہیں ملے گا اور اعتکاف بھی درست نہیں ہوگا۔

نوٹ: - واضح رہے کہ اگر قبرستان کی وقف کردہ زمین بہت بڑی ہو قبرستان کیلئے اتنی جگہ کی ضرورت بالکل نہیں ہے تو اہل مسجد کی ضرورت کے وقت اس میں مستقل مدرسہ تعمیر کرنا جائز ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح　　　　کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ　　　　معاون مفتی دارالافتاء
۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　　۵؍جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

استبدال وقف کی جائز وناجائز صورتیں

(۱۵۲)سوال: - دوسرے کے گھر کے قریب مدرسہ کی کچھ موقوفہ زمین ہے اس پر ہمیشہ درختوں کا سایہ رہتا ہے اس لئے کھیت اور زراعت اچھی نہیں ہوتی اب مہتمم صاحب کی کچھ زمین مدرسہ سے قریب ہے کمیٹی اور مہتمم صاحب چاہتے ہیں کہ غیر منتفع جگہ کو نفع بخش جگہ سے تبدیل کریں، تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ عوض کی صورت میں مدرسہ کو دگنی منفعت ہوگی۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

علامہ ابن عابدین شامیؒ نے استبدال وقف کی تین صورتیں لکھی ہیں:

وفی "الشامية" (قوله جاز شرط الاستبدال به) اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه الأوّل: أن يشرطه الواقف لنفسه أولغيره، فالاسبتبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقًا. والثّاني : أن لايشرطه سواء شرط عدمه أوسكت لكن صار بحيث لاينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شيئٌ أصلا، أولايفي بمؤنته فهو أيضًا جائزعلى الأصح إذاكان بإذن القاضي ورأيه المصلحة فيه والثّالث:أن لايشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعًا ونفعًاوهذالايجوزاستبداله على الأصح المختار.

(كتاب الوقف ،مطلب في إسبتدال الوقف وشرطه: ج۴ص ۳۸۴)

خلاصہ یہ کہ استبدال کی پہلی صورت یہ ہے: کہ عندالوقف اگر واقف کی طرف سے استبدال کی اجازت دی گئی تھی تو استبدال درست ہے۔

دوسری صورت یہ ہے: کہ واقف استبدال وعدم استبدال سے ساکت رہے مگر زمین ایسی غیر منتفع ہوگئی کہ منفعت بالکلیہ حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ بعض دفعہ اس کے لئے مسجد کے فنڈ سے رقم خرچ ہوتی ہے تو اس صورت میں کمیٹی کو اپنے اتفاق رائے سے بہتر زمین کے ساتھ استبدال کرنا جائز ہے۔

تیسری صورت یہ ہے: کہ زمین میں منفعت کم ہوتی ہے، مگر عوض کی صورت میں منفعت زیادہ ہوگی تو استبدال کی یہ صورت نادرست ہے۔

سوال میں تصریح ہے کہ زمین میں منفعت ہوتی ہے مگر کم، پس صورت مسئولہ کا مسئلہ استبدال کی

تیسری صورت میں داخل ہے، اس لئے اس کا استبدال درست نہیں ہوگا۔

فقط واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۹؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۹؍ ربیع الاول ۱۴۲۴ھ

موقوفہ قبرستان کے اوپر مدرسہ تعمیر کرنا

(۱۵۳) سوال: -محترم المقام جناب مفتی صاحب مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بعد سلام مسنون عرض یہ کہ ہمارے جامعہ مخزن العلوم مونشاہی کے درجۂ حفظ کے طلبہ کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے، موجودہ عمارت میں ان کو سمانے کی گنجائش نہیں اس لئے عمارت کی توسیع اور اس کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر کی ضرورت ہوئی مگر بات یہ ہے کہ حفظ خانہ سے متصل شمالی جانب ایک موقوفہ قبرستان ہے اب عمارت کی توسیع کے لئے قبرستان میں چار کھمبے سے قبرستان کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر کرنا ازروئے شرع درست ہوگا یا نہیں؟۔

نوٹ: قبرستان سے صرف چار کھمبے کی جگہ استعمال ہوگی اور اس کے چاروں طرف کھلا رہے گا، نیز قبرستان کے اسی حصہ میں ۶/۵ سال کی پُرانی دو تین قبریں ہیں اور آئندہ بھی دفنانے کی ضرورت ہوگی اور دفنانے میں کچھ حرج نہ ہوگا۔

نقشہ عمارت اور قبرستان

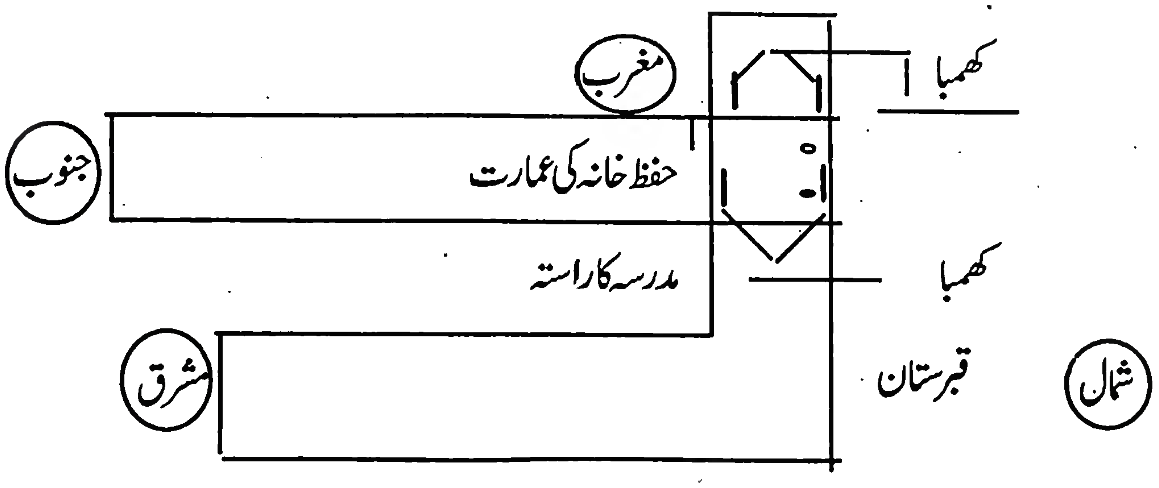

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جواب سے قبل چند باتوں کا بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ جواب سمجھنے میں دقت نہ ہو اور وہ یہ ہیں:

(۱) وقف کا اصل مقصد تقرب الی اللہ ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ شئی کو اپنی ملکیت سے نکال کر مسجد و مدرسہ یا قبرستان وغیرہ کے لئے دیدینا یا کسی رفاہِ عام کے لئے دینا ہے چنانچہ صاحب ھدایہ فرماتے ہیں:

> **ولأن الحاجة ماسة إلى أن يلزم الوقف منه يصل ثوابه إليه على الدوام …… أن المقصود هو التقرب إلى الله تعالىٰ وهو موفر عليه لأن التقرب تارةً يكون فى الصرف إلى جهة تنقطع ومرة بالصرف إلى جهة يتأبد فيصح فى الوجهين .**
>
> (ج۲ ص۶۳۷)

(۲) شَرطُ الْوَاقِفِ كَنَصِّ الشَارِع (یعنی واقف کی شرط کے خلاف کرنا جائز نہیں یعنی واقف نے شئی موقوفہ کو جس جہت کے لئے وقف کیا اس کو اسی جہت میں استعمال کرنا ضروری ہے، اس کے غیر میں صرف کرنا ناجائز ہے) اس کی حقیقت یہ ہے کہ واقف کے خلاف کرنے میں خیانت کا خوف ہے کہ لوگ اپنے جی چاہے طریقہ پر شئی موقوفہ کو استعمال کرنے لگیں گے جس سے وقف اور واقف کا اصل مقصد (تقرّب إلى الله) ہی فوت ہو جائے گا، اس لئے شریعت نے سدً اللباب اسکے خلاف کرنے کو ناجائز کہا ہے، ورنہ فقہائے کرام بعض صورتوں میں قاضی کو واقف کے خلاف کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حالاً بعض مسائل میں اسکی اجازت دیتے ہیں۔ چنانچہ شامیؒ فرماتے ہیں:

> **قوله وهي إحدى المسائل السبع) الثانية : شرط أن القاضى لايعزل الناظر فله عزل غير الأهل. الثالثة شرط أن لا يوجر وقفه أكثر من سنة والناس لايرغبون فى استئجار سنة أو كان فى الزيادة نفع للفقهاء فللقاضى المخالفة دون الناظر الخ** (مطلب يجوز مخالفة شرط فى مسائل: ج۴ ص۳۸۷)

عبارت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ رفاہ عام کے مقصد کا لحاظ کر کے کسی خاص موقع پر واقف کے خلاف کرنے کی اجازت بھی از شرع موجود ہے، اور درحقیقت یہ واقف کے مقصد کا خلاف نہیں چونکہ وہاں بھی وقف کا مقصد (رفاہ عام) موجود ہے۔

(۳) واقف کی جہت متعینہ بند ہو جانے کی صورت میں شئی موقوفہ کو دوسری جہت میں استعمال کرنے کی اجازت بھی از روئے شرع موجود ہے۔ چنانچہ شارح بخاری علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

فإن قلت هل يجوز أن تبنى المساجد على قبور المسلمين ؟ قلت قال ابن القاسم (رحمة الله عليه) لو أن مقبرة من مقابر المسلمين عفت فبنى قوم عليها مسجدًا لم ار بذلک باسًا و ذلک لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمين لدفن موتاهم لايجوز لأحد أن يملكها فإذا درست و استغنىٰ عن الدفن فيها جاز صرفها إلى المسجد لأن المسجد أيضًا وقف من أوقاف المسلمين لايجوز تمليكها لأحد فمعناهما على هذا و احدًا.

(باب التیمن فی دخول المسجد وغیرہ عمدۃ القاری: ج۴ص ۱۷۹)

ابن قاسم رحمہ اللہ نے جواز کی علت میں کہا ہے کہ قبرستان اور مسجد دونوں ”وَقْفٌ مِنْ اَوْقَافِ الْمُسْلِمِیْنَ“ ہیں یعنی دونوں کا اصل مقصد ایک ہے کہ مسلمانوں کی رفاہ اور مصالح میں شئی موقوفہ کا استعمال ہونا اور یہ مقصد دونوں صورتوں میں موجود ہیں۔

(۴) شئی موقوفہ کے استعمال کے بارے میں واقف سے دوطرح کی اجازت ہوتی ہیں صراحۃً اور اشارۃً جیسا کہ کسی نے برائے مسجد جگہ وقف کردی پھر متولی مسجد کو اجازت واختیار ہوتا ہے کہ ضرورت کے موقع پر مسجد کے نیچ منزلہ میں دکان یا امام مؤذن کے لئے رہائش کا مکان بناوے یا مسجد کی زائد جگہ پر کرایہ کا مکان وغیرہ تعمیر کرے، ان سب چیزوں کو فقہائے کرام نے جائز کہا ہے اور ان کو مصالح مسجد سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ان چیزوں کی اجازت واقف سے صراحۃً نہیں ہے پھر بھی ان کو واقف کے خلاف مقصد امر نہیں کہا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ مسجد کے متعلق واقف سے دلالۃً اجازت ہے اور مصالح مسجد کے متعلقات مسجد میں داخل ہیں، چونکہ وقف کا مقصد رفاہ عام ہے یعنی لوگوں کے لئے قبرستان وغیرہ کی جگہ دیکر ثواب حاصل کرنا اور صورت مسئولہ میں اگر قبرستان کے اوپر مدرسہ کے اضافی کھمبے سے مدرسہ کی تعمیر ہوگی تو قبرستان کا مقصد بھی رہے گا اور مزید مدرسہ بنانے اور دینی تعلیم کا ثواب بھی ملتا رہے گا۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں قبرستان کے اوپر کھمبے سے دوسری منزل کی تعمیر درست معلوم ہوتی ہے مگر مندرجہ ذیل شرائط کا لحاظ ضروری ہوگا۔

(۱) توسیع عمارت کی اور کوئی صورت ممکن ہو تو اس کا انتظام کریں، ورنہ عذر کے تحت یہاں مدرسہ کے کھمبے کے لئے قبرستان کی جگہ کا استعمال کریں۔

(۲) قبرستان کے متولی یا کمیٹی سے اجازت لینی ہوگی۔

(۳) ہر حال میں قبرستان کے آداب واحترام کا لحاظ ضروری ہوگا۔

(۴) کھمبا بھی کسی قبر پر نہ ہوگا۔

(٦) قبرستان کی اوپر منزل کو درجۂ حفظ کی درسگاہ بنالیوے تو سب سے بہتر ہوگا، مگر بیت الخلاء استنجاء خانے اور عورتوں کو ٹھہرانے کی جگہ کے لئے استعمال درست نہ ہوگا۔

فقط و اللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وهو الهادي للحق.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۲۰؍ربیع الاوّل ۱۴۲۵ھ	۲۰؍ربیع الاوّل ۱۴۲۵ھ

* * *

فَصْلٌ فِیْ أَحْکَامِ الْمَسَاجِدِ

پُرانے قبرستان پر مسجد تعمیر کرنے کا حکم

(۱۵۴) سوال: - جناب ہمارے یہاں ایک دس بارہ سال کے پُرانے قبرستان پر ایک مسجد تعمیر کی گئی، اس میں جمعہ کے سوا پنجگانہ نمازیں ہورہی ہیں، بات یہ کہ صفِ اوّل کی دائیں جانب ایک چودہ مہینے کی پُرانی قبر ہے، بعض نمازی لوگ کہتے ہیں کہ اس مسجد میں نماز درست نہیں ہوگی کیونکہ صف اوّل میں قبر کی جگہ ہے اب سوال یہ کہ ان لوگوں کی بات کہاں تک درست ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔

الجواب ھوالموفّق للصّواب

واضح رہے کہ ضرورت کے تحت پُرانے قبرستان پر مسجد وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے چند باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

(۱) قبرستان پُرانا ہو کہ نعش بوسیدہ ہوکر مٹی ہوجانے کا غالب گمان ہو۔

(۲) قبرستان اگر مملوکہ ہے تو مالک کی اجازت ضروری ہے۔

(۳) قبرستان اگر موقوفہ ہے اور دفنانے کی ضرورت باقی ہے تو اس صورت میں مسجد وغیرہ تعمیر کرنا درست نہیں ہوگی البتہ آئندہ دفنانے کی ضرورت باقی نہیں ہے، تو اہل محلّہ کی رائے سے وہاں پر مسجد تعمیر کرنا درست ہوگا ورنہ نہیں۔

(۴) بلاضرورت پُرانے قبرستان پر مسجد تعمیر کرنا مکروہ ہے۔

پس صورت مسئولہ میں قبرستان مملوکہ ہے اور اس کی نعشیں اگر بوسیدہ ہوکر مٹی ہوجانے کا غالب گمان ہے اور مسجد کمیٹی نے مالکان کی اجازت سے مسجد بنائی ہے تو اس مسجد میں نماز پڑھنا بلاشبہ درست ہے، البتہ چودہ مہینے کی پُرانی قبر کا مرجواب تک ہمارے گمان کے مطابق بوسیدہ نہیں ہوا اس لئے اس حصّہ پر نماز پڑھنا، چلنا وغیرہ سب مکروہ ہے، اب اس حصّہ کو دیواروں سے احاطہ کرکے چھوڑدیا جائے پھر جب میّت کے بوسیدہ ہوجانے کا غالب گمان ہوجائے یعنی ۴۰ (چالیس) ۵۰ (پچاس) سال گزر جاویں تو اس حصہ میں بھی نماز پڑھنا درست ہوگی۔

(۱) قال فی "العمدة للعینی": فإن قلت هل یجوز أن تبنی المسجد علی قبور المسلمین؟ قلت قال ابن القاسم رحمه اللّٰه تعالیٰ لو أن مقبرة من مقابر المسلمین عفت فبنی قوم علیها مسجدًا لم أر بذلک باسًا وذلک لأن المقابر وقف من أوقاف المسلمین لدفن موتاهم لایجوز لأحد أن یملکها فإذا درست واستغنی عن الدفن فیها جاز صرفها إلی المسجد لأن المسجد أیضًا وقف من أوقاف المسلمین لایجوز تملیکه لأحد فمعنا هما علی هذا واحداً،
(ج ۴ص ۱۷۹)

(۲) قال فی "البحر الرائق": ولو بلی المیت وصار ترابًا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه.(کتاب الوقف فصل فی احکام المساجد:
(ج ۲ص ۱۹۵)

فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
۲۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ	۲۶/ربیع الاوّل ۱۴۲۷ھ

بڑے ٹاور کا ایک حصّہ مسجد کے لئے وقف کرنا

(۱۵۵) سوال: - جناب مفتی صاحب (زید مجدہ)! میرا بارہ منزلہ ایک ٹاور ہے جس میں تقریبًا دوسو دکانیں ہیں اس میں دو ہزار لوگ سکونت پذیر ہیں، میرا خیال ہوا کہ چھٹی منزل میں ایک فلیٹ مسجد کیلئے اور ایک فلیٹ مسجد کے خرچہ کے لئے وقف کردوں، یہ دونوں فلیٹ وقف للہ ہوں گے میرے وارثین کو ان میں کسی قسم کا دعویٰ نہیں رہے گا، اب سوال یہ کہ اسطرح کا وقف شرعًا درست ہے یا نہیں؟ نیز مسجد کے برابر اوپر کی منزلوں کو کرایہ پر دینا درست ہوگا یا نہیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

ضرورت کے موقع پر اسطرح کا وقف کرنا بھی درست ہے، البتہ مسجد کے برابر اوپر والے حصوں میں حتی الامکان خلاف شرع کوئی چیز نہ ہونے دیوے، اس لئے کرایہ دیتے وقت ان باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، مسجد کے اوپر والی دکانوں کو خلاف شرع کام کرنے والے لوگوں کے حوالے نہ کیا جاوے

دیندار اور حلال تجارت کرنے والوں کے حوالے کیا جاوے۔

قال فى "الهداية": وروى الحسن عن أبى حنيفة أنه قال إذا جعل السفل مسجدًا وعلى ظهره مسكن فهو مسجد لأن المسجد مما يتابد وذلک يتحقق فى السفل دون العلو وعن محمدؒ على عكس هذا لأن المسجد معظم وإذا كان فوقه مسكن أو مشتغل يتعذر تعظيمه وعن أبى يوسف أنه يجوّز فى الوجهين حين تقدم بغداد ورأى ضيق منازل فكأنه اعتبر الضرورة وعن محمد أنه حين دخل الرىّ أجاز ذلک كله لما قلنا (كتاب الوقف: فصل وإذا بنى مسجداً لم يزل ملكه الخ: (ج۲ ص ۶۴۴)

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۰/رجب ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۰/رجب ۱۴۲۷ھ

لیز شدہ زمین پر مسجد تعمیر کرنے کا حکم

(۱۵۶) سوال: - میں نے ایک ایکڑ جگہ ۹۹ سال کے لئے حکومت سے لیز لی اس میں سے کچھ جگہ مسجد کیلئے وقف کردی ہے، ہمارے یہاں کے ایک عالم صاحب نے کہا کہ یہ وقف صحیح نہیں ہوا اور اس پر جو مسجد بنے گی وہ مسجد شرعی نہیں ہوگی چونکہ مسجد شرعی کی جگہ مملوکہ اور ابدی طور پر موقوفہ ہونا ضروری ہے حالانکہ یہ چیزیں وہاں نہیں ہیں، اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ جگہ میں مسجد قائم کرنا درست ہوگا یا نہیں؟ نیز وہ جگہ شرعی مسجد ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

وقف صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ زمین کا خالص مملوکہ اور ابدی طور پر موقوفہ ہونا ضروری ہے ورنہ وقف للہ صحیح نہیں ہوگا، اس اعتبار سے صورت مسئولہ کا وقف بھی صحیح نہ ہونا چاہئیے چونکہ وہاں بھی تابید مفقود ہے البتہ اس بارے میں فقہائے متقدمین نے اگرچہ اختلاف کیا ہے مگر متاخرین نے اجازت دی ہے لہٰذا مفتی بہ اور راجح قول یہ ہے کہ ضرورت شدیدہ کے موقع پر یعنی خالص مملوکہ جگہ نہ

ملنے کی صورت میں جبکہ مسلمانوں کو مسجد کی ضرورت بھی ہو تو ایسی صورت میں لیز والی جگہ میں بھی مسجد بنانا درست ہے۔

قال فی "شرح التنویر": (بنی علیٰ أرض ثم وقف البناء) قصدًا (بدونها الأرض مملوكةً لايصح وقيل صح وعليه الفتوى) سئل قارى الهداية عن وقف البناء والغراس بلاأرض؟ فأجاب: الفتویٰ علی صحته ذلک رَجَّحَه شارح الوهبانية و أَقَّره المصنف مُعَلِّلًا بأنه منقول فيه تعامل فيتعين به الإفتاء (وان موقوفة علی ماعين البناء له جاز) تبعًا (إجماعًا وإن) الأرض (لجهة أخرى فمختلف فيه) والصحيح الصحة كمافى المنظومة المحبية. قال فى "الشامية": قال فى أنفع الوسائل أنه لوبنى فى الأرض الموقوفة المستاجرة مسجدًاأنه يجوز قال وإذا جاز فعلى من يكون حكره والظاهر أنه يكون على المستاجر ما دامت المدة باقية فإذا انقضت ينبغى أن يكون من بيت مال الخراج وأخوانه و مصالح المسلمين الخ.

(كتاب الوقف، مطلب مناظرة ابن الشحنة مع شيخه العلامة قاسم فی وقف البناء: ج۴ص ۳۹۰)

فلہٰذا صورت مسئولہ میں بھی خالص مملوکہ جگہ نہ ملنے اور ٹاور کے قریب کوئی مسجد نہ ہونے کی صورت میں مذکورہ جگہ کا وقف درست ہوگا اور اس میں مسجد تعمیر کی جائے تو وہ مسجد شرعی ہوگی۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۷؍رجب ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۷؍رجب ۱۴۲۷ھ

مسجد کی تجارتی زمین کو فروخت کرنا درست ہے

(۱۵۷) سوال:- مسجد کمیٹی نے مسجد کے پیسوں سے تجارت کی غرض سے کچھ زمین خریدی تھی دلیل کے کاغذات میں یہی لکھا ہے لیکن مختلف وجوہات سے عرصۂ دراز تک زمین کا دخل مسجد کو نہیں ملا ہے، البتہ اب مسجد کو دخل ملا ہے مگر زمین کے چاروں طرف لوگوں کی جگہ ہے وہاں جانا اور کھیتی وغیرہ کرنا بہت ہی مشکل ہے، نیز اس جگہ پر ہمیشہ پانی رہتا ہے اس لئے کمیٹی کے لوگ وقفیہ کونسل کی اجازت سے اس کو بیچنا

چاہتے ہیں اب سوال یہ کہ اس کی خرید وفروخت از روئے شرع درست ہوگی یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

کتب فقہ وفتاویٰ میں مذکور ہے کہ مسجد کے منافع کیلئے مسجد کمیٹی کی جانب سے اگر زمین، دکان وغیرہ چیزیں خریدی جائیں تو انکی خرید وفروخت درست ہے۔

کما فی ”الهندية: متولی المسجد إذا اشتریٰ بمال المسجد حانوتًا أو دارًا ثم باع جاز إذا كانت له ولاية الشراء هذه المسئلة بناء على مسئلة أخرى أن متولیٰ المسجد إذا اشترى من غلة المسجد دارًا أو حانوتًا فهذه الدار وهذه الحانوت هل تلحق بالحوانيت الموقوفة على المسجد ومعناه هل تصير وقفا واختلف المشائخ رحمة الله عليهم مال الصدر الشهيد المختار أنه لاتلحق ولكن تصير مستغلا للمسجد كذافی المضمرات : الباب الخامس فی ولاية الوقف ج۲/۴۱۸). وفی موضع أخر أيضًا وفی الفتاویٰ النسفية سئل عن أهل المحلة باعوا وقف المسجد لأجل عمارة المسجد قال لايجوز بأمر القاضی. وغيره كذا فی الذخيرة فی فوائد نجم الدين النسفی أهل مسجد اشتروا عقارًا بغلة المسجد باعوا لعمارة اختلف المشائخ فی جواز. بيعهم الصحيح أنه يجوز كذافی العتابة . (ج ۲ ص ۴۶۴)

یعنی مسجد کی تجارت کی غرض سے جو زمین اور دکان وغیرہ خریدی جاتی ہیں وہ چیزیں وقف کے تحت داخل نہیں ہوتیں یعنی ان میں وقف کے احکام جاری نہیں ہوں گے، کمیٹی کے لئے انکی خرید وفروخت درست ہے، البتہ کسی نے اگر مسجد کمیٹی کو پیسے دیئے اس شرط پر کہ کمیٹی والے مسجد کے لئے زمین خرید کر وقف کردیویں تو اسمیں وقف کے احکام جاری ہوں گے، اس کی خرید وفروخت درست نہیں ہوگی۔

فلہٰذا صورت مسئولہ میں مذکورہ زمین کی خرید وفروخت درست ہوگی۔

واللہ تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

مال حرام سے بنی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے

(۱۵۸)سوال:- مال حرام سے بنی ہوئی مسجد میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

جس مسجد کی بناء مال حرام سے ہوئی ہے وہ مسجد شرعی نہیں ہے اس میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

وفي الواقعات : بني مسجداً على سور المدينة لاينبغي أن يصلى فيه لأنه حق العامة فلم يخلص لله تعالىٰ كالمبنى فى أرض مغضوبة اهـ، ثم قال : ومدرسة السليمانية فى دمشق مبنية فى أرض المرجة التى وقفها السلطان نور الدين الشهيد على أبناء السبيل بشهادة عامة أهل دمشق والوقف يثبت بالشهرة فتلك المدرسة خولف فى أبنائها شرط وقف الأرض الذى هو كنص الشارع فالصلاة فيها مكروهة تحريمًا فى قول وغير صحيحة له فى قول آخر كما نقله فى جامع الفتاوىٰ .

(كتاب الصلوٰة، تحت مطلب فى الصلوٰة فى المغضوبة ودخول البساتين وبناء المسجد فى أرض الغضب. درمختار مع شامية ج ١ ص ٣٨١)

اب اس کو اصلاح اور درست کرنے کی صورت یہ ہے کہ مسجد کو شہید کر کے از سرِ نو مال حلال سے تعمیر کی جائے اور فرش اور دیوار سب چیزیں نئی بنائے جائیں پُرانی چیزوں کو ہٹا دیا جاوے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دار الافتاء
۱۲ ؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ	۱۲ ؍ربیع الاول ۱۴۲۷ھ

مسجد منتقل کرنے کا حکم

(۱۵۹)سوال:- ہماری جامع مسجد ایک سو سال پُرانی مسجد ہے سوا مرلہ جگہ پر قائم ہے اب دیواریں گرنے کے قریب ہیں اور جمعہ کے دن سب نمازیوں کیلئے اس میں جگہ نہیں ہوتی، نیز اس کے چاروں طرف لوگوں کی مملوکہ جگہ ہے جس میں انکے رہائشی مکانات وغیرہ ہیں، اس لئے مسجد کی توسیع بھی ممکن نہیں، مگر

مسجد سے ۳۰/۳۵ گز کے فاصلہ پر مسجد کی موقوفہ ساڑھے سات مرلہ جگہ موجود ہے، انتظامیہ کمیٹی پُرانی مسجد کو وہاں سے منتقل کرنا چاہتی ہے اور اس کی جگہ کو چار دیواری سے حفاظت کرنے کا ارادہ کیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا شرعاً درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ جس جگہ پر ایک مرتبہ شرعی حیثیت سے مسجد تعمیر ہو چکی ہے وہ جگہ تا قیامت مسجد کے حکم میں رہے گی وہاں سے مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا اور اس کی جگہ کو دوسرے کام میں استعمال کرنا درست نہیں۔

قال في "البحر": قال أبو يوسف هو مسجد أبدًا إلى يوم قيام الساعة لايعود ميراثا ولايجوز نقله ونقل ماله إلى مسجد اٰخر سواء كانوا يصلون فيه أولا وهو الفتاویٰ كذافي الحاوي القدسي وفي المجتبیٰ وأكثر المشائخ على قول أبي يوسف ورجح في فتح القدير قول أبي يوسف بأنه الأوجه.

(كتاب الوقف فصل في أحكام المساجد: ج۵ ص ۲۵۱)

پس صورت مسئولہ میں اگر ممکن ہو تو پُرانی مسجد کو بحال رکھ کر ایک اور نئی مسجد تعمیر کریں اور دونوں مسجدوں میں لوگ نماز پڑھیں البتہ یہ صورت ممکن نہ ہو تو پُرانی مسجد کے لئے چار دیواری سے حفاظت کا انتظام کر کے دوسری جگہ نئی مسجد تعمیر کر سکتے ہیں۔

نوٹ:۔ ضرورت کے موقع پر نئی مسجد کی دری، صفین چٹائی وغیرہ چیزیں پُرانی مسجد میں رکھ سکتے ہیں یا اس کو مکتب کے لئے بھی استعمال کر سکتے ہیں مگر ہر صورت میں مسجد کے آداب واحترام کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

مسجد کی چھت پر امام صاحب کا رہائشی کمرہ بنانا کیسا ہے

(۱۶۰) **سوال:۔** جناب مفتی صاحب! ہماری مسجد تین منزلہ پُرانی مسجد ہے، اب کمیٹی والے تیسری منزل کی چھت پر امام صاحب کے واسطے ایک رہائشی کمرہ مع پیشاب خانہ بنانا چاہتے ہیں، انہوں نے کسی

ایک مفتی صاحب سے زبانی طور پر فتویٰ طلب کیا تو جناب مفتی صاحب نے جواز کا فتویٰ دیا ہے اب سوال یہ کہ جناب مفتی صاحب کا فتویٰ کہاں تک درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

واضح رہے کہ جس جگہ پر ایک مرتبہ شرعی حیثیت سے مسجد بن چکی ہے وہ جگہ تا قیامت مسجد کے حکم میں رہے گی وہاں مسجد رہے یا نہ رہے، اس کے آداب واحترام کا لحاظ ہر حال میں ضروری ہے، اس میں اور کچھ بنانا، تعمیر کرنا ناجائز ہے۔

كماذكر الحصكفى أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع ...... (ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدًا عند الإمام الثانى) ابدًاإلى قيام الساعة (و به يفتي) الخ (در مختار مع الشامية ج۴ص۳۵۸)

نیز مسجد کی چھت بھی مسجد کے حکم میں ہے یعنی مسجد کے اندر جو امور ممنوع وناجائز ہیں وہ مسجد کی چھت پر بھی ناجائز ہیں جیسے پیشاب، پاخانہ، وضو، غسل بیوی سے مباشرت وغیرہ۔

كمافى "خلاصة الفتاوىٰ": ويكره المجامعة والبول على سطح المسجد. الفصل السادس والعشرون فى المسجد وما يتصل به (ج ا ص ۲۲۷)

فلہٰذا صورت مسئولہ میں مسجد کی چھت پر امام صاحب کیلئے بچوں کے ساتھ رہائشی کمرہ بنانا جائز نہیں ہوگا، البتہ ضرورت کے تحت عارضی طور پر صرف امام صاحب کے واسطے ایک رہائشی کمرہ بنایا جاسکتا ہے بچے وغیرہ نہ رہیں جس میں بیت الخلاء اور استنجا خانہ بھی بنانا جائز نہ ہوگا، اس میں بھی مسجد کے آداب واحترام کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا، پس جناب مفتی صاحب کے جواز کا فتوی درست نہیں ہے۔

فقط واللہ اعلم.

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دار الافتاء
۱۲/ ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

مسجد کے اندر باجرت تعویذ لکھنا

(۱۶۱) سوال: ۔ ہمارے محلّہ کے امام صاحب داخل مسجد میں بیٹھ کر باجرت تعویذ لکھتے ہیں اور لوگوں کو

دیتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ شرعاً مسجد میں ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

مسجد میں اجرت لیکر تعویذ لکھنا جائز ہے۔

وکذا فی "الولوالجیة": الخیاط إذا کان یخیط الثوب فی المسجد یکرہ لماروی عن عثمان رضی اللّٰہ عنہ أنہ رأی خیاطًا فی المسجد فأمر بہ فأخرج من المسجد وکذالورّاق إذا کان یکتب فی المسجد بالأجر. فعلیٰ ھذاالفقھاء إذاکانوا یکتبون الفقہ بالأجر فی المسجد یکرہ وإن کان بغیر أجر لایکرہ لأنہ إذاکان بأجر کان العمل للعبد والمسجد لم یبن لذلک لأنہ بیت اللّٰہ تعالیٰ. (الولوالجیة ج ۱ ص ۵۳)

فقط واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح — کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ — معاون مفتی دار الافتاء
۱۲ جمادی الاخری ۱۴۲۳ھ — ۱۲ جمادی الاخری ۱۴۲۳ھ

جنبی اور حائضہ کو مسجد سے گزرنے کا حکم

(۱۶۲) سوال: ـ جناب مفتی صاحب! میں نوجوان آدمی ہوں تبلیغی جماعت میں جاتا ہوں کبھی کبھی مجھے رات کو مسجد میں احتلام ہوجاتا ہے، بعض لوگوں سے سنا کہ حالت جنابت میں مسجد کے اندر رہنا اور گزرنا حرام ہے، یہ بات کہاں تک درست ہے اور اس حالت میں جنبی کو کیا کرنا چاہئے؟ مسجد کے فرش پر یا دیوار پر تیمّم کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حدیث شریف میں ہے کہ "إِنَّ بُيُوْتَ اللّٰهِ مِنَ الْأَرْضِ مَسَاجِدُ هَا" (یعنی روئے زمین کی تمام مساجد اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں) پس مساجد کی عظمت ووقار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے اور ان کی بے ادبی وبے احترامی خداوندِ کبریا کی بے ادبی وبے احترامی ہے فلہٰذا ہر ایک مسلمان پر ضروری اور لازم

ہے کہ مسجد کے آداب واحترام کا خیال رکھے۔

جنبی اور حائضہ اور نفاس والی عورتوں کو مسجد میں داخل ہونا، مسجد سے گزرنا ناجائز اور حرام ہے البتہ کسی کو اگر مسجد میں احتلام ہوگیا تو اُس کو جلد از جلد غسل کے لئے نکل جانا ضروری ہے، ہاں! نکلنا اگر مشکل ہو تو تیمّم کر کے رہے، یاد رہے کہ مسجد کے فرش یا دیواروں پر تیمم کرنا ناجائز ہے، مگر مسجد کے کونے میں کوئی گرد و غبار پڑی ہو تو اس سے تیمّم کرسکتا ہے یا گرد وغبار والی لکڑی وغیرہ ہے اس سے بھی تیمم کرسکتا ہے۔

كمافى "الولو الجية": النائم إذا احتلم وهو فى المسجد إن أمكنه أن يخرج من ساعته خرج واغتسل حتى لايبقى فى المسجد جنبًا وإن كان لم يمكن بأن كان فى وسط الليل ولم تقدر على الخروج ؟ يستحب له التيمم حتى لايبقى فى المسجد جنبًا ويكره مسح الرجل من الطين والرذغة باسطوانة المسجد أوحائط من حيطانه لأن حكمه حكم المسجد وإن مسح ببرى المسجد أو بقطعة حصير ملقاة فيه لاباس به لأن حكمه ليس حكم المسجد ولاله حكم حرمة المسجد كذا قالوا والأولىٰ أن لايفعل وإن مسح بتراب فى المسجد ؟ فإن كان مجموعًا لابأس به إن كان منبسطًا يكره هوالمختار وإليه ذهب أبوالقاسم الصفار رحمه الله لأنه له حكم الأرض فكان من المسجد وإن مسح بخشبة موضوعة فى المسجد لاباس به لأنه ليس لهذه الخشبة حكم المسجد فلا يكون لهاحرمة المسجد . (ج ١ ص ۵۳)

فقط اللّٰه تعالیٰ اعلم.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۲/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۱۲/ذیقعدہ ۱۴۲۶ھ

اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے

(۱۶۳) سوال:- جناب مفتی صاحب! ہمارے محلّہ کی مسجد چھوٹی ہے مگر ہمارے قریبی محلّہ کی مسجد بڑی اور جامع مسجد ہے، اب زیادہ ثواب کی نیت سے اپنے محلّہ کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں جا کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب ومنه الصدق والصواب

اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنا افضل ہے، جبکہ اس کو چھوڑنے سے نمازیوں کی کمی ہوگی لیکن اگر محلہ کی مسجد نمازیوں سے بھر جاتی ہے تو پھر ثواب کی نیت سے دوسری مسجد میں جا سکتا ہے اور ثواب بھی زیادہ ملے گا۔

كما في "الولوالجية": رجل له مسجد حيي في محلة فحضر المسجد الجامع لكثرة جماعته فالصلوٰة في مسجده أفضل قلّ أهل مسجده أو كثر والأن لمسجده حقاً عليه وليس لذلك المسجدحق فلم يقع التعارض ليترجح على مسجده بالجمع (ج ا ص ۵۵)

فقط اللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب۔

الجواب صحیح
محمد عبد السلام عفا اللہ عنہ
۱۳/ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

کتبہ محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
مفتی دار الافتاء
۱۳/ جمادی الاخری ۱۴۲۶ھ

مسجد کی چھت پر بیل کے درختوں کو چڑھانے کا کیا حکم رکھتا ہے

(۱۶۴) سوال:- مسجد کی چھت پر کدو کے درخت وغیر چڑھانے کی اجازت ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ اس میں مسجد کے لئے ایک قسم کا نفع بھی ہے یعنی کدو وغیرہ کی قیمت مسجد کے کام میں استعمال کی جا سکتی ہے۔

الجواب ومنه الصدق والصواب

مسجد کی چھت پر بیل دار درختوں کو چڑھانے سے اگر چھت یا دیوار کو نقصان ہوتا ہے یا سامنے کی طرف ہے جیسے گھر میں ہوتا ہے تو درست نہیں اور اگر مسجد کی چھت اور دیوار کو نقصان نہیں ہوتا اور سامنے کی طرف بھی نہیں تو درست ہے جبکہ مسجد کا نفع ہو۔

كمافي "الولوالجية": غرس الأشجار في المسجد إن كان بحال فيه نفع للمسجدبأن تكون أرضه ذات نزّ واسطوانتها لاتستقرفغرس الأشجار لتجذب

عروق الأشجار ذلک النز یجوز وإلافلا لأن غرس الأشجار فی المسجد یشبه بالبیعة وذلک لایجوز إلالحاجة قالوا : إنما جوز واه مشائخنا فی مسجد جامع بخاری لما قلنا من الحاجة. (کتاب الطهارة الفصل الرابع: ج ا ص ۵۵)

فقط واللّٰه سبحانه وتعالیٰ أعلم بالصواب

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۲۱ ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
معاون مفتی دارالافتاء
۲۱ ر جمادی الاخریٰ ۱۴۲۶ھ

مسجد کے اندر چندہ کرنے کا حکم

(۱۶۵) سوال: - ہماری مسجد میں خطیب صاحب ہر جمعہ کے روز مدرسہ کے یتیم وغریب طلبہ کے واسطے نمازی لوگوں سے خطبہ سے قبل چندہ کرتے ہیں، لوگ بھی چندہ دیتے ہیں، کچھ دن سے قبل مدرسہ میں ایک مولانا صاحب کا تقرر ہوا انہوں نے بحوالہ ”محیط“ کہا کہ مسجد کے اندر چندہ کرنا اور چندہ دینا دونوں ناجائز ہیں، اب سوال یہ ہے کہ مولانا صاحب کی بات کس قدر درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

”محیط“ میں ہے: **قال محمّد: ویفترض علی الناس إطعام المحتاج فی الوقت الذی یعجز عن الخروج والطلب** (ج۶ ص ۱۵۸)

یعنی مدرسہ کے غریب طلباء اور فقراء کو امداد دینا بحسب طاقت ہر توانگر مسلمان پر ضروری ہے ائمہ مساجد کو چاہئے کہ اس سلسلہ میں لوگوں کو ترغیب دیں اور اس کے فضائل بیان کریں، ضرورت کے موقع پر مسجد کے اندر خطبہ سے قبل چندہ کر سکتے ہیں بشرطیکہ نمازی لوگوں کو تکلیف نہ ہو اور مسجد میں شور وغل بھی نہ ہو البتہ عام سوال کرنے والے اگر سوال کرنے لگیں تو انکو مسجد کے اندر چندہ کرنے نہ دیں، ان کو چندہ دینا ممنوع ہے، اسی کو محیط والے نے ذکر کیا، چنانچہ محیط کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

ولا ینبغی أن یتصدق علی السائل فی المسجد الجامع لأنه إعانة لهم علی أذی الناس وقد قال خلف بن أیوب لو کنت قاضیالم اقبل شهادة من یتصدق فی المسجد الجامع وقال الفقیه أبوبکر بن إسماعیل الواهب بفلس یحتاج إلی

سبعین فلیسًا لیصیر کفارة له. (المحیط البرهانی: ج٦ ص١٥٦)

لہٰذا جناب مولانا صاحب کی بات علی الاطلاق درست نہیں ہے جزوی طور پر درست ہے۔

فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب.

الجواب صحیح کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ معاون مفتی دارالافتاء
۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۷ھ ۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۷ھ

بے نمازی عورت کو طلاق دینے کا حکم

(۱۶۶) سوال: - جناب مفتی صاحب! میری بیوی صاحبہ نماز نہیں پڑھتی میں نے اسے بہت سمجھایا ہلکی مار مارا بھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ نماز نہیں پڑھتی، اب میں اُسے طلاق دینا چاہتا ہوں از روئے شرع درست ہوگا یا نہیں؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

صورت مسئولہ میں طلاق دے سکتے ہیں البتہ صرف ایک طلاق رجعی دیوے اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ عورت کی اگر عدت کے اندر اندر اصلاح ہو جاوے تو آپ دوبارہ اُس سے رجعت کر سکتے ہیں، عدت ختم ہو جاوے رجوع نہ کیا گیا تو صرف تجدید نکاح کافی ہے حلالہ شرعیہ کی ضرورت نہیں ہوگی بخلاف تین طلاق کے۔

قال فی المحیط رجل له امرأة لاتصلی یطلقها حتی تصحب امرأة لاتصلی فإن لم یکن له مایعطی مهرها فالأولیٰ أن یطلقها قال الإمام أبوبکر حفص الکبیر رحمة اللّٰه علیه صاحب محمد بن الحسن أن لقی اللّٰه تعالیٰ ومهرها فی ذمته أحب إلی من أن یطا امرأة لاتصلی.

فقط واللّٰه تعالی أعلم بالصواب

الجواب صحیح کتبہ: محمد کمال حسین مومنشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ معاون مفتی دارالافتاء
۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ ۲۱ رمحرم الحرام ۱۴۲۶ھ

مال حرام سے مسجد ومدرسہ کے بیت الخلاء تعمیر کرنا

(۱۶۷) سوال: -جناب ایک عالم صاحب نے کہا کہ مال حرام سے مسجد ومدرسہ کے بیت الخلاء تعمیر کرسکتا ہے اس سے حرام لینے والے کو نجات حاصل ہوجائے گی اب سوال یہ کہ جناب کا کہنا کہاں تک درست ہے؟

الجواب ومنہ الصدق والصواب

مال حرام سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس سے مال حرام حاصل کیا گیا ہے اگر وہ زندہ ہے تو اس کو ورنہ اس کے ورثاء کو پہنچایا جائے اور جب تک وہ لوگ زندہ رہیں اور انکا حق ان کو پہنچانا بھی ممکن ہو تو دوسرا کوئی راستہ اختیار کرنا درست نہیں ہے البتہ مالک یا اس کے ورثاء زندہ نہیں ہیں یا ان تک پہنچانا ممکن نہیں تو اصل مالک کی جانب سے اس کے لئے صدقہ کی نیت کرکے صدقہ کردینا واجب ہے اور صدقہ میں دو باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے ایک یہ کہ مستحق زکوٰۃ وصدقہ کو دینا ہوگا اور دوسری بات یہ کہ ان کو اسکا مالک بنادینا ہوگا ورنہ مال حرام سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔

قال في "الشامية" : والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه.

پس مال حرام سے مسجد، مدرسہ اوران کے وضو خانہ، بیت الخلاء، شفا خانہ، خانقاہ، مسافر خانہ، وغیرہ کی تعمیر کرنا جائز نہیں ہے، پس جن عالم صاحب نے مال حرام سے مدرسہ کے بیت الخلاء کی تعمیر کو جائز کہا ہے غلط اور نادرست ہے۔

فقط و اللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم بالصواب .

الجواب صحیح	کتبہ: محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ	معاون مفتی دارالافتاء
یکم محرم الحرام ۱۴۲۷ھ	یکم محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

* * *

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (الأية)
مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ فَمَنْ قَدْ مَاتَ (الحديث).

منبر نبوی ﷺ کیسا تھا
اور
دور حاضر کے منبر جدید کا حکم

✸ امت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع لازم ہے اور آپ کی مخالفت گمراہی ہے

✸ شعائر اللہ کی تعریف اور اس کے ماتحت آنے والی اشیاء اور شعائر اللہ کا احترام ۔

✸ منبر نبوی ﷺ شعائر اللہ کی بے حرمتی پر ایک عجیب وغریب واقعہ کا پیش آنا

✸ منبر دعا قبول ہونے کی جگہوں میں سے ایک جگہ ہے۔

✸ منبر کی تعمیر کے بارے میں آپ ﷺ کا صحابۂ کرامؓ سے مشورہ کرنا اور منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر تاریخ۔

✸ منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں کتنی تھیں اور اس کی شکل وصورت اور طول وعرض کیا تھے؟

✸ آپ ﷺ اور خلفاء راشدین منبر کے کس درجہ پر بیٹھتے تھے؟

✸ خلاصۂ بحث اور جواب استفتاء۔

✸ بعض شبہات کے ازالات۔

✸ تصدیقات۔

(۱۶۸) سوال:- حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم عمت فیوضہم،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی خیریت سے ہونگے ایک مسئلہ درپیش ہے اس کی تحقیق کی ضرورت ہے، مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے علاقہ کے ایک مشہور عالم دین جو کہ "جامعة الأزهر" مصر کے فارغ ہیں، فی الحال وہ رابطۂ عالم اسلامی کویت کے رکن ہیں، رابطہ کی طرف سے مسجد دیتے ہیں، ہم نے اپنے مدرسہ کیلئے ایک مسجد کی درخواست کی تھی، اب وہ منظور ہوگئی ہے، گزشتہ ہفتہ مولانا موصوف اور وہاں کے ایک شیخ نے آکر ہمیں مسجد کا ایک نقشہ دیا ہے اور کہا کہ اس نقشہ کے مطابق مسجد ہوگی، ماشاء اللہ مسجد کا نقشہ بہت اچھا ہے اس میں ہمیں کوئی اشکال نہیں۔

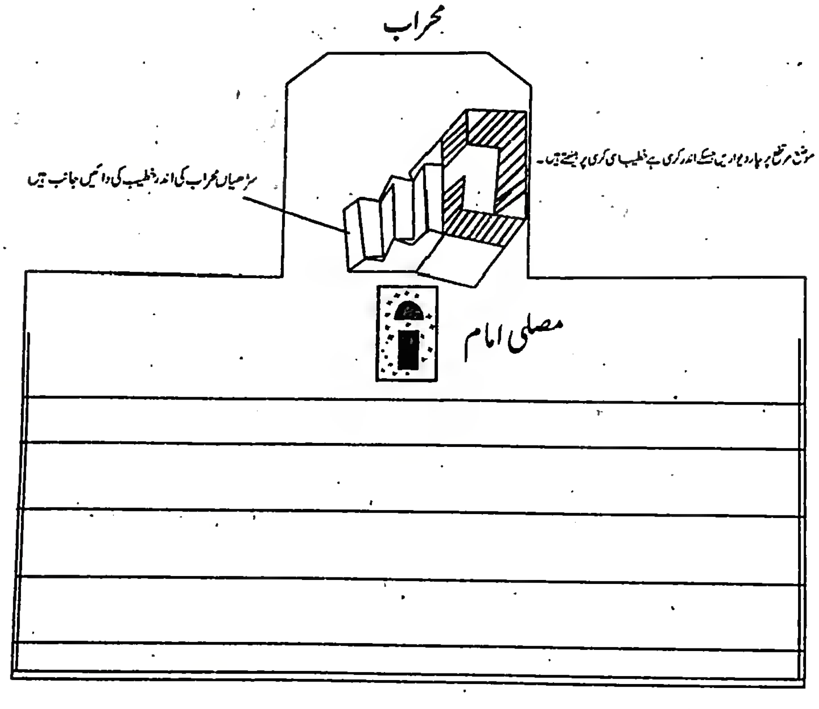
محراب
موضع مرتفع پر چار دیواریں جسکے اندر کرسی ہے خطیب اسی کرسی پر بیٹھتے ہیں۔
سڑھیاں محراب کی اندر خطیب کی دائیں جانب ہیں
مصلی امام

منبر کا نقشہ یوں ہے کہ موضع مرتفع پر چار دیواریں ہیں جس کے اندر ایک کرسی ہے خطیب صاحب اسی کرسی پر بیٹھتے ہیں منبر کے اوپر چڑھنے کی سیڑھیاں محراب کے اندر امام کے مصلیٰ اور محراب کی پچھّم والی دیوار کی طرف سے شروع ہوتی ہیں اور مشرق کی طرف منہ کر کے خطیب صاحب منبر کی چار دیواری جاتے ہیں۔

اس طرح بعض مسجدوں کے منبروں کے متعلق میں نے ایک سال قبل آپ سے زبانی طور پر پوچھا تھا، تو آپ نے فرمایا تھا کہ استاد جی حضرت علامہ مفتی محمد عبدالسلام صاحب مدظلہ العالی چاٹگامی اس نئی طرز کے منبر کو بدعت اور خلاف سنت کہتے ہیں، پس ہمارے دارالافتاء کا فتویٰ یہی ہے۔

اسی بنا پر میں نے اور مدرسہ کے دیگر اساتذہ کرام نے مولانا موصوف سے گذارش کی کہ مسجد آپکے نقشہ کے مطابق ہی ہوگی مگر نقشہ میں جو منبر دکھایا گیا ہے یہ منبر خلاف سنت معلوم ہوتا ہے اور عام مساجد کے منبروں سے جدا ہے، اس لئے منبر کو ہم سنت کے مطابق بنائیں گے، تو مولانا موصوف غصہ ہوکر ہمیں کہنے لگے آپ لوگ جانتے ہو! کہ سنت اور بدعت کس کو کہتے ہیں، بیہودہ بنی اسرائیل کی طرح اپنے نفس پر سختی کیوں کرتے ہو، تشدد مت کرو، مولانا کی باتیں ہم لوگوں نے سنیں اور صبر کے ساتھ کام لیا، کچھ بُرا بھلا نہیں کہا، پھر مولانا نے کہا منبر کی یہ صورت بدعت نہیں اور چند شبہات کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ ہیں کہ

(۱) منبر عبادات کے قبیل سے نہیں، اس لئے اسکی صورت وشکل میں اضافہ وترمیم کرنا بدعت نہیں، اگر بدعت ہو تو ساری مساجد کے جتنے پکے منبر ہیں سب کے سب منبر بدعت ہوں گے، کیونکہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لکڑی کا تھا نہ کہ پکا۔

(۲) اگر منبر نبوی ﷺ میں اضافہ وترمیم بدعت ہوتی تو مروان نے اس میں کس طرح اضافہ کیا ہے؟ جبکہ اس زمانہ میں بھی مفتیان کرام موجود تھے۔

(۳) منبر سے موضع مرتفع مراد ہے پس موضع مرتفع پر چڑھنے اور اُترنے کی غرض سے جس جانب چاہے دو چار سیڑھیاں لگائی جاسکتی ہیں، جیسا کہ ہمارے نقشہ میں سیڑھیاں مغرب کی جانب لگائی گئی ہیں، خطیب صاحب مشرق کی جانب چڑھیں گے پھر بعد ازاں مشرق کی طرف منہ کر کے خطبہ دیں گے اس میں کوئی حرج نہیں، بالآخر مولانا نے کہا جاؤ! کسی معتبر مفتی سے فتویٰ منگوالو۔ میں اس بارے میں مناظرہ کرنے کیلئے تیار ہوں "انتہی کلامہ"

اب ہمیں مندرجہ ذیل امور کی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی:

(۱) منبر نبوی ﷺ کی تأسیس کیسے ہوئی؟ اور کس نے بنایا اور کب بنایا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح حکم دیا تھا؟ ان سب چیزوں کی تفصیل چاہئے۔

(۲) منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں کتنی تھیں اسکے طبقات کتنے تھے محراب کے اندر جاکر دیوار سے شروع ہوتی تھیں یا محراب کے باہر دائیں جانب مشرق سے مغرب کی طرف چڑھنا ہوتا ہے

(۳) منبر نبوی ﷺ کا طول وعرض کیا تھا؟

(۴) منبر مسجد نبوی ﷺ کی کس جگہ پر نصب کیا گیا تھا۔

(۵) آپ ﷺ اور خلفائے راشدین منبر کے کس درجہ پر بیٹھتے تھے؟ پھر یہ بھی بتا دینا کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے منبر کی موجودہ ہیئت وشکل سنت ہے یا نہیں؟ اگر آپ کا منبر شریف اپنی متوارث کیفیت کے اعتبار سے سنت ہے تو اس کے خلاف کرنا سنت کے خلاف ہے یا نہیں؟

فلہٰذا جناب عالی سے گذارش ہے کہ ان مسائل پر اپنی محققانہ تحریر اور شرعی حکم سے ہمیں مطلع فرمائیں تا کہ ہماری مسجد اور دوسری ساری مسجدوں کے سنت کے مطابق بن سکیں اور ہمارے درمیان واقع ہونے والی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں۔

مستفتی (مولانا) عبدالرحمٰن قاسمی

الجواب باسمہ تعالیٰ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ . اَمَّابَعْدُ!

امت محمد پر آپ ﷺ کی اتباع اور پیروی لازم ہے اسکے خلاف کرنا غلط اور گمراہی ہے

✷ چنانچہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قل إن كنتم تحبون اللّٰه فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم والله غفور رحيم. (عمران. ۳۱)

ترجمہ: تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (تفسیر عثمانی ج ۱ ص ۱۸۴)

تشریح: جو شخص جس قدر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر چلتا ہے اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے، سمجھنا چاہئے کہ خدا کی محبت کے دعویٰ میں وہ اسی قدر سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعوی میں سچا ہوگا اتنا ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا، جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور حضور ﷺ کی اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی ہوں گی۔

(تفسیر عثمانی: ج ۱ ص ۱۸۴)

حدیث شریف میں ارشاد ہے:

قال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم لايؤمن أحدكم حتى يكون هواه تبعا

لماجئت به. (مشکوۃ ج ا ص ۳۰)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم میں سے کوئی شخص کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشات اس (دین و شریعت) کی تابع نہ ہوجائیں جو میں اللہ کی طرف سے لیکر آیا ہوں۔

آیت اور حدیث بالا سے واضح ہوگیا کہ امت کو اپنے اعمال و افعال میں نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنا ضروری ہے اور ان کی راہ سے ہٹنے میں ضلالت اور گمراہی ہے جو کہ موجب ہلاکت ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهديين تمسكوا بها وعضوا بها عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الأمور فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة .

(رواه أحمد وأبوداود والترمذی وابن ماجه، مشکوۃ: ج ا ص ۳۰)

مطلب:- آپ ﷺ نے وصیت فرمائی کہ میرے اسوہ اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طور و طریق کو لازم پکڑنا، اسی پر بھروسہ کرنا اور اس کو دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑے رہنا نیز (دین میں پیدا کی جانے والی) نئی نئی باتوں سے بچنا کیونکہ ہر نئی بات درحقیقت بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

✵ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

من كان مستنا فليستن فيمن قد مات فإن الحی لاتؤمن عليه الفتنة اولئک أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا أفضل هذه الأمة الخ .

(مشکوۃ: ج ا ص ۳۲)

ترجمہ: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص کسی طریقہ پر چلنا چاہتا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ ان لوگوں کا طریقہ اختیار کرے جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں کیونکہ زندہ شخص (دین میں) فتنوں سے محفوظ و مامون نہیں ہوتا اور وہ لوگ (جو اس دنیا سے گزر گئے ہیں اور جن کے اسوہ کی پیروی کرنی چاہئے) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں جو اس امت کے سب سے اچھے لوگ تھے اس کے بعد تابعین پھر تبع تابعین ہیں۔

ان احادیث رسول ﷺ سے معلوم ہوا کہ دین میں سنت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں پر عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے اور یہ راہ ہدایت ہے اور اس میں اپنی رائے اور خواہش سے کچھ تبدیل و ترمیم کرنا بے راہ روی ہے جو کہ درست نہیں ہے پھر کسی نے اپنی طرف سے کسی عمل کا دین میں

اضافہ کرلیا تو یہ دلیل ہوگی اس بات کی کہ اضافہ کرنے والا دین کو ناقص پایا ورنہ اضافہ کی حاجت کیوں ہوئی۔

لہٰذا ہمارے آقائے نامدار تاج دار مدینہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے منبر کی صورت وشکل مدینہ و مکہ میں آپ کی زندگی میں جو تھی اور آپ کے حکم سے بنی تھی وہ صحابہ کے دور میں، تابعین کے دور میں، تبع تابعین کے دور میں توارث کے ساتھ چلی آرہی ہے، لہٰذا قیامت تک جو مساجد بنیں گی جو منبر بنیں گے ان کا منبر و محراب اس طرح بننا چاہئے جس طرح متوارث چلا آرہا ہے، یہی سنت ہے، اس کی مخالفت سنت کی مخالفت ہے، جو کسی امتی کیلئے جائز نہیں، اگر کسی نے اس میں اپنی طرف سے نئی صورت وشکل بنا کر ترمیم واضافہ کیا ہے، تو یہ بھی دلیل ہوگی اس بات کی کہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت اس کو پسند نہیں ہے ورنہ اس کو اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے محبت ہوتی، تو اس کی مخالفت کیوں کرتا؟

شعائر اللہ کی تعظیم واحترام ہر مسلمان پر ضروری ہے

✵ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا لاتحلوا شعائر اللّٰہ ولاالشھر الحرام ولاالھدی ولاالقلائد ولاآمین البیت الحرام یبتغون فضلامن ربھم ورضوانا الخ (سورۃ المائدۃ: ایت ۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو، خدا تعالیٰ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینہ کی اور نہ حرم میں قربان ہونے والے (جانوروں) کی جنکے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں اور نہ ان لوگوں کی جو کہ بیت الحرام کے قصد سے جارہے ہوں اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں۔ (بیان القرآن)

✵ دوسری جگہ ارشاد ہے:

ذلک ومن یعظم شعائر اللّٰہ فإنھا من تقوی القلوب: (سورۃ الحج ۳۳)

ترجمہ: یہ بات بھی ہوچکی اور جو شخص (دین) خداوندی کی (ان مذکورہ) یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا تو (اس کا) یہ (لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ سے) دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

(بیان القرآن)

آیات بالا سے واضح ہوگیا کہ شعائر اللہ کی تعظیم واحترام بجا رکھنا ایماندار اور مسلمان پر ضروری ہے،

اس کی ہتک اور بے حرمتی کرنا حرام اور ناجائز ہے، یہ چیز صرف تقویٰ دار شخص ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اب شعائر اللہ کی تعریف اور اس کے ماتحت کیا کیا چیزیں داخل ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیں۔

شعائر اللہ کی تعریف

✵ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قوله من شعائر اللّٰه أى من معالم ومواضع عباداته وهى جمع شعيرة والشعائر المتعبدات التى أشعرها اللّٰه تعالىٰ أى جعلها أعلاما للناس من الموقف والشعر والنحر الخ. (تفسیر قرطبی: ج۲ ص۸۰)

✵ امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قد دل على أنه قربة لأن الشعائر هو معالم للطاعات والقرب فهو ماخوذ من الأشعار الذى هو الأعلام من ذلك قولك شعرت بكذا بكذا علمته ومنه الشعار البدنة اى اعلامها للقربة وشعار الحرب علامتها التى يتعارفون بها الشعائر هى المعالم للقرب. (أحكام القرآن ج ۱ ص ۹۸)

شعائر اللہ کے ماتحت کیا کیا چیزیں داخل ہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لئے علامات اور نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی مت کرو، ان میں حرم محترم بیت اللہ شریف، جمرات، صفا مروہ، ہدی، احرام، مساجد، کتب سماویہ، وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں: (تفسیر عثمانی ج ۱ ص ۳۲۴)

مذکورہ بالا تفاسیر سے معلوم ہوا کہ صفا مروہ، ہدی بدنہ اور تمام مساجد اور عبادت گاہیں جیسے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، بیت المقدس، عرفہ، مزدلفہ، جمرات، تمام مساجد، مدارس دینیہ، کتب سماویہ، سب کے سب شعائر اللہ کے تحت داخل ہیں، ویسا ہی منبر نبوی ﷺ اور تمام مساجد کے منبر بھی شعائر اللہ کے تحت داخل ہیں اس لئے انکے آداب واحترام کا خیال رکھنا ضروری ہے، اور ان کی بے حرمتی کرنا ناجائز ہے نیز ان کی بے حرمتی میں دینوی اور اخروی تباہی بھی ہے۔ چنانچہ:

منبر نبوی ﷺ کی بے حرمتی پر ایک عجیب وغریب واقعہ

✸ علامہ سمہودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> كتب معاوية رضى الله عنه إلي مروان وهو علي المدينة أن أرسل بمنبر رسول الله صلى الله عليه وسلم فخرج مروان فقلعه فأصابتنا ريح مظلمة بدت فيها النجوم نهارًا ويلقى الرجل الرجل يصكه فلايعرفه وذكر اعتذارمروان المتقدم وقال إنما كتب إلي يامرني أن أرفعه وفي رواية فزاد فيه ست درجات وخطب الناس فقال: إني إنما رفعته حين كثر النا. (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفى: ج ۱ ص ۳۹۹)

یعنی ایک مرتبہ شامی حکومت نے اپنے زمانۂ امارت میں حاکم مدینہ مروان کے ذریعہ منبر نبوی ﷺ کو مسجد نبوی ﷺ سے اٹھوا کر اپنے پاس ملک شام میں لیجانا چاہا، چنانچہ منبر شریف کو اپنی جگہ سے اٹھوایا گیا تو اچانک مدینہ کے اندر سورج میں گہن لگ گیا، جس سے چاروں طرف تاریکی پھیل گئی یہاں تک کہ دن کے ہوتے ہوئے رات کی طرح بعض ستارے نظر آنے لگے اور آدمی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے، کوئی شخص دوسرے آدمی کو پہچانتا نہیں تھا لوگوں میں گھبراہٹ اور سخت خوف طاری ہو گیا مروان نے اسی حالت کو دیکھا اور دیکھ کر گھبرا گیا پھر منبر شریف کو اپنی جگہ سے منتقل کرنے کا ارادہ ترک کر کے لوگوں سے عذر کیا اور یہ اعلان کیا کہ منبر شریف کو بلندی اور مضبوطی کی غرض سے اٹھوایا گیا ہے اعتذار کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی چاہی اللہ تعالیٰ نے آسمان کو صاف کر دیا سورج نظر آنے لگا، پھر مروان ہی نے منبر رسول ﷺ کو مستحکم کر کے بنا دیا اور اس کو مزید درجے بڑھا کر اونچا اور مضبوط بنا دیا، غرض منبر شریف کو اپنی جگہ رکھوا دیا اور اونچا اور مضبوط کر کے اپنی پہلی کیفیت میں بنوا دیا گیا۔

اللہ اکبر دیکھئے! منبر رسول اللہ ﷺ کے منتقل اور تبدیل کرنے کے ارادہ سے کیسے خطرناک حالات پیدا ہو گئے تھے اور اس کو ترک کرنے پر کیسا سکون حاصل ہوا، اب بتایئے جو منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت وشکل کو بدل کر دوسری شکل وصورت بنائیگا اس کا کیا انجام ہوگا؟ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو صحیح دین کی سمجھ عطا فرما دے، منبر شعائر اللہ کے ماتحت داخل ہونے پر ایک اور مزید روایت ملاحظہ فرمایئے۔

منبر پر آپ ﷺ کی دعا اور جبرائیل علیہ السلام کا آمین کہنا

اسی منبر پر آپ ﷺ آخری عمر تک خطبہ دیتے رہے، تقریر فرماتے رہے، کبھی کبھار اس پر دعا فرمایا

کرتے تھے چنانچہ فضائل رمضان کی ایک حدیث میں ہے:

عن كعب بن عجرة رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم احضروا المنبر فحضرنا فلما ارتقى درجة قال امين فلما ارتقى الدرجة الثانية قال امين فلما ارتقى الدرجة الثالثة قال امين فلما نزل قلنا يارسول الله صلى الله عليه وسلم لقد سمعنامنك اليوم شيئاً ماكنا نسمعه قال إن جبرئيل عرض لى فقال بعد من أدرك رمضان فلم يغفرله قلت امين فلمارقيت الثانية قال بعد من ذكرت عنده فلم يصل عليك قلت امين فلمارقيت الثالثة قال بعد من أدرك أبويه الكبر عنده أواحدهما فلم يدخلاه الجنة أمين.

(رواه الحاكم وقال صحيح الاسناد)

ترجمہ: کعب بن عجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منبر کے قریب ہوجاؤ ہم لوگ حاضر ہوگئے، جب حضور ﷺ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم رکھا، تو فرمایا آمین جب دوسرے درجہ پر قدم رکھا، تو پھر فرمایا آمین جب تیسرے درجہ پر قدم رکھا، تو پھر فرمایا آمین، جب آپ ﷺ خطبہ سے فارغ ہوکر نیچے اترے تو ہم نے عرض کیا کہ ہم نے آج آپ سے منبر پر چڑھتے ہوئے ایسی بات سنی کہ پہلے کبھی نہیں سنی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسوقت جبرائیل علیہ السلام میرے سامنے آئے تھے، جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا، تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس نے رمضان کا مبارک مہینہ پایا پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا آمین، پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے آپ کا ذکر مبارک ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا آمین، جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا ہلاک ہو وہ شخص جو اپنے والدین یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے میں پاوے اور وہ اسکو جنت میں داخل نہ کرائیں، میں نے کہا آمین۔

معلوم ہوا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس کے ہر درجہ پر چڑھتے وقت تین آدمیوں کیلئے بددعا کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دعاؤں پر آمین فرمایا، پس یہ جگہ دعا قبول ہونے کی جگہ ہے، عبادت گاہ ہے اور شعائر دین میں سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مساجد میں خطبوں کیلئے منبر بنانا اور اس پر خطبہ دینا سنت رسول اور سنت صحابہ ہے (کذافی حصن حصین)

منبر کی تاسیس کے بارے میں آپ ﷺ کا صحابۂ کرام سے مشورہ

منبر کی بنیاد آپ ﷺ نے خالص اپنی رائے سے نہیں رکھی بلکہ صحابۂ کرام کے ساتھ مشورہ کر کے اتفاق رائے سے رکھی عہد رسالت میں، پھر خیر القرون میں منبر کی وہی شکل وصورت قائم رہی ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی عملی سنت منبر میں جو شکل تھی اس کو باقی رکھنا سنت ہے اس میں تبدیلی کرنا خلاف سنت ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے: کہ ایک مرتبہ تمیم داری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں آکر کہا، یا رسول اللہ! میں آپ کے لئے ایک منبر بنانا چاہتا ہوں، آپ مجھے اس کی اجازت دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فوراً کچھ نہیں فرمایا، بلکہ اس بارے میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ کیا پھر اس کی اجازت دیں آپ کے منبر سے متعلق بے شمار حدیثیں وارد ہیں اس مقام پر سب کو ذکر کرنا مشکل ہے یہاں بطور نمونہ صرف کچھ احوال ذکر کر دئے گئے۔

كما فى " وفاء الوفاء باخبار دار المصطفى ": فقال تميم الدارى الأ أعمل لک منبرًا كما رأيت يصنع بالشام فشاور النبى صلى الله عليه وسلم المسلمين فى ذلک فرأوا أن يتخذه فقال العباس ابن عبدالمطلب إن لى غلامًا يقال كلاب اعمل الناس فقال مره أن يعمل الخ. وفى موضع آخر فلما أجمع رسول الله صلى الله وسلم وذو الرأى من أصحابه على اتخاذه الخ

(ج۲ص۳۹۳ وكذافى شرح ابى داؤد للعينى ج۴ص۴۲۰ وكذافى عمدة القارى شرح البخارى: ج۴ص۱۰۳)

جس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک منبر کا امر کس قدر قابل اہتمام تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذاتی رائے سے اس کا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ تمام اہل رائے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے اس بارے میں مشورہ کیا، جب سب نے مشورہ دیا اور اس پر اتفاق کیا، پھر آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی، یعنی منبر اپنی تفصیل کے ساتھ رسول ﷺ سے ثابت ہے، اس پر سب صحابہؓ کا اتفاق ہوا اور آپ ﷺ نے آخر میں فیصلہ کیا، اللہ تعالیٰ نے سب کو پسند فرمایا چنانچہ اسی منبر کے نام سے احادیث وارد ہوئیں۔

معلوم ہوا کہ منبر کا امر کوئی معمولی چیز نہیں کہ جس کا جی چاہے جس صورت وشکل میں منبر بنا لیوے اور اس میں خیر القرون کے لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں اور سنت متوارث کا مذاق اڑایا جائے۔

دیکھئے ہمارے اسلاف کے نزدیک منبر نبوی ﷺ کس قدر قابل اہتمام امر تھا کہ انہوں نے اس

کی تاریخ اور شکل وصورت کیسی تھی، ان سب چیزوں کو کتب احادیث اور تواریخ میں محفوظ کرلیا ہے، حتی کہ منبر کس نے بنایا ، کیسا بنایا گیا، حدیث میں ان کا مفصل ذکر ملتا ہے، غرض جب بھی منبر بنے اسی نمونہ پر بنے، نئی صورت وشکل ایجاد کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔

منبر نبوی ﷺ کی مختصر تاریخ

✵ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ”باب النجار“ کے تحت دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

(۱)عن أبی حازم (سلمة بن دینار)قال أتی رجال سهل بن سعد یسألونه عن المنبر فقال بعث رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فلانة امرأة قد سماها سهل أن مری غلامک النجار یعمل لی أعوادا أجلس علیهن إذا کملت الناس فأمرته یعملها من طرفاء الغابة ثم جاء بها فأرسلت إلی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم بهافأمر بها فوضعت فجلس علیها،

(کتاب البیوع باب النجار   بخاری: ج ۱ ص ۲۸۱)

(۲)عن جابر بن عبداللّٰه رضی اللّٰه عنهما أن امرأة من الأنصار قالت لرسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم یارسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلم ألا أجعل لک شیئا تقعد علیه فإن لی غلامًانجارًا قال إن شئت قال فعملت له المنبرفلما کان یوم الجمعة قعد النّبی صلّی اللّٰه علیه وسلم علی المنبر الذی صنع فصاحت النخلة التی کان یخطب عندها حتی کادت أن تنشق فنزل النّبی صلّی اللّٰه علیه وسلم حتی أخذ ها فضمها إلیه فجعلت تأن أنین الصبی الذی یسکت حتی استقرت قال بکی علی ماکانت تسمع من الذکر.

(کتاب البیوع باب النجار بخاری شریف: ج ۱ ص ۲۸۱)

یعنی ابتداء اسلام میں مسجد نبوی ﷺ کے اندر لکڑی کے منبر کا انتظام نہیں تھا، تو اس وقت آپ ﷺ کھجور کے تنے سے جو بطور ستون مسجد شریف میں نصب تھا اس پر ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، پھر جب لکڑی کا منبر بنانے اور اس کے تین درجات بنانے کے لئے ارشاد فرمایا اور اس کو محراب سے باہر اور محراب کی دائیں جانب نصب کرنے کا حکم دیا، شکل منبر کی یوں بنائی گئی کہ پہلی سیڑھی مشرق کی جانب سے شروع ہو، دوسری طاق بھی اسطرح ایک درجہ اوپر ہو، تیسری طاق اور ایک درجہ اوپر ہو، تاکہ منبر

پر چھڑھتے وقت چہرہ خطیب کا قبلہ کی طرف ہو اور چڑھنے کے بعد آخری یا دوسری طاق میں بیٹھ کر خطبہ دیوے پھر جب منبر کا انتظام مکمل ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے تنے کے بجائے لکڑی کے منبر پر کھڑے ہوئے، تو کھجور کا وہ تنا آپ ﷺ کے فراق صحبت سے رونے لگا اور اس میں سے ایسی آہ و بکا اور آوازیں آنے لگیں جیسے چھوٹا بچہ بلبلا کر روتا ہے، دوسری ایک روایت میں ہے جیسے اونٹنی اپنے بچہ کے گم ہو جانے پر بلبلانے لگتی ہے، وہ آوازیں کچھ ایسی دردناک تھیں کہ ساری مسجد ہل گئی، اور تمام صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی رونے لگے، یہاں تک کہ وہ تنا پھٹ کر ٹوٹ گیا، آنحضرت ﷺ منبر سے اُتر کر اس تنے کے پاس تشریف لے گئے اور اس پر اپنا دست مبارک رکھا تب وہ ساکن وصامت ہوا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس تنے کو ٹھیک منبر شریف کے نیچے دفن کر دیا گیا اور ایک روایت میں ہے کہ کھجور کے اس تنے کو مسجد کی چھت میں لگا دیا گیا۔

(الکوکب الدری وهامشها، معارف السنن، السیرة الحلبیة، عمدة القاری شرح البخاری: ج٦ ص ٢١٥)

منبر نبوی ﷺ کس سنہ ھ میں بنایا گیا

اس میں مختلف اقوال ہیں کہ منبر شریف کا بنانا اور اس کا مسجد نبوی ﷺ میں رکھا جانا اور اس پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ کے خطبہ دینے کا زمانہ کونسا تھا؟

✷ خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وثبت عندی نحو عشرین روایة أن المنبر کان فی السنة الثانیة من الهجرة.

باب ماجاء فی الخطبة علی المنبر (معارف السنن: ج٤ ص ٣٥٩)

کہ میرے علم میں تقریباً ۲۰ (بیس) روایتیں ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ۲ ھ میں منبر بن گیا اسی وقت سے آپ ﷺ اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے، اگرچہ قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

صنع منبره ﷺ فی السنة السابعة وقیل الثامنة من الهجرة،

(شرح الشفاء: ج٣ ص ٦١)

منبر نبوی ﷺ کس درخت کی لکڑی سے تیار کیا گیا

منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جھاؤ کی لکڑی سے تیار کیا گیا، چنانچہ بخاری شریف میں ہے: یعملها من

طرفاء الغابة. (ج ۱ ص ۲۸۱) اور ابوداود شریف کی روایت میں ہے :من أثل الغابة .

(من شرح ابی داود للعینی: ج ۴ ص ۴۱۶)

یعنی حضرت سہل بن سعد کی روایت میں ''طرفاء'' کا لفظ ہے جس کے معنی جھاؤ کے ہیں اور دوسری روایت میں ''اثل'' کا لفظ ہے، یہ بھی جھاؤ ہی کے معنی میں ہے، تاہم بعض محدثین حضرات نے کہا کہ اثل کا درخت اگرچہ ''طرفاء'' کے درخت کے مماثل ہوتا ہے مگر اس سے وہ بڑا ہوتا ہے اور اچھا بھی۔

✻ چنانچہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال القزاز:هو ضرب من الشجر يشبه الطرفاء وليس به وهو أجود منه عودًا ومنه تصنع قداح الميسرقال الخطابی: هوشجر الطرفاء وقال ابن سيده يشبه الطرفاء إلاأنه اعظم منه . (شرح سنن ابی داود للعینی : ج۴ ص ۴۱۶)

منبر نبوی ﷺ کے نجار کے اسماء

✻ نجار کے نام میں سات اقوال ہیں:

فقيل باقول ، ويقال باقوم ، قبيصة المخزومی قال يقال ميمون ، قال صباح وقيل ميناء وقيل ابراهيم . (سنن شرح ابی داود للعینی : ج۴ ص ۴۱۶)

عہد رسالت ﷺ اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے دور میں منبر نبوی ﷺ کی تین سیڑھیاں تھیں؟

منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سیڑھیاں تھیں اور پاس پاس تھیں، چنانچہ:

(ا) قال يحی أناعبدالعزيز بن حازم عن أبيه أن نفرًا جاء وا إلى سهل بن سعد قد تماروافی المنبر أی عودهو؟ فقال :اما والله أنی لأعرف من أی عود هو ومن عمله ورأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم أول يوم جلس عليه قال: فقلت له ياأباعباس فحدثناقال.أرسل رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى امرأة قال أبوحازم أنه ليسميها يومئذ أنظرى غلامک النجاريعمل لی أعوادًا أكلم الناس عليها فعمل هذه الثلاث درجات ثم أمربهارسول الله صلى الله عليه

وسلم فوضعت هذا الموضع فهى من طرفاء الغابة ولقد رأيت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم قام عليه الخ.

(مسلم شريف باب جواز الخطوة و الخطوتين فى الصلوة ج ا ص ٢٠٦)

(٢) فخرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يوم الجمعة فى يوم صائق شديد الحرومنبره قصيرإنما هوثلاث درجات عليه الخ هذاحديث صحيح على شرط البخارى (المستدرک للحاكم : كتاب الجمعة :١٠٣٨ /١٣)

(٣) فصنعواله ثلاث درجات فقام النبى صلى اللّٰه عليه وسلم الخ. (مجمع الزوائد: كتاب الصلوٰة، باب فى المنبر: ج٤ ص ٢٣٨. وكذافى أبى داود: كتاب الصلوٰة، باب فى اتخاذ المنبر .

مذکورہ بالا روایتوں سے معلوم ہوا کہ منبر نبوی ﷺ کی تین سیڑھیاں تھیں تمام محدثین ومؤرخین اس پر متفق ہیں۔

ایک شبہ اوراس کا جواب

شبہ: -کہ سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے: "**فاتخذله منبر مرقاتين**" اور دارمی کی روایت میں ہے: "**فجعلو اله مرقاتين أو ثلاثا**" توان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو سیڑھیاں تھیں، فلہٰذا مسلم شریف اور ابوداود شریف کی روایتوں کے مابین تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب :- درحقیقت منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سیڑھیاں تھیں اس میں کوئی اختلاف نہیں مگر سیڑھیوں کے شمار میں ایک پیچ ہے یعنی بعض محدثین کرام نے نشست گاہ کو سیڑھیوں میں شمار کیا اور بعض نے شمار نہیں کیا؟

✷ چنانچہ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فان قيل : ماالتوفيق بين الحديثين ؟ فإن فى حديث مسلم كماذكر ناثلاث درجات وفى الحديث مرقاتين وهما درجتان ؟قلنا الذى قال مرقاتين كأنه لم يعتبر الدرجة التى يجلس عليها والذى روى ثلاثا اعتبرها.

(شرح ابی داود للعینی (ج٤ص ٤٢٠) وكذافى بذل المجهود شرح ابى داود:(ج ٢ ص١٧٨)

یعنی مرقاتین والی روایت میں تیسرا درجہ جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھتے تھے شمار نہیں کیا گیا، اس لئے مرقاتین کہا گیا اور ثلاثا والی روایت میں تیسرے درجہ کو بھی شمار کیا گیا، اس لئے ثلاث درجات کہا گیا

فلہٰذا دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ فتامل۔

منبر نبوی ﷺ کی شکل وصورت اور اس کے طول وعرض

اللہ تعالیٰ محدثین کرام کی قبروں کو جنت کے باغات بنادے اور ان کی قبروں کو اپنے انوارات سے منوّر فرمادیوے کہ وہ دین کے تمام ضروری امور کو شریعت کی روشنی میں بیان فرما گئے ہیں اور ہمارے واسطے فقہ کے اصول وفروع بھی مقرر کردیئے ہیں، تاکہ کوئی مشکل مسئلہ اگر نظر آئے اور اس کی تحقیق کی ضرورت ہو تو اسی اصول وفروع کی بناپر اسکا حل نکالا جائے، اسی طرح محدثین اور مؤرخین حضرات نے منبر نبوی ﷺ کی کیفیت کو بھی بیان فرمایا ہیں۔

✷ چنانچہ سمھودی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال ابن زبانة : وطول منبر النّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم خاصة ذراعان فی السماء وعرضه ذارع فی ذراع وتربیعه سواء وفیه مماکان یلی ظهره إذاقعد ثلاثة أعواد تدور، ذهب إحداهن وانقلعت إحداهن سنة ثمانیة تسعین ومأة وأمربه داود بن عیسیٰ وفیما فأعید وفیما عمل مروان فی حائط المنبر الخشب عشر أعواد لایتحرکن وطول منبر النّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم مرتفع فی السماء مع الخشب الذی عمله مروان .أی الأعواد المتقدمةثلاث أذرع ونصف وقال عقب کلامه الأتی فی ذراع ماعلیه المنبر الیوم یعنی زمنه، مالفظه وطول المجلس أی مجلسه صلی اللّٰہ علیه وسلم.شبران وأربع أصابع فی مثل ذلک مربع فقوله أولا: وعرضه :ذراع فی ذراع إنما أراد مقعد المنبر لما قاله هنا فی وصف المقعد بدون درجتیه ولأنه قال هناعقب ماتقدم ومابین أسفل قوائم منبر النبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم الأوّل إلی رُمّانته خمسة أشبار وشیئ وعرض درجته شبران ، وطولها شبر وطوله من ورائه یعنی محل الإستناد شبران وشيً ، فیؤخذ من ذلک أن امتداد المنبر النّبوی من أوّله وهو ما یلی القبلة إلی مایلی آخرفی الشام أربعة أشبار وشیئ وقوله ومابین أسفل قوائم منبر النّبی صلّی اللّٰہ علیه وسلم إلی آخره معناه أن من طرف المنبر النّبوی الذی یلی الأرض إلی طرف رُمّانته التی یضع علیها یده الکریمة

خمسة أشبار وشيئ وذلك نحو ذراعين ونصف وقد تقدم أن ارتفاع المنبر النبوى خاصة ذرعان فيكون ارتفاع الرمانة نحو نصف ذراع قال بن النجار: طول منبر النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ذراعان وشبر وثلاث أصابع وعرضه ذراع راجح وطول صدره وهو مستندالنبى صلى اللّٰه عليه وسلم ذراع وطول رمانتى المنبر اللتين كان يمسكهما بيده الكريمتين إذا جلس شبر وأصبعان وعرضه ذارع فى ذراع. يريد وتزبيعه سواء كان ولايخفىٰ مافيه من المخالفة الكلام ابن زبالة ، (وفاء الوفاء باخباردار المطصفىٰ: ج ۱ ص ۴۰۲–۴۳۰)

خلاصہ یہ کہ منبر نبوی ﷺ اونچائی میں دو ہاتھ اونچا تھا اور اس کی چوڑائی ایک ہاتھ سے کچھ زیادہ تھی، اوپر والی سیڑھی اور دوسری سیڑھی کے دائیں بائیں ہاتھ مبارک رکھنے کے لئے لکڑی کی دیواریں تھیں، تیسری بالائی سیڑھی کے پیچھے کی طرف لکڑی کی تین رولیں تھیں جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور منبر کے چار پائے تھے اور منبر کے دونوں جانب میں رمانہ یعنی لکڑی کا رول بنا ہوا تھا جس کو آپ ﷺ اپنے دست مبارک سے پکڑتے تھے اور درجہ سفلی میں دائیں بائیں جانب کچھ نہ تھا، یعنی اس کی دائیں بائیں اور سامنے کی طرف کھولی تھیں۔

* * *

منبر نبوی ﷺ کا نقشہ مبارک (تقریبا)

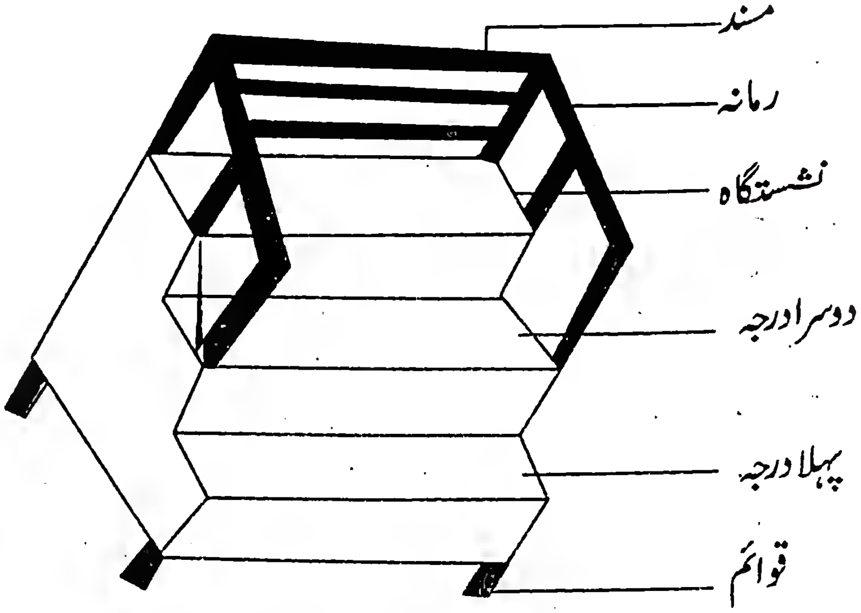

مسند نبوی ﷺ

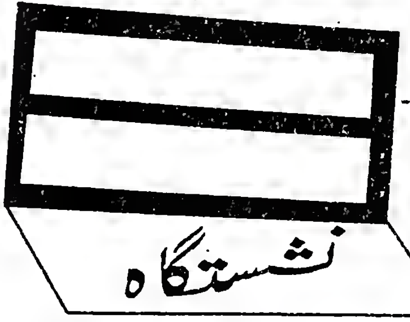

رولیس یعنی تیسرے درجہ پر تین لکڑی کی دیواریں تھیں جن پر آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔

رمانہ یعنی آپ ﷺ جب مجلس پر بیٹھتے تھے تو دونوں ہاتھ مبارک رمانہ پر رکھتے تھے۔

منبر مسجد نبوی ﷺ کی کس جگہ پر نصب تھا

منبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصلّٰی شریف کے دائیں جانب قبلہ جنوبی دیوار کے ساتھ تھا، کیونکہ مدینہ والوں کا قبلہ جانب جنوب میں ہے، مدینہ شریف مکہ مکرمہ اور بیت اللہ سے شمال کی جانب ہے اور منبر اور قبلہ کی جانب دیوار کے درمیان ایک بکری گزرنے کی جگہ کے برابر فاصلہ

ہوتا تھا، چنانچہ ابوداود میں ہے:

باب موضع المنبر عن سلمة قال : كان بين منبر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وبين الحائط كقدر ممر الشاة.

(أبوداؤد : ج ۱ ص   وكذا في البخاري : ج ۱ ص ۷۱)

واضح رہے کہ عہد رسالت ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں مسجد کے مروَّجہ محراب کا رواج نہیں تھا، بلکہ اسکا رواج حضرت عمر بن عبد العزیز کے دور میں ہوا ہے یعنی انہوں نے بنایا ہے، تو دورِ نبوی ﷺ میں منبر آپ ﷺ کے مصلّٰی شریف کے دائیں جانبِ قبلہ جنوبی دیوار کے ساتھ تھا، البتہ دیوار اور منبر کے درمیان تھوڑا فاصلہ تھا اسی بنیاد پر محدثین کرام فرماتے ہیں:

ومن السنة أن لا يلزق المنبر بالحائط. (عمدة القاري للعيني : ج ۴ ص ۴۲۰)

یعنی دیوار اور منبر کے درمیان تھوڑا فاصلہ ہونا مسنون و مستحب ہے۔

آپ ﷺ اور خلفاء راشدین کس درجہ پر بیٹھتے تھے

✷ علامہ سمھودی رحمۃ علیہ فرماتے ہیں:

وروى يحى عن ابن أبي الزناد أن النبي صلى اللّٰه عليه وسلم كان يجلس على المجلس ويضع رجليه إلى الدرجة الثانية فلما ولي أبوبكر قام على الدرجة الثانية ووضع رجليه على الدرجة السفلى فلما ولي عمر قام على الدرجة السفلىٰ ووضع رجليه على الأرض إذا قعد فلما ولي عثمان فعل ذالك ست سنين من خلافته ثم علا الى موضع النبي صلى اللّٰه عليه وسلم

(الوفاء للسمهودي: ج ۱ ص ۳۹۸ . وكذا في شرح ابن بطال: ج ۲ ص ۵۸۶)

یعنی منبر نبوی ﷺ کے تین درجے تھے نیچے کے دو درجے پائیدان کے طور پر استعمال ہوتے تھے اور سب سے اوپر تیسرے درجے پر آپ ﷺ اسطرح بیٹھتے تھے کہ آپ ﷺ کے دونوں پاؤں مبارک دوسرے درجہ پر ہوتے تھے آپ ﷺ کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ادباً دوسرے درجہ پر بیٹھتے تھے اور پہلے درجہ (نیچے والے درجہ) پر ان کے پیر ہوتے تھے، پھر ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سب سے نیچے کے پہلے درجہ پر بیٹھتے تھے اور اپنے پیروں کو زمین پر رکھتے تھے، پھر مسند خلافت کو جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنبھالا تو شروع کے چھ سالوں میں تو

انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے طریقہ پر عمل کیا پھر بعد میں وہ سب سے اوپر کے درجہ پر بیٹھنے لگے جہاں آنحضرت ﷺ بیٹھا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو مسئلہ معلوم ہو کہ خطیب پہلے درجہ یا دوسرے درجہ یا تیسرے درجہ پر ضرورت کے مطابق بیٹھ سکتا ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

خلاصۂ بحث اور جواب استفتاء

ہر مسلمان پر لازم اور ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء واتباع خصوصاً شعائر دین مساجد اور امور مسجد میں سنت نبوی ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے خیر القرون کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑے رہے کیونکہ ان کے طرز وطریقہ میں ہدایت ہے اور ان کی راہ سے ہٹنے میں بے راہ روی اور گمراہی ہے، اس لئے ہر مؤمن ومسلمان پر ضروری ہے کہ اپنے سب افعال واعمال میں رسول اللہ ﷺ اور خیر القرون کی اتباع کرے اور ان کی مخالفت سے اجتناب کرے۔

نیز منبر نبوی ﷺ کی تین سیڑھیاں تھیں، منبر آپ ﷺ کا مدینہ میں جانبِ قبلہ جنوب میں وسط مسجد سے دائیں جانب دیوار سے کچھ فاصلہ پر تھا، نہ محراب کے اندر تھا نہ کسی اور جانب میں تھا، اس پر امت کا اجماع واتفاق ہے کما ذکر صاحب ''الهداية'' وبذالک جری التوارث.
(ج ا ص ۱۷۱)

غرض یہ کہ منبر میں مندرجۂ ذیل امور کا ہونا مسنون ومستحب ہے کیونکہ اس طرح منبر کے نصب کرنے پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا توارث جاری رہا۔

(۱) منبر کی تین سیڑھیاں ہونا سنت ہے البتہ بوجہ ضرورت یعنی بلندی کی غرض سے نیچے کی طرف سے دو ایک سیڑھیاں بنائی جاسکتی ہیں یہ خیر القرون کے ادوار کا عمل ہے جیسا کہ مسجد نبوی ﷺ میں پانچ سیڑھیوں کا منبر بنا ہوا ہے لہذا عام حالات میں تین درجے والا منبر ہونا سنت ہے اور ضرورت کے موقع پر پانچ یا سات طاق والا منبر بھی بنایا جاسکتا ہے یعنی مسجد جتنی بڑی ہوگی اور اونچائی کی حاجت ہوگی اس اعتبار سے سیڑھیاں بڑھائی جاسکتیں ہیں البتہ عام حالات میں افضل یہ ہے کہ صرف تین درجہ والا منبر بنایا جاوے اور منبر کا نصب کرنا اور منبر کی شکل وصورت منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل وصورت پر ہونا۔

(۲) منبر قبلہ کی جانب ہونا سنت ہے اور دیوار سے کچھ فاصلہ پر ہونا بھی سنت ہے۔

(۳) منبر دیوار کے ساتھ متصل ہونا خلاف سنت ہے۔

(۴) نشستگاہ کے پیچھے لکڑی کی یا منبر پختہ ہو تو پیچھے کی طرف ہلکی دیوار ہونا سنت ہے تا کہ خطیب بوقت ضرورت اس پر ٹیک لگا سکے۔

(۵) منبر کی دونوں جانب پر رمانہ ہونا بھی سنت ہے تا کہ خطیب ضرورت کے وقت ان پر ہاتھ رکھ سکے جیسا کہ کرسیوں میں ہاتھ والی کرسیاں ہوتی ہیں۔

(۶) درجہ سفلی یعنی نچلی سیڑھی کے دائیں بائیں اور سامنے کی طرف دیوار وغیرہ نہ ہونا سنت ہے تا کہ خطیب براہ راست منبر پر چڑھ سکے اور اُتر بھی سکے۔

(۷) منبر لکڑی کا ہونا افضل اور مستحب ہے مگر مضبوطی اور خوبصورتی کیلئے پکا بھی ہو سکتا ہے جبکہ اصلی ہیئت میں فرق نہ پڑے۔

(۸) منبر درمیانی قسم کا ہونا سنت ہے یعنی مسجد کے اعتبار سے زیادہ بڑا نہ ہونا اور زیادہ چھوٹا نہ ہونا جبکہ مسجد کی بڑی و چھوٹی ہونے کے لحاظ سے منبر ہونا سنت ہے۔

(۹) منبر بدون نقش و نگار کے ہونا یہ بھی سنت ہے۔

(۱۰) منبر پر کوئی کپڑا یا چادر بچھانا بھی مستحب ہے:

كما في ”الوفاء“ كان عثمان أول من كسا المنبر قبطةً أي الثوب الرقيق الأبيض من ثياب مصري.

یہ امور نصوص اور روایات صحیحہ سے ثابت اور سنت سے منقول ہیں لہٰذا یہ سب چیزیں سنت ہیں ان امور کی رعایت کے بغیر منبر بنانا خلاف سنت ہے اور خلاف سنت امر کو کار ثواب سمجھنا بدعت اور مکروہ تحریمی ہے۔

پس صورت مسئولہ میں جس منبر کے بارے میں استفتاء کیا گیا ہے وہ خلاف سنت ہے اور اگر بنایا گیا ہے تو لائق انہدام ہے اسکی جگہ موافق شریعت منبر بنانا چاہئے تا کہ بعد میں آنے والے لوگ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ شاید یہ بھی سنت سے ثابت ہے۔

فلہٰذا اہل سنت والجماعت کی جن مساجد میں اسطرح کے خلاف شرع و خلاف سنت منبر بنے ہوئے ہیں ان کو منہدم کر کے دوسرے منبر سنت کے موافق بنانا کمیٹی اور دیگر مسلمانوں پر ضروری ہے اس میں مداہنت کرنا بدعت و مکروہ ہے ورنہ بروز قیامت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے اس کی بھی مسئولیت اور ملامت ہو سکتی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اسطرح کی مسئولیت سے محفوظ رکھے اور صحیح راستہ کی ہدایت فرماوے اور حق سمجھنے اور حق پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

بعض شبہات اور ان کے جوابات

(۱) عالم صاحب کا ایک شبہ:- یہ کہ منبر عبادات کے قبیل سے نہیں ہے اس لئے اس کی صورت وشکل میں اضافہ وترمیم بدعت نہیں، لہٰذا بالفرض اضافہ ترمیم اگر بدعت ہو، تو پکا منبر بنانا بھی بدعت ہوگا، چونکہ منبر نبوی ﷺ لکڑی کا تھا نہ پکا۔

جواب:- منبر یہ شعائرِ دین کے قبیل سے ہے اسی بنا پر منبر کی شکل وصورت میں نبی اکرم ﷺ کی اقتداء واتباع ضروری ہے محدثین اور فقہاء کرام نے اس کو سنن میں سے شمار کیا کہ مسجد کے واسطے منبر بنانا اور اس پر خطبہ دینا سنت ہے اور اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ خطیب کی آواز دور تک پہنچتی ہے اور بعید والے ان کو دیکھ بھی سکتے ہیں، محدثین کرام اور فقہائے عظام کے اقوال سے جب منبر کا مسنون ہونا ثابت ہوگیا ہے تو وہ عبادات کے قبیل سے ہونا معلوم ہوگیا ہے اور عبادات میں شریعت کا اصول یہ ہے کہ جو عبادت جسطرح رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اس کو اسی طرح ادا کرنا چاہئے، اس میں تبدیلی وترمیم اضافہ فی الدین ہے جو کہ نادرست ہے، اس لئے تمام مساجد کے منبروں کا منبر نبوی ﷺ کی قدیم صورت وشکل پر ہونا سنت ہے اور اسکے خلاف نئی صورت پر بنانا خلاف سنت اور بدعت ہے۔

پکا منبر بدعت نہیں

اس بارے میں ایک اصول یاد رکھئے کہ ایک ہے منبر نبوی ﷺ کی صورت وشکل کو تبدیل کرنا اور ایک ہے اس کو مضبوط اور خوبصورت بنانا، ان دونوں میں بڑا فرق ہے کہ عناصر کی تبدیلی میں شکل کی تبدیلی نہیں ہوتی ہے بخلاف تبدیل صورت کے اس لئے پکا منبر اگر منبر نبوی کی صورت پر ہو، تو درست ہے بدعت نہیں ہوگا البتہ شکل وصورت بدل کر بنایا جاوے تو یہ کام بدعت اور مکروہ ہوگا۔

تبدیلِ صورت کی خرابیاں

شریعت میں بہت سے ایسے افعال ہیں جو فی نفسہ مباح اور جائز ہوتے ہیں مگر عوارض کے سبب وہ حرام ہوتے ہیں مثلاً عورت کو باحجاب شرعی جماعت کے لئے مسجد میں جانا فی نفسہ مباح اور جائز ہے اگرچہ خلاف اولیٰ ہے مگر عوارض اور فتنے کے سبب سے ناجائز ہے، فقہائے کرام کی اصطلاحات میں اس

کو "سدًا للذرائع" کہا جاتا ہے، اب اگر منبر میں تبدیلی صورت کی اجازت دی جائے تو لوگ اپنے جی چاہے طریقہ پر منبر بنانا شروع کردیں گے، کوئی ایک صورت پر بنائیگا اور دوسرا دوسری صورت پر تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ منبر اپنی اصلی صورت پر باقی نہیں رہے گا، حالانکہ منبر ایک سنت رسول ہے، سرکاری کرسی نہیں ہے کہ کرسی جیسی بھی بنادے جائز ہے۔

(۲) عالم صاحب کا دوسرا شبہ: کہ مروان نے تو منبر میں اضافہ کیا تھا پھر یہ بھی بدعت ہونا چاہئے، چنانچہ عمدۃ القاری میں ہے:

کمافی الإكليل للحاكم عن يزيد عن رومان : كان المنبر ثلاث درجات فزاد فيه معاوية لعله قال جعل ست درجات وحوّله عن مكانه فكسفت الشمس يومئذ. (عمدة القارى شرح البخارى: ج۴ص ۱۰۴)

یعنی منبر نبوی ﷺ کی تین سیڑھیاں تھیں، پھر مروان نے اور تین سیڑھیاں اضافہ کیں، پس تبدیل وترمیم اگر ممنوع وبدعت ہوتی تو مروان نے کسطرح اضافہ کیا، جبکہ اُس زمانہ میں مفتیان کرام موجود تھے۔

جواب (۱): -شارحین حدیث اور مؤرخین حضرات صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ مروان کی اضافہ شدہ سیڑھیاں منبر نبوی ﷺ کی اصل تین سیڑھیوں کے ماتحت داخل نہیں ہے کیونکہ اس نے منبر نبوی ﷺ کی مضبوطی اور بلندی کی غرض سے نیچے کی طرف سے مزید تین سیڑھیوں کا اضافہ کیا ہے۔

چنانچہ سمھودیؒ فرماتے ہیں:

قال فكسفت الشمس حتى رأينا النجوم قال فزادفيه ست درجات وخطب الناس فقال: إنى إنما رفعته حين كثر الناس.

ترجمہ: یعنی منبر کے تین درجے کی جگہ چھ درجے بنائے گئے تاکہ منبر اونچا اور خطیب کا حال عام نمازیوں کو معلوم ہو۔

جواب (۲): -درحقیقت مروان نے منبر نبوی ﷺ کی شکل وصورت کو تبدیل نہیں کیا، بلکہ صرف بلندی کی غرض سے منبر میں منبر نبوی ﷺ کی اصلی ہیئت کو باقی رکھتے ہوئے نیچے سے صرف تین سیڑھیاں اضافہ کیں بخلاف سوال متذکرہ کے منبر کا کیونکہ اس منبر میں منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی ہیئت کو تبدیل کیا گیا ہے، مثلاً (۱) اس کی سیڑھیاں محراب کے اندر ہیں۔ (۲) خطیب کی دائیں جانب ہیں جبکہ منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں سامنے کی طرف تھیں۔ (۳) اس میں موضع مرتفع پر ایک کرسی ہوتی

ہے جبکہ منبر نبوی ﷺ میں کرسی کا انتظام نہیں تھا بلکہ منبر اسطرح بنایا گیا کہ کرسی کی ضرورت نہ پڑے

(۴) صورت مسئولہ میں موضع مرتفع پر چار دیواریں ہیں، حالانکہ مراون نے صرف سیڑھیوں کا اضافہ کیا ہے نہ ان چیزوں کا۔

فلہٰذا کسی عقلمند کے لئے روا و مناسب نہیں کہ سوال میں ذکر کردہ منبر کے جواز پر مروان کے واقعہ کو بطور دلیل پیش کرے۔

(۳) عالم صاحب کا تیسرا شبہ: کہ حقیقت میں منبر بنانے کا مقصد و مراد موضع مرتفع ہے اور سوال میں ذکر کردہ منبر سے جب یہ مقصد و معنی حاصل ہو رہا ہے تو منبر کی یہ جدید صورت کیوں خلاف سنت ہوگی؟

جواب:- ماقبل کی تفصیلی بحث کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ منبر کا مقصد صرف مکان مرتفع نہیں، اگر ایسا ہوتا تو منبر کے تین درجات بنانے کی کیا خصوصیت تھی امید ہے کہ اس کی مزید توضیح کی ضرورت نہیں ہے، واضح رہے کہ ۲؁ یا ۷؁ ہجری میں سے منبر نبوی ﷺ کا رواج وتعامل شروع ہوا، جو کہ عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لیکر تابعین وتبع تابعین الی یومنا ھذا جاری وساری ہے، یہی منبر سنت ہے آج تک کسی نے اسکا انکار نہیں کیا اور کسی نے یہ نہیں کہا کہ منبر سے صرف موضع مرتفع مراد ہے۔

(۴) عالم صاحب کا چوتھا شبہ:- کہ جب منبر سے موضع مرتفع مراد ہے تو اس پر چڑھنے کے واسطے جس جانب چاہے دو چار سیڑھیاں لگائی جاسکتی ہیں جیسا کہ سوال میں محراب کے اندر موضع مرتفع کی جنوبی جانب سیڑھیاں لگائی گئی ہیں۔

جواب:- اس شکل کے منبر عہد رسالت اور خیر القرون کے دور میں نہیں تھے بلکہ یہ ایک امر محدث اور خلاف سنت طریقہ ہے جس کا ثبوت ووجود نہ کتب احادیث میں ملتا ہے، نہ تاریخ اور فقہ وفتاویٰ کی کتب میں، منبر نبوی ﷺ کی سیڑھیاں کس جانب اور کسطرح تھیں، اس کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے، پھر ایک مزید روایت ملاحظہ فرمائیے کہ منبر مسجد نبوی ﷺ کی کس جگہ پر نصب تھا اور منبر کی رو کس طرف پھیری ہوئی تھی، چنانچہ بخاری شریف میں ہے:

> قام عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم حين عمل ووضع فاستقبل القبلة وكبر وقام الناس خلفه فقرأ وركع وركع الناس خلفه ثم رجع القهقرى حتى سجد الأرض ثم عاد إلى المنبر ثم قرأ ثم ركع ثم رفع ثم رجع القهقرى حتى سجد بالأرض الخ . (بخاری: ۱/۵۵. مسلم: ج ۱ ص ۲۰۶)

یعنی آپ ﷺ منبر کی دوسری سیڑھی پر کھڑے ہوئے پھر اپنا منہ قبلہ رو کیا اور تکبیر تحریمہ کہکر نماز شروع کی اور قرأت کی اور رکوع کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لوگوں نے بھی رکوع کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم الٹے پاؤں پیچھے کی طرف منبر سے اُترے اور زمین پر سجدہ کیا پھر منبر پر گئے تو اس روایت سے معلوم ہوا کہ منبر کی سیڑھیاں قبلہ کے بالمقابل جانب ہوں گی تا کہ امام چڑھتے وقت پشت نمازیوں کیطرف اور خطبہ دیتے وقت اسکا چہرہ لوگوں کی طرف اور پشت قبلہ کی طرف ہو، نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جانب قبلہ جنوبی دیوار کے ساتھ اور سیڑھیوں کا رخ شمال کی طرف تھا، ورنہ آپ ﷺ منبر پر قبلہ رخ ہو کر کھڑے نہیں ہو سکتے اور یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ درجہ سفلی پر لکڑی وغیرہ کی کوئی دیوار نہ تھی کیونکہ آپ ﷺ منبر پر براہ راست چڑھتے اور اُترتے تھے اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ منبر سے الٹے پاؤں اُترے تھے۔

اس بارے میں کتب فقہ اور شروح کی عبارات ملاحظہ فرمائے۔

(۱) صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

وإذا صعد المنبر جلس وأذن المؤذن بين المنبر بذلک جری التوارث:

(ج ۱ ص ۱۸۱)

(۲) اس کی شرح میں علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

أذن ثانيا بذلک جری التوارث من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم هذا الزمان أمام المنبر حين صعد المنبر .

(۳) ابن نجیمؒ صاحب بحر فرماتے ہیں:

فإذا جلس على المنبر أذن بين يديه بذالک جری التوارث والضمير فی قوله يديه عائد إلى الخطيب الجالس: (ج ۲ ص ۱۵۷)

مذکورہ بالا حوالاجات میں چار قسم کے الفاظ ہیں: ”عند المنبر، أمام المنبر، بين يديه الخطيب، بين يديه المنبر “ ان سب الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ خطیب جب منبر پر نمازیوں کو سامنے لیکر بیٹھتے تھے (یعنی سیڑھیاں نمازیوں کی طرف تھیں خطیب ان کے سامنے سے منبر پر چڑھتے اور اترتے تھے) تو مؤذن خطیب کے سامنے قبلہ رخ ہو کر مسجد کے اندر اذان ثانی دیا کرتے تھے، صاحب ہدایہ اور دیگر شارحین فقہ نے اس کا اجماع نقل کیا ہے وقال فی الهدايه وبذلک جری التوارث (ج ۱ ص ۱۷۱)

مذکورہ فقہی عبارات سے بھی ثابت ہوا کہ سوال میں ذکر کردہ منبر اور اس کی سیڑھیاں اجماع اور

تعامل سلف کے خلاف ہیں کیونکہ اس منبر کی سیڑھیاں، خطیب جب خطبہ دیوے اس کی دائیں جانب ہیں جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اسلاف کے منبر کی سیڑھیاں سامنے کی جانب اور نمازیوں کی طرف تھیں اور نئے منبر میں خطیب ایسے منبر پر خطبہ دیتا ہے جس میں کرسی رکھی ہوتی ہے، منبر پر بیٹھنے کی جگہ وہ کرسی پر بیٹھتا ہے جبکہ نبی علیہ السلام منبر پر بیٹھتے تھے اور اس پر خطبہ دیتے تھے۔

فلہٰذا یہ جدید منبر کی صورت ایک امر محدث اور امر مبتدع ہے جس سے رجوع کرنا لازم ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب کو حق کی اتباع نصیب فرماوے۔

ونسأله عزوجل أن يعصمنا والمسلمين من طاعة الهوى والشيطان إنه على كل شيئ قدير ولاحول ولاقوة إلابالله العلى العظيم والحمد لله رب العالمين وصلى الله عليه وسلم واله وصحبه أجمعين.

الجواب صحیح
محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۱۰؍رجب المرجب ۱۴۲۶ھ

کتبہ
محمد کمال حسین مونشاہی غفرلہ
۱۰؍رجب المرجب ۱۴۲۶ء

اضافہ:- نیز واضح رہے کہ منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جناب مفتی محمد کمال حسین مونشاہی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے کافی وشافی ہے، اس میں مزید اضافہ کی کچھ حاجت نہیں ہے کہ قدیم طرز منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنت رسول اور اسکی وہی قدیم کیفیت ہی سنت رسول، سنت خلفاء ہے اس کے خلاف نئے منبر کا نقشہ سنت کے موافق نہیں بلکہ سنت کے خلاف ہے، پتہ نہیں یہ طریقہ کس نے ایجاد کیا اور کس فرقہ نے ایجاد کیا ہے، یہ اگر ضروری سمجھا جاتا ہے تو مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے بلکہ بنانے کے بعد لائق انہدام ہے اور سنت کے موافق منبر بنانا لازم ہے۔

فقط والسلام

بند محمد عبدالسلام عفا اللہ عنہ
۹؍رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ

تصدیقات دیگر علماء کرام

(۱) رائے گرامی حضرت مولانا مفتی نور احمد صاحب مدظلہ العالی۔

استاذ الحدیث والفقہ دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، بنگلہ دیش

الجوب صحیح لاریب فیہ

حضرت محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں: عدم نقل از حضرت صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ وتابعین دلالت بر بدعت وکراہت فعل دارد واصرار بر بدعت مکروہ تحریمی گناہ ست۔ یعنی دین کے نام پر کسی امر عدم از خیر القرون، دلیل کراہت تحریمی ہے لہٰذا البطرز قدیم منبر بنانا سنت متوارثہ ہے۔

فقط اللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: بندہ نور احمد عفی عنہ
۱۵؍ شوال المکرم ۱۴۲۶ھ

(۲) رائے گرامی حضرت مولانا مفتی جسیم الدین صاحب مدظلہ العالی۔
استاذ التفسیر والفقہ دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، بنگلہ دیش

منبر کا وجود زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے متوارثاً چلا آرہا ہے لہٰذا اس میں نئے فیشن کے اعتبار سے اپنے من گھڑت طریقے پر بنانا خلاف سنت ہے، اس بارے میں مفتی محمد کمال حسین صاحب مومنشاہی نے جو فتویٰ مقالہ مدلل ومفصل لکھا ہے ماشاء اللہ بالکل محقق ہے اور تحقیق کا حق ادا کیا ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی زندگی گزارنے کی توفیق نصیب فرماوے آمین۔ فقط والسلام۔

کتبہ: جسیم الدین عفا اللہ عنہ
۱۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۶ھ

* * *

جواہر الفتاویٰ

حضرت مولانا مفتی محمد عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم العالیہ

اسلامی کتب خانہ
علامہ بنوری ٹاؤن کراچی